جلد بست وسوم — شمارہ (۱)

جولائی ۱۹۴۹ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

کیا گاندھی جی مسلمان تھے؟ جی نہیں کیا وہ ہندوؤں کے دشمن تھے؟ ہرگز نہیں پھر وہ مسلمانوں کے حق میں ہندوؤں سے جو چند امور کا مطالبہ کرتے اور اُن پر بار بار زور دیتے تھے تو کیا اس کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ وہ مسلمانوں کے لیے ہندوؤں سے خیرات مانگتے تھے۔ یعنی کوئی ایسی چیز مانگتے تھے جو ہندوؤں پر فرض نہ تھی اور اس کا فائدہ صرف مسلمانوں کو پہنچ سکتا تھا؟ گاندھی جی جب یہ کہتے تھے کہ ہند کی قومی زبان ہندوستانی ہے اور اس کو دیوناگری اور فارسی دونوں رسم الخطوں میں لکھنا چاہیے گاؤکشی پر قانونی بندش نہیں ہونی چاہیے۔ ہر فرقہ اور ہر ملت کو تہذیبی آزادی ملنی چاہیے تو کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ ہند کی اکثریت نے اگر اس پر عمل کیا تو اقلیت کے ساتھ یہ اس کا فیاضانہ سلوک ہوگا اور بس ورنہ ایسا نہ کرنے سے نہ ملک کو نقصان پہنچیگا اور نہ اکثریت کو کسی قسم کا کوئی خطرہ اور اندیشہ ہوگا ہر شخص جس کو گاندھی جی کے فکر و خیال سے کچھ بھی واقفیت ہے جانتا ہے کہ ان کے نزدیک ہندوستان کی آزادی کا بقا اور دوام اس کی ترقی اور سلامتی کی شرطِ اول یہ ہی تھی کہ انڈین یونین کو جس طرح دستوری حیثیت سے سیکولر اور جمہوری گورنمنٹ تسلیم کیا گیا ہے اسی طرح اس پر عمل بھی ہو اکثریت اقلیت کے متعلق انصاف اور ہوشمندی سے کام لے اور کسی خارجی یا داخلی محرک سے برانگیختہ ہو کر اقلیت پر اپنی ڈکٹیٹر شپ قایم کرنے کی کوشش نہ کرے ورنہ اس کا انجام خود اکثریت کے حق میں نہایت خطرناک اور تباہ کن ہوگا۔ کوئی ایک فرد یا جماعت ڈکٹیٹر شپ یا تسلطائیت کی راہ اختیار کرکے

وقتی طور پر اپنی حیوانی جذبۂ اقتدار و بالا خوانی کی تسکین کا سامان ضرور کر سکتا ہے لیکن اس اقتدار کی تعمیر میں خرابی کی ایک ایسی صورت مضمر ہوتی ہے کہ کسی وقت بھی وہ اسے پاش پاش کردے سکتی ہے آج مشرق و مغرب کی تاریخ سیاسیات کا ہر ورق اس دعوے کا کھلا ثبوت ہے۔

ہند میں صحیح جمہوریت اور بنیادی اعتبار سے اس کے لئے مشترکہ قومیت کی خوشگوار فضا پیدا کرنے کے لئے یہ نہایت ضروری تھا کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں کے باہمی میل جول اور اختلاط و ارتباط سے جو ایک مشترک زبان، مشترک کلچر، اور مشترک تہذیب پیدا ہوگئی تھی اور جس میں اگر اختلاف تھا تو صوبائی حیثیت سے تھا مذہب اور فرقہ واریت کے اعتبار سے نہ تھا اس کو بھی پروان چڑھانے اور ترقی دینے کی کوشش کی جاتی۔ پھر جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو ہر شخص جانتا ہے کہ آج سے تیس چالیس برس پہلے جبکہ ہندو اور مسلمان بہ نسبت آج کے اپنے اپنے مذہب کے زیادہ پابند ہوتے تھے ان دونوں فرقوں کے باہمی تعلقات نہایت شگفتہ اور استوار تھے اس بنا پر انڈین یونین" کا یہ فرض تھا کہ وہ اس خوشگوار فضا کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ہر فرقہ کی مذہبی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرے۔ کوشش کرتی کہ مسلمان سچے اور اپنے مذہب کے پابند مسلمان ہوں اور اسی طرح ہندو اپنی مذہبی تعلیم کے مطابق پکے اور سچے ہندو ہوں تاکہ جارحانہ قومیت کے زہر سے ان کا قومی وجود محفوظ رہتا اور دونوں فرقے مل کر ایشیا اور یورپ دونوں کو ایک مادی تمدن سے آشنا کر سکتے"

مشترک زبان، مشترک کلچر اور مشترک تہذیب کو ختم کر کے کسی ایک خاص فرقہ کی ہی زبان اور کلچر کو باقی رکھنے اور دوسروں پر اس کو ٹھونسنے کی کوشش کرنا بے شبہ ایک نہایت خطرناک قسم کی فرقہ پرستی ہے اور جب یہ فرقہ سیاسی اقتدار کا بھی مالک ہو تو اس کی اس فرقہ پرستی کا ہی سیاسی نام فسطائیت یا ڈکٹیٹر شپ ہو جاتا ہے۔

فسطائیت اور ڈکٹیٹر شپ کی یہ ایک عجیب خصوصیت ہے کہ چونکہ اس کی بنیاد اپنے

متعلق حد سے زیادہ احساسِ برتری خود پسندی اور خود سری اور دوسروں کے متعلق کمل بے اعتمادی اور بدگمانی پر قایم ہوتی ہے اس بنا پر اس فسطائی جماعت کے ممبر آپس میں ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ موقع پا کر ارکان جماعت کا ایک گروہ خود اس فسطائیت کو ختم کر دیتا ہے یہ ہی وجہ تھی کہ مسولینی خود اپنی فوج کی گولیوں کا نشانہ بنا۔ اور ہٹلر کو خود اس کے دست و بازو دوستوں نے ختم کر کے رکھ دیا۔

زبان، تعلیم اور کلچر سے متعلق صوبۂ یو۔ پی کی گورنمنٹ جس غلط روش پر تیز گامی کے ساتھ چل رہی ہے وہ آخرکار اس کو اسی منزل پر پہنچا کر رہیگی جو فسطائیت کی آخری منزل ہے۔ خود جماعت مقتدرہ کے ہوشمند اور عاقبت اندیش اصحاب اس کی اس پالیسی کے خلاف چیخ اُٹھے ہیں اور برابر احتجاج کر رہے ہیں وزیر اعظم یو۔ پی کے پارلیمنٹری سکریٹری گووند سہائے صاحب زبان کی نسبت اس پالیسی کی بار بار شدید مذمت کر چکے ہیں، حکومت کی تعلیمی اجارہ داری کی نسبت الہ آباد کے اخبار لیڈر میں پچھلے دنوں الہ آباد یونیورسٹی کے مشہور فاضل پروفیسر ڈاکٹر بینی پرشاد سخت احتجاج کر چکے ہیں، حد یہ ہے کہ گذشتہ دنوں وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو اور وزیر تعلیم مولانا آزاد ان دونوں نے بھی دہلی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے یو۔ پی گورنمنٹ کی اس جارحانہ پالیسی کی صاف اور کھلے لفظوں میں شکایت کی اور پنڈت نہرو نے تو یہاں تک کہا کہ "افسوس! جو لوگ تیس برس تک گاندھی جی کے مخلص پیرو کار کی حیثیت سے کام کرتے رہے اب اُن کی وفات کے بعد وہ یک بیک بدل گئے ہیں اور گاندھی جی کی تعلیمات سے جان بوجھکر انحراف کرنے پر تلے ہوئے ہیں

آج ہمارا ملک جن نازک مرحلوں سے گذر رہا ہے وہ ہر ایک کے سامنے ہیں ان حالات میں ضروری تھا کہ ملک میں مکمل امن و امان پیدا کرنے اور عوام کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن اس کے برعکس ہو یہ رہا ہے کہ نہایت اہم مسائل کو نظر انداز کر کے بہت معمولی قسم کی چیزوں پر ساری توجہات مرکوز کر دی گئی ہیں غالباً بدقسمتی سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے صرف وحدتِ زبان و کلچر کے نعرے لگا لینا کافی ہے اور اسی ذریعہ سے یہ لوگ اپنی لیڈرشپ قایم رکھ سکتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اب عوام (ہندو ہوں یا مسلمان) کافی بیدار ہو چکے ہیں اور وہ جان گئے ہیں کہ ان کی معاشی اور اقتصادی ضرورتوں کو پورا کئے بغیر کوئی جماعت ان کی سرداری کا دعویٰ نہیں کر سکتی اب عوام کو مذہب۔ زبان اور کلچر کا نام لیکر اپنے مقاصد کا آلہ کار بنانا نہایت مشکل ہے۔ ہمارے ملک کے

قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر

{ از جناب مولوی غلام ربانی صاحب ایم - اے (عثمانیہ) }

(۲)

اس سوالیہ فقرے کے بعد قرآن ہی میں اس دعوے کا اعلان کیا گیا یعنی

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ — بلکہ وہ تو بلند و بالا بہتر قرآن ہے لوح محفوظ میں

اس کا یہ ظاہری مطلب معلوم ہوتا ہے کہ فرعون و ثمود جیسی قوموں کی سی جبار حکومتوں کی طاقت بھی قرآن کو غیر محفوظ کرنے کی کوشش کسی زمانہ میں بھی خدانخواستہ اگر کرے گی تو ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ تیرہ سو سال سے قرآن کے اس دعوے کی دوست ہی نہیں بلکہ دشمن بھی تصدیق کر رہے ہیں "ہم قرآن کو محمد کا کلام اسی طرح یقین کرتے ہیں جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام یقین کرتے ہیں"۔ (اعجاز التنزیل صنہ)

یہ ایک غیر مذہب کے آدمی کا ایسا منصفانہ اعتراف ہے کہ قرآن کی تاریخ سے تھوڑی بہت بھی جو واقفیت رکھتا ہے خدا کا کلام اس کو نہ بھی مانے لیکن اس اعتراف و اقرار پر تو اپنے آپ کو وہ یقیناً مجبور پائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کو جن خصوصیتوں کے ساتھ دنیا کے حوالہ کیا تھا ابتداء سے اس وقت تک بغیر ادنیٰ تغیر و تبدل اور سرِ مو تفاوت کے وہ اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ کروڑہا کروڑ مسلمانوں میں اس طریقہ سے منتقل ہوتی ہوئی چلی آرہی ہے کہ سال دو سال تو خیر بڑی بات ہے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ قرآن ہی مسلمانوں سے کبھی جدا ہوا اور نہ مسلمان قرآن

سے جدا ہوئے اور اب تو طباعت و اشاعت وغیرہ کے لامحدود ذرائع کی پیدائش کا نتیجہ یہ ہو چکا ہے کہ میر و سودا کی غزلوں یا اسی قسم کی دوسری معمولی چیزوں کو بھی کوئی اب دنیا سے مٹا نہیں سکتا تو قرآن کے سننے مٹانے کا بھلا اب امکان ہی کیا باقی رہا!

اس وقت تک میں نے قرآن کی انفیں اندرونی شہادتوں کا ذکر کیا ہے جن کے نتائج اور مفاد کو وہ بھی مانتے ہیں اور ان کو ماننا بھی چاہئے جنھوں نے اب تک اس کتاب کو خدا کی کتاب تسلیم نہیں کیا ہے قرآن جن کے نزدیک خدا کی کتاب ہے ان کے لئے تو اس سلسلہ میں خود قرآن ہی نے کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ (حم سجدہ) — قرآن میں نہ سامنے سے الباطل کے گھسنے کی گنجائش ہے اور نہ پیچھے سے

اس کا حاصل یہی ہے کہ الباطل (یعنی قرآن کا جو جزء نہیں ہے) اس کے لئے خدا نے ذمہ داری لی ہے کہ چاہنے والے کسی راستہ سے بھی چاہیں کہ قرآن میں اس کو داخل کر دیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے ظاہر ہے کہ ان الفاظ کو خدا کے الفاظ جو تسلیم کر چکا ہو کیا وہ اپنے آپ کو مسلمان باقی رکھ سکتا ہے اگر کسی لفظ یا شوشہ تک کے اضافہ کا قرآن میں وہ تصور کرے؟

اور جو حال اضافہ کا ہے بجنسہ وہی کیفیت کمی کی بھی ہے خود قرآن کا اتارنے والا خدائے ذوالجلال فرماتا ہے

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ (القیامۃ) — قطعاً ہم پر قرآن کے جمع رکھنے کی ذمہ داری ہے

جب خدا اس کے جمع کرنیکی ذمہ داری لے چکا تو اس کی صورت ہی کیا باقی رہتی ہے کہ قرآن میں جن چیزوں کو خدا جمع کر چکا ہے اس کو قرآن سے کوئی نکال دے، یا اپنی جگہ سے کوئی ہٹا دے بلکہ

اسی کے بعد اگر غور کیا جائے تو قرآنہٗ کے لفظ کا اضافہ بلا وجہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ بعض پوشیدہ شکوک وشبہات کے ازالہ کا اس میں سامان مل سکتا ہے سوال ہو سکتا تھا کہ صرف جمع کرنے اور باقی رکھنے کی ذمہ داری اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ کے الفاظ سے لی گئی ہے جس کا مفاد یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن کے کسی جزو کو خدا غائب نہ ہونے دیگا اور قرآن دنیا میں اپنے تمام اجزاء کے ساتھ رہتی دنیا تک موجود رہے گا لیکن اسی دنیا میں بیسیوں کتابیں ایسی ہیں جن کا پڑھنے والا اب کوئی باقی نہیں رہا ایسی صورت میں کتاب کا دنیا میں رہنا نہ رہنا دونوں باتیں برابر ہیں اب اگر سوچئے تو اس خطرے کا جواب "قرآنہٗ" کے لفظ میں پا سکتے ہیں یعنی اس کی بھی ذمہ داری "قرآنہٗ" کے لفظ سے لی گئی کہ قیامت تک اس کتاب کے پڑھنے والوں کو خدا پیدا کرتا رہے گا اور اس وقت تک یہ ذمہ داری جیسا کہ دنیا دیکھ رہی ہے خدا پوری کر رہا ہے آگے سوال ہو سکتا تھا کہ پڑھنے والے بھی باقی رہیں لیکن سمجھنے اور سمجھانے والے اگر غائب ہو جائیں تو اس وقت بھی کتاب کا افادہ ختم ہو جائے گا جیسے آج وید کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس کی زبان اتنی پرانی ہو چکی کہ لغت کی مدد سے بھی اس کا سمجھنا مشکل ہے[1] اسی وسوسے کا ازالہ

ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ — پھر ہم ہی پر ہے اس کا بیان بھی۔

سے کیا گیا ہے یعنی قرآنی آیات کے صحیح مطالب بیان کرنے والوں کو بھی ہر زمانہ کے اقتضاء

---

[1] سندر لال جی اپنی مشہور کتاب گیتا اور قرآن میں وید کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی (یعنی ویدوں کی) زبان اتنی پرانی اور عجیب ہے اور ایک ایک منتر کے اتنے اتنے طرح سے ارتھ لگاتے جا سکتے ہیں کہ بے پڑھے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ودوانوں (علماء) کے لئے بھی ہزاروں برس سے وید ایک پہیلی رہا ہے اور ہمیشہ پہیلی ہی رہے گا۔ صفحہ ۹۹ کتاب مذکور اردو ایڈیشن

کے مطابق قدرت پیدا کرتی رہیگی اور تیرہ صدیوں سے اس کا تجربہ بھی مسلسل ہو رہا ہے
دراصل انھیں تفصیلات کا اجمالاً ذکر قرآن کی مشہور آیت میں فرمایا گیا ہے جسے عموماً مولوی
اپنے وعظوں میں لوگوں کو سناتے ہی رہتے ہیں یعنی

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر) ہم ہی نے اس ذکر (جو نمک پیدا کرنے والی کتاب) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی قطعاً حفاظت کرنیوالے ہیں

بہرحال بیرونی شہادتوں سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے تو قرآن کی اندرونی شہادتوں
سے ان سارے سوالوں کے جوابوں کو ہم حاصل کر سکتے ہیں جو قرآن جیسی کسی کتاب کے
متعلق دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

قرآن میں نوشت و خواند سے متعلق الفاظ انتہا یہ ہے کہ قرآن کے عہد نزول میں عرب کے ماحول کی
جو نوعیت نوشت و خواند کے لحاظ سے تھی عرب کی صحیح تاریخ کا جنہوں نے مطالعہ نہیں
کیا ہے نیز قرآن ہی کی ایک اصطلاح یعنی لفظ "جاہلیت" کے اصطلاحی معنی سے ناواقف
ہونے کی وجہ سے بعض لوگ اس مغالطہ میں جو مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جاہلیت کے اس دور
میں قرآن کی کتابت کے امکان کی صورت ہی کیا تھی؟ انھوں نے باور کر لیا ہے کہ عرب میں
نہ لکھنے والے پائے جاتے تھے اور نہ لکھنے پڑھنے کا سامان اس وقت اس ملک میں
موجود تھا مگر کاش معترضین کا یہ گروہ صرف قرآن ہی کا مطالعہ کر لیتا تو اس کتاب میں باربار
رق، قرطاس، صحیفہ، صحف، قلم، زبر، الواح، مداد، (روشنائی)، اسفار، کتب
وغیرہ الغرض ایسی ساری چیزیں جن کا عموماً نوشت و خواند سے تعلق ہے اس کے ذکر
سے خود قرآن کو بھرا پائیں گے اور یہ تو لکھنے پڑھنے کے سامان کا حال ہے باقی رہا لکھنے
والے سو حیرت ہوتی ہے کہ عرب کے اس زمانہ کے باشندوں کی طرف قرآن ہی میں

يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللهِ (البقرہ)

لکھتے ہیں وہ ، لوگ کتاب اپنے ہاتھوں سے اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی کتاب ہے۔

اور ایسی آیتیں مثلاً

يَلْوُوْنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ (آل عمران)

اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں کتاب کے ساتھ تاکہ تم سمجھو وہ کتاب میں ہے حالانکہ نہیں ہے وہ کتاب

پڑھتے ہیں پھر لین دین کے جس قانون کا طویل بیان (سورۂ بقرہ کے آخر) میں پایا جاتا ہے اور تاکید کے ساتھ قرضی معاملات کے لکھنے کا اصرار قرآن نے جو کیا ہے سوچنا چاہئے کہ ان امور کا انتساب ان لوگوں کی طرف کسی حیثیت سے کیا صحیح ہو سکتا ہے جو نوشت و خواند سے قطعاً بیگانہ اور ناآشنا ہوں۔

قرآن میں جاہلیت کے معنی | رہا جاہلیت کا لفظ سو میں بیان کر چکا ہوں کہ یہ قرآن کی بنائی ہوئی اصطلاح ہے متعدد مقامات پر اس نے اپنی اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے مثلاً مردوں اور عورتوں کی مخلوط سوسائٹی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (الاحزاب)

اور نہ بناؤ سنگار کرو جاہلیت اولیٰ والوں کے بناؤ سنگار کی طرح

یا عرب پر "نسلی و لسانی" اور وطنی عصبیتوں کا جو بھوت سوار تھا[1]۔

---

[1] اسی سلسلہ کا مشہور لطیفہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو عرب کے مضری قبیلہ سے نسلی تعلق رکھتے تھے جب آپ کے مقابلہ میں مضری قبیلہ کے دوسرے حریف عربی قبیلہ ربیعہ کے ایک آدمی مسیلمہ نے بھی نبوت کے دعوے کا اعلان کر دیا تو لکھا ہے کہ طلحۃ النمری قبیلہ ربیعہ کا ایک سردار مسیلمہ کے پاس گیا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اس کی تعبیر حمیّۃ الجاہلیۃ سے کی گئی ہے یا خدا کے متعلق ارتیابی (اگیناسٹک) ذہنیت عام عربوں پر جو مسلط تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ (آل عمران) اور خیال رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ جاہلیت کے خیالات۔

فرمایا گیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کسی جگہ پر بھی "جاہلیت" کے اس لفظ کا وہ مطلب سمجھا جاتا ہے جو اس زمانہ کے جاہلوں اور ناواقفوں نے سمجھ رکھا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے مقابلہ میں عربوں کی غیر اسلامی زندگی اخلاقاً و اعتقاداً جو کچھ بھی تھی اور جن خصوصیتوں کی حامل تھی دراصل اسی کی تعبیر قرآن جاہلیت سے کرتا ہے بہرحال یہ بات کہ اسلام سے پہلے نوشت و خواند سے عرب کے لوگ چونکہ ناواقف تھے اس لئے ان کے زمانہ کو قرآن جاہلیت کا زمانہ قرار دیتا ہے یہ وہی کہہ سکتا ہے جو قرآن سے بھی جاہل ہے اور ایام جاہلیت کی تاریخ سے بھی

بیرونی شہادتیں | قرآن کی ان اندرونی شہادتوں کے اجمالی بقدر ضرورت تذکرہ کے بعد اب

(بقیہ حاشیہ سلسلہ صفحہ گذشتہ) آیا گفتگو کے بعد طلحہ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو (مسیلمہ) جھوٹا ہے اور محمد سچے ہیں مگر اسی کے ساتھ طلحہ نے کہا کہ ربیعہ کا کذاب (جھوٹا) مضر کے صادق (راستباز) سے مجھے زیادہ محبوب ہے اس کے بعد سلیمہ کے رفقاء میں شریک ہوگیا ص۲۴۶ طبری ج ۴ مسیلمہ کے دعویٰ کی بنیاد قومی حمیت وعصبیت پر مبنی تھی اس کا پتہ ان فقروں سے بھی ملتا ہے جو قرآن کے مقابلے میں شریر بنایا کرتا تھا حضرت ابوبکر کے سامنے سنانے والے نے سنایا تھا کہ مسیلمہ یہ بھی کہتا تھا یا صفدع نقی نقی لا الشارب تمنعین ولا الماء تکدرین لنا نصف الارض ولقریش نصف الارض ولکن قریشا قوم یعتدون (اے مینڈکی ٹراٹرا تو نہ پانی پینے والوں کو روکتی ہے اور نہ پانی کو گدلا کرتی ہے زمین عرب کی آدھی ہماری یعنی ربیعہ والوں کی اور آدھی قریش کی مگر قریش تو زیادتی سے کام لے رہے ہیں) ص۲۵۳ ج ۳ طبری

میں بیرونی شہادتوں کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ اس موقع پر سب سے پہلے شیعی فاضل علامہ طبرسی کے خیالات کا پیش کرنا مناسب ہوگا انھوں نے اپنی تفسیر "مجمع البیان" میں لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے

اِنَّ الْعِلْمَ بصحۃ نقل القرآن کالعلم بالبلدان والحوادث الکبار والوقائع العظام والکتب المشھورۃ۔	یعنی قرآن اپنی اصلی حالت کے ساتھ گذشتہ نسلوں سے منتقل ہوتے ہوئے پچھلی نسلوں تک پہنچا ہے اس واقعہ کے علم کی نوعیت وہی ہے جو بڑے بڑے شہروں یا مشہور حوادث اور اہم تاریخی واقعات یا مشہور کتابوں کے علم کی ہے۔
(مقدمہ روح المعانی ص۲۲)	

بلا شبہ واقعہ یہی ہے آج نیویارک اور لندن کے وجود میں شبہ یا شک جیسے جنون ہے یا جنگ عظیم کے حادثہ کا منکر پاگل سمجھا جائے گا یقیناً متواتر اور متوارث ہونے میں بجنسہ یہی حال قرآن مجید کا بھی ہے کیا اس کا انکار کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو جس دن سے قرآن ملا ہے اس دن سے آج تک گذشتہ تیرہ صدیوں میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس کتاب سے وہ جدا ہوئے یا جدا کئے گئے ہیں لاکھوں انسانوں کے حوالے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کو کیا اور ان لوگوں نے اپنی بعد کی نسلوں تک اسے پہنچایا جن کی تعداد بلا مبالغہ کروڑوں سے متجاوز تھی اور یوں ہی طبقۃً بعد طبقۃٍ نسلاً بعد نسلٍ نوشتہ و مکتوبہ شکل میں یہ کتاب مسلمانوں میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے پس سچی بات یہی ہے کہ قرآن تو قرآن ایسی کتابیں جیسے نحو میں سیبویہ کی یا اصول میں المزنی کی کتاب ہے بقول علامہ طبرسی :-

لَوْاَنَّ مدخلا ادخل فی کتاب	اگر سیبویہ اور المزنی کی کتابوں میں کوئی شخص

سیبویه وَالمزنی بابامِنَ النحو — اپنی طرف سے کسی چیز کو داخل کردے تو فوراً

لیس من الکتاب یعرف (ردِ جوابِ) — یہ بات پہچان لی جائے گی۔

تو پھر قرآن میں اضافہ یا کمی کے امکان کی بھلا کیا صورت ہے اسلامی ممالک کے کسی ابتدائی مکتب کا ایک بچہ بھی اس شخص کو ٹوک سکتا ہے جو فتحہ (زبر) کی جگہ کسی حرف کو رفع (پیش) کیسا تھ پڑھے گا جس کا جی چاہے اس کا تجربہ ہر جگہ کر سکتا ہے۔

تواتر اور توارث کے اس عام قصہ کے سوا قرآن کے جمع و ترتیب کے سلسلہ میں بیرونی روایتوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے میرے نزدیک ان کی دو قسمیں ہیں ایک حصہ ان روایتوں یا شہادتوں کا تو وہ ہے جن سے قرآن کے بعض اجمالی بیانات یا شہادتوں کی شرح ہوتی ہے ہم پہلے انھیں کو ذکر کرتے ہیں۔

تشریحی روایات | مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیات کا نزول وقفہ وقفہ سے تدریجاً جو ہوتا رہا آپ سن چکے ہیں کہ یہ خود قرآن کا دعویٰ ہے اور ایک سے زائد مقام پر اس دعوی کا ذکر خود قرآن میں کیا گیا ہے اسی عنوان کی تفصیل روایتوں میں یہ ملتی ہے کہ قرآن کی ایک سو چودہ[۱۱۴] سورتوں کی حیثیت دراصل مستقل کتابوں یا رسالوں کی قرار دی گئی تھی مثلاً اس کو یوں سمجھیے کہ تاریخ، فلسفہ، اقلیدس، طب اور جغرافیہ وغیرہ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کو ایک ہی مصنف اگر تصنیف کرنا شروع کرے اور تصنیف میں یہ طریقہ اختیار کرے کہ جس کتاب کا جو مواد فراہم ہوتا جائے اُس کو متعلقہ کتاب میں درج کرتا چلا جائے اور یوں آہستہ آہستہ دس بیس برس میں آگے پیچھے اس کی یہ ساری تصنیفیں ختم ہوں واقعہ یہ ہے کہ کچھ یہی کیفیت قرآنی سورتوں یا ان مستقل رسالوں یا کتابوں کی تھی۔

لہ قرآن ہی میں ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے رَسُولٌ مِّنَ

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

جن کے مجموعہ کو ہم قرآن کہتے ہیں۔ بتدریج ۲۳ سال میں ان سب کے نزول کا قصہ ختم ہوا ان سورتوں میں کوئی افتتام تک پہلے پہنچی اور کوئی بعد۔ یہی مطلب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ کا ہے جو ابوداؤد، نسائی اور ترمذی وغیرہ میں پائے جاتے ہیں آپ نے فرمایا

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد سورتیں
ینزل علیہ السور ذوات العدد	اترتی رہتی تھیں (یعنی ایک ہی زمانہ میں مختلف
(مختصر کنز العمال برحاشیہ مسند احمد)	سورتوں کے نزول کا سلسلہ جاری رہتا تھا)

اسی روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ ذوات العدد (متعدد)....

سورتیں تدریجی طور پر جب نازل ہو رہی تھیں ان کے لکھوانے اور قلم بند کرانے کا طریقہ یہ تھا:

فکان اذا انزل علیہ الشیٔ دعا	جب رسول اللہ پر کوئی چیز نازل ہوتی تو جو لکھا
بعض من کان یکتب فیقول ضعوا	جانتے تھے ان میں سے کسی کو آپ طلب فرماتے
ھذا فی السورۃ التی یذکر فیھا	اور کہتے کہ اس آیت کو اس سورہ میں لکھو جس
کذا و کذا (منتخب کنز ص)	میں فلاں فلاں باتیں یا آیتیں ہیں[1]

(بقیہ سلسلہ صفحہ گذشتہ) رسول من اللہ یتلوا صحفا مطہرۃ فیہا کتب قیمۃ اللہ کی طرف سے پیام لاتے ہیں پڑھتے ہیں پاک صحیفوں کو جن میں استوار اور مضبوط لازوال (تعلیم والی) کتابیں ہیں۔ اس میں "کتب" کے لفظ کو "کتاب" کی جمع قرار دینا قطعاً لغت کی خلاف ورزی نہیں بلکہ لغوی معنی بھی ہو بھی سکتے ہیں اور ان سے مراد قرآن کی یہی متعدد کتابیں یا رسالے ہوں جنہیں ہم اصطلاحاً قرآن کی سورتیں کہتے ہیں تو انکار کی کیا کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صحف میں کتابوں کے ہونے کی ترکیب میں لوگوں نے جو دشواریاں پیدا کرکے طرح طرح کی دور از کار تاویلیں کی ہیں ان کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی صرف سیدھا ترجمہ یہ ہو جاتا ہے کہ پاک اوراق جن میں استوار اور مستحکم کتابیں یعنی سورتیں لکھی ہوئی ہیں ۱۲ مناظر احسن گیلانی۔

[1] اور مسند احمد میں یہ روایت ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اتانی جبریل فامرنی ان اضع ھذہ الآیۃ بھذا الموضع من ھذہ السورۃ (جبریل آئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اس آیت کو اس سورت کی فلاں جگہ پر رکھوں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں میں نازل ہونے والی آیتوں کو جبریل علیہ السلام کے حکم سے آپ

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

مطلب وہی کہ طب کے متعلقہ مضامین کو طب کی کتاب میں اور تاریخ کے مواد کو تاریخ کی کتاب میں مذکورہ بالا طریقۂ تصنیف اختیار کرنے والا مصنف جیسے داخل کرتا چلا جاتا ہے اسی طرح قرآنی آیات کو ان کی متعلقہ سورتوں میں آنحضرت صلعم شریک کرنے کا حکم دیا کرتے تھے جیسا کہ معلوم ہے خود قرآن ہی نے

وَلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِينِكَ (عنکبوت) اور نہ لکھا ہے اس کو تم نے اپنے داہنے ہاتھ سے

کی خبر دیتے ہوئے اس کا انکشاف کیا ہے کہ صاحب وحی صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن آپ نے ایک نہیں بلکہ اپنے صحابیوں میں سے چالیس سے اوپر حضرات کو اس کام کے لئے مقرر کر رکھا تھا کہ جس وقت قرآن کی جس سورت کی جن آیتوں کی وحی ہو فوراً پہنچ کر ان کو لکھ لیا کریں العراقی کی منظومہ سیرت میں ان کاتبوں کے نام گناتے ہوئے نظم کی ابتداء اس مصرعہ سے کی ہے

وكتابه اثنان واربعون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں کی تعداد (۴۲) تھی۔

کاتبوں کی اتنی بڑی تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وقت پر ایک نہ ملے تو دوسرا اس کو انجام دیدے "عقد الفرید" میں ابن عبد ربہ نے حضرت حنظلہ بن ربیع صحابی کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے

ان حنظلة بن ربيع كان خليفة كل حنظلہ بن ربیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

(بقیہ حاشیہ سلسلہ صفحہ گذشتہ) شریک کرتے تھے (دیکھو مختصر کنز العمال صفحہ ۴۰ ج ۲) جس کا مطلب یہی ہوا کہ خود رسول اللہ نے نہیں بلکہ ہر آیت جس سورہ میں جس مقام پر ہے یہ جبریل کے حکم سے ہوا ہے

[۱] دیکھو الکتانی کی کتاب التراتیب الاداریہ ج ۱ صفحہ ۱۱۶ مطبوعہ مراکش اسی کتاب میں ان (۴۲) کاتبوں کے نام بھی مل جائیں گے۔

کاتب من کتابہ علیہ اذا غاب — تمام کاتبوں کے خلیفہ اور نائب تھے

(عقد الفرید ج ۲ ص ۱۴۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حنظلہ کو یہ حکم تھا کہ خواہ کوئی رہے یا نہ رہے وہ ضرور رہیں تاکہ کاتبوں میں سے اتفاقاً وقت پر اگر کوئی نہ ملے تو کتابت وحی کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اسی انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ نزول کے ساتھ ہی ہر قرآنی آیت قید کتابت میں آکر قلم بند ہو جاتی تھی ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے طبرانی کے حوالہ سے مجمع الزوائد میں یہ روایت ھیثمی نے نقل کی ہے

قالت کان جبریل علیہ السلام یملی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم — ام سلمہ فرماتی ہیں کہ جبریل علیہ السلام قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھواتے تھے

(رواہ الطبرانی فی الاوسط مجمع الزوائد ج ۶ ص ۱۵۷)

بظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ اترنے کے ساتھ جبریل کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نازل شدہ آیتوں کو لکھوا دیا کرتے تھے کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ معلوم ہے نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ قرآنی آیتوں کو خود لکھا کرتے تھے انتہا اس احتیاط کی یہ تھی کہ جب "غیر اولی الضرر" کے الفاظ بطور اضافہ کے لا یستوی القاعدون الایۃ والی مشہور آیت کے متعلق نازل ہوئے مگر یہی اضافہ جو بقول امام مالکؒ حرف واحد کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس یک حرفی اضافہ کو بھی اس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلم بند کرنے کا حکم دیا۔ (دیکھو بخاری وغیرہ) امام مالکؒ نے "حرف واحد" اس کو ہارون سے ملاقات کے وقت کہا تھا دیکھئے درمنثور ج ۲ ص ۲۰۳) احتیاط کا اقتضا یہ بھی تھا کہ لکھوانے پر صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قناعت نہیں فرماتے تھے بلکہ کاتب جب لکھ لیتے تو آپ پڑھوا کر سنتے۔ کاتب

(۲) حضرت زید بن ثابت کا بیان ہے کہ

فان کان فیہ سقط اقامہ — اگر کوئی حرف یا نقطہ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درست کراتے (مجمع الزوائد ج ۱ صفحہ ۶)

جب یہ سب کام پورا ہو جاتا تب اشاعتِ عام کا حکم دے دیا جاتا تھا پھر جو لکھنا جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے اور زبانی یاد کرنے والے زبانی یاد کر لیا کرتے تھے یہی مطلب ہے زید کے ان الفاظ کا کہ ثم اخرج بہ الی الناس (جب کتابت و تصحیح وغیرہ کے سارے مراتب ختم ہو جاتے تب ہم لوگوں میں اس کو نکالتے یعنی شائع کرتے)

مگر ظاہر ہے کہ ایسی زیر تصنیف متعدد کتابیں جو قرآنی سورتوں کے طریقہ سے تدریجی طور پر مکمل ہوں تو ان کے متعلق یہ خیال کہ وہ مسلسل لکھی جاتیں صحیح نہ ہوگا بلکہ قرآنی سورتوں کی آیتوں کے نزول کا جو حال تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً ان آیتوں کی حیثیت اس قسم کی یادداشتوں کی تھی جنھیں مصنفین اپنی پیش نظر تصانیف کے لئے پہلے جمع کرتے رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان یادداشتوں کو ان کی متعلقہ کتابوں میں ترتیب کے ساتھ درج کرتے چلے جاتے ہیں۔

"ازالۃ الخفا" میں شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں "مثل آں کہ منشی منشات خود را یا شاعر قصائد و قطعات خود را در بیاضہا و سفینہا مندرج سازد[۱]" اور اسی سے ان دونوں روایتوں کا مطلب سمجھ میں آتا ہے جو اس سلسلہ میں پائی جاتی ہیں یعنی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً قرآن اس قسم کی چیزوں سے مثلاً (چمڑا) لخاف (پتھر کی سفید پتلی پتلی تختیاں)، کتف (اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی)، اور عسیب (کھجور کی شاخوں

---

[۱] ازالۃ الخفاء ج ۲ صفحہ ۵

کی جڑ کا وہ حصہ جس میں کانٹے والے پتے نہیں ہوتے) یہ اور اسی قسم کی چیزوں میں لکھا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ یہ روایت مستدرک حاکم میں پائی جاتی ہے یعنی بعض صحابہ فرماتے تھے کہ

کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن فی الرقاع

ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر رقاع (چمڑی قطعات) میں قرآن کی تالیف کرتے تھے۔

دونوں روایتوں سے قرآن کی کتابت کے دو طبعی مرحلوں کا پتہ چلتا ہے یعنی پہلی صورت کے متعلق تو یوں سمجھئے کہ شاعر اپنے مختلف اشعار کو جیسے جیسے وہ تیار ہوتے چلے جاتے ہوں چھوٹے چھوٹے پرزوں پہ نوٹ کرتا چلا جاتا ہے پھر جب اس کام سے فارغ ہو جاتا ہے تب ان ہی یادداشتوں سے اپنی غزلوں کو مرتب کرتا ہے جس شعر کا جس غزل سے تعلق ہوتا ہے اسی میں اس کو داخل کر دیتا ہے سمجھنا چاہیے کہ کچھ یہی صورت قرآن کے متعلق اختیار کی گئی تھی البتہ اتنا فرق معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگ کاغذ وغیرہ معمولی چیزوں پر اپنے منتشر اشعار یا خیالات کو ابتداءً بطور یادداشت کے لکھ لیا کرتے ہیں گویا شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں یادداشت کے ان کاغذی پرزوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ "اگر آں کاغذ را آب رسد یا در آتش نگیرد یا حامل آں بمیرد کا مس ذاہب نابود گردد (یعنی اگر پانی کاغذ کے ان ٹکڑوں میں پہنچ جاتے یا آگ لگ جائے یا جس کے پاس کاغذی یادداشتیں ہوں وہ مر جائے تو اس طرح نابید ہو جائیں جیسے گذشتہ کل نابود ہو جاتا ہے"

مگر آں حضرت صلعم نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے وحی کی ان ابتدائی مکتوبہ یادداشتوں کے لکھوانے کے لئے ایسی چیزوں[۱] کا

---

[۱] لیکن عام طور پہ یہ عجیب بات ہے کہ جن الفاظ میں ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے ترجمہ میں لاپروائی

(بقیہ صفحہ آئندہ)

انتخاب فرمایا تھا جن کے متعلق یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ عام حوادث و آفات کا نسبتاً زیادہ

(بقیہ حاشیہ سلسلۂ صفحہ گذشتہ) سے لوگوں نے کام لیا جس سے غلط فہمی پھیل گئی۔ میں پوچھتا ہوں کہ کوئی یوں کہے کہ اسکولوں میں بچے پتھر کے ٹکڑوں پر لکھتے ہیں یا ہندوستان قدیم میں لکھنے کا جو طریقہ تھا اس کو بیان کرتے ہوئے کہا جائے کہ تاڑ داڑ کے پتوں پر لکھا کرتے تھے کیا یہ واقعہ کی صحیح تعبیر ہوگی کیا اسکولوں میں سلیٹ پر لکھنے کا جو رواج ہے پتھر کے ٹکڑے کہنا ان کی صحیح تعبیر ہے اسی طرح ہندوستان قدیم میں تاڑ کے پتوں پر یوں ہی لکھا جاتا تھا جن لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابوں کو نہیں دیکھا ہے صحیح اندازہ شاید ان کو اب بھی واقعہ کی حقیقی نوعیت کا نہیں ہوسکتا لیکن سچی بات یہ ہے کہ کاغذ کے اوراق سے زیادہ بہتر اور محفوظ طریقہ سے تاڑ کے پتوں پر لکھا جاتا تھا جامعہ عثمانیہ میں مسلم کتب خانہ ہی ان کتابوں کا داخل ہوا ہے تب لوگوں کی آنکھیں کھلیں بجنسہ کچھ اسی قسم کا مغالطہ ان چیزوں کے متعلق بھی عوام میں پھیلا ہوا ہے جن پر قرآنی وحی کی ابتدائی یادداشتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھوایا کرتے تھے مشہور ہوگیا ہے کہ کھجور کی شاخوں بلکہ بعض تو کہہ دیتے ہیں کہ کھجور کے پتوں یا پتھروں یا ہڈیوں پر قرآن لکھا ہوا تھا سوچنے کی بات تھی کہ کھجور کے پتوں بلکہ اس کی شاخ میں بھی اتنی گنجائش کہاں ہوتی ہے جس پر سطر دو سطر ہی لکھی جا سکے اسی طرح بن گھڑے پتھر یا گری پڑی ہڈیوں پر لکھنا کیا آسان ہے تفصیل کے لئے تو حضرت الاستاذ مولانا گیلانی کی کتاب پڑھیئے خلاصہ یہ ہے کہ حدیثوں میں ادیم۔ لخاف۔ کتف۔ عسیب۔ اقتاب کے الفاظ آئے ہیں ادیم باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا تھا عرب جو ایک گوشت خوار ملک تھا کافی ذخیرہ ادیم کا یہاں ملتا تھا حتیٰ کہ خیمہ تک صرف ادیم کے چمڑوں سے تیار کیا جاتا تھا لخاف ہر معمولی پتھر کو نہیں کہتے تھے بلکہ بالاتفاق اہل لغت نے لکھا ہے کہ سفید رنگ کی پتلی پتلی چوڑی چوڑی تختیاں پتھر سے بنائی جاتی تھیں سلیٹ اور ان میں فرق گویا صرف رنگ کا ہوتا تھا اسی طرح اونٹ کے مونڈھے کے پاس گول ہڈی طشتری کی طرح بن جاتی ہے اس کو خاص طریقہ سے تراش کر نکالا جاتا تھا کاٹنے کے عمل میں کبھی شگاف وغیرہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رہ جاتا تھا (دیکھو مسند احمد کی روایت از زید بن ثابت صحابی ص ۱۹۱) اسی لئے قطعۃ من الکتف بھی اس کو کہتے تھے مجمع الزوائد ج ۱۰) عسیب کھجور کی شاخ کو نہیں بلکہ بام قسم کے تمام درختوں کی شاخوں کا وہ حصہ جو تنے سے متصل ہوتا ہے اس میں کافی کشادگی پیدا ہوجاتی ہے۔ تاڑ، ناریل کی شاخوں میں ان کو آپ دیکھ سکتے ہیں عرب کے کھجور کی شاخوں کا یہ حصہ قریب قریب ہندوستان کے ناریل کی شاخوں کے اس حصہ کے برابر ہوتا تھا اس حصہ کو شاخ سے جدا

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

مقابلہ کرسکتی ہیں۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خلافت صدیقی میں حکومت کی طرف سے زید بن ثابت صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن کا ایک نسخہ جو تیار کیا جس کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے تو آں حضرت صلعم کی لکھائی ہوئی یہ ساری یادداشتیں بالکلیہ جوں کی توں اپنی اصلی حالت میں ان کو مل گئی تھیں مکتوبہ یادداشتوں کے اس انبار سے یہ عجیب بات ہے کہ دس پانچ نہیں بلکہ دو تین بھی نہیں صرف سورہ برات کی آخری حصہ کی ایک یادداشت جس میں صرف دو آیتیں تھیں یہی اور فقط یہی ایک یادداشت والا ٹکڑا اس پورے ذخیرے میں ان کو نہ مل سکا لیکن ظاہر ہے کہ صحابۂ کرام کے سینوں میں اور ان کے ذاتی مکتوبہ قرآنی نسخوں میں یہ آیتیں موجود تھیں بلکہ بطور وظیفہ کے ان کے پڑھنے کا معلوم ہوتا ہے کہ عام رواج بھی تھا۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ گذشتہ) کرلیا جاتا تھا اور ان ہی ٹکڑوں کو خشک کرکے لکھتے تھے اقتاب قتب کی جمع ہے اونٹ کے کجاوے میں چھوٹی پٹلیاں جو استعمال ہوتی ہیں ان کو کہتے ہیں یہ چوڑے چوڑے پتلے پتلے تختوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں تازہ لکڑی کے چرتے ہیں تازگی کی وجہ سے عموماً کھردرے ہوتے ہیں اور پرانے کجاووں میں امتداد زمانہ سے ان کا کھردراپن مٹ جاتا تھا لکھنے کے کام کے باآسانی یہ چیرنے سے بن جاتے تھے بتایا جائے کہ ان تفصیلات سے جو ناواقف ہوگا وہ ان عام پھیلے ہوئے الفاظ سے اگر غلط فہمی کا شکار ہو جائے تو کیا بعید ہے مولانا گیلانی کی کتاب میں مبسوط بحث ان کتابی مواد پر کی گئی ہے میں نے اسی کا خلاصہ یہاں درج کیا ہے ۱۲

لہ ابوداؤد وغیرہ صحاح ستہ کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اس باب میں جو مروی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ برات کی آخری ان آیتوں کے متعلق رسول اللہ اپنے صحابیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ صبح و شام جو آدمی ان کی تلاوت سات مرتبہ کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا اور دین کے مشکلات اس کی برکت سے حل کردیں گے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن آیتوں کی یہ خاصیت بیان کی ہو کون ہوگا جو معلوم ہو جانے کے بعد ان سے مستفید نہ ہوتا ہوگا اس سلسلہ میں بعض عملی تجربات بھی لوگوں کو صحابہ ہی کے زمانہ میں ہوتے تھے۔ محمد بن کعب نے اس فوجی مہم کا ذکر کرتے ہوئے جس نے روم کے علاقہ پر حملہ کیا تھا یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک فوجی سپاہی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی راستہ میں بے چارے اٹک گئے راستے میں

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

بہرحال اس وقت تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اور آیتوں اور فقروں کی صرف اسی ایک یادداشت کے سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھائی ہوئی تمام ابتدائی یادداشتوں کا خلافت صدیقی کے زمانہ میں مل جانا خود بھی ایک ایسا واقعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں پر ان کے لکھنے کا انتظام کیا گیا تھا جو اتنی طویل مدت یعنی چوبیس پچیس سال تک حوادث و آفات سے محفوظ رہ سکیں اس لئے کہ نزول وحی کی ابتدا سے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے اس عہد تک جس میں قرآن پر حکومت کے حکم سے حضرت زید بن ثابت نے کام کیا اتنی ہی مدت ہوتی چاہئے ۔

بہرحال ایام جاہلیت کی تاریخ سے جو جاہل ہیں ان کا یہ خیال قطعاً بے بنیاد ہے کہ لکھنے کے سامان کی کمیابی کی وجہ سے رسول اللہ قرآن کی ابتدائی یادداشتوں کو اس قسم کی چیزوں یعنی چمڑے یا لخاف (سنگی باریک تختیوں) عسیب (شاخ خرما کی جڑ کا عریض حصہ) کتف (شانہ شتر) وغیرہ پر لکھوایا کرتے تھے، لیکن یہ وہی کہہ سکتا ہے جسے عرب کے اس صحیح حالات کا علم نہیں ہے تفصیل تو آگے آرہی ہے کچھ نہیں تو ابھی مستدرک حاکم کی جو روایت گذری جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی آیات کی کتابت کے پہلے مرحلہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھ کر رقاع میں قرآن کو صحابہ جمع کرتے تھے اور رقاع جیسا کہ معلوم ہے رقعہ کی جمع ہے یہ چمڑے کے خاص قسم کے ٹکڑے ہوتے تھے جو لکھنے ہی کے لئے تیار کئے جاتے تھے گویا (Parchement) رق ہی کی تعبیر رقاع سے کی گئی ہے یا پارچمنٹ ہی کی کسی خاص قسم کا نام رقاع تھا ۔ باقی آئندہ

(بقیہ سلسلہ صفحہ گذشتہ) کسی نے ان کو سورۂ یاسین کے ان ہی الفاظ کا وظیفہ بتایا اور کہا کہ اسی کو پڑھ کر ٹوٹے ہوئے مقام کو جھاڑا کرو دیکھنا ہے کہ عمل سے اس کی تصدیق ہوئی یعنی ٹانگ ان کی درست ہوگئی اور اتنی درست کہ گھوڑے پر سوار ہو کر فوج میں پھر آ کر مل گئے ۔ دیکھو درمنثور ص ۲۹۷ ج ۲ ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہزارہا سال کے قدیم ترین تاریخی وثائق قرآن کی روشنی میں

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

تمام دینی نوشتے جو خالق کی طرف منسوب تھے ان سب کو اساطیر الاولین (ڈیڑھیوں کی کہانیاں) یا میتھالوجی ٹھہرا کر بصد بے باکی وگستاخی یورپ نے علم کی جدید الحادی نشارۃ میں اس دعوے کی بدبو سے سارے عالم کو متعفن بنا رکھا تھا کہ مذہب اور دین کے سلسلے میں بنی آدم کا ابتدائی دین شرک تھا سمجھا یا جاتا تھا کہ کم عقلی کی وجہ سے ہر ایسی چیز جس سے ہیبت و دہشت کے آثار پیدا ہوتے تھے یا جنھیں دیکھ کر لوگ اچنبھے میں مبتلا ہو جاتے تھے فطرت کے ان ہی مظاہر کے سامنے آدم کی ناتراشیدہ عقل نے سر جھکا دیا۔ بجلی - بادل - سورج - چاند - سانپ - ہاتھی - سانڈ وغیرہ چیزوں کی پوجا کے متعلق ہر بڑی چھوٹی کتاب خواہ کسی فن اور علم میں لکھی گئی ہو اپنی اس لٹائی توجیہ کے تذکرے کو مغربی ومستغرب مصنفین نے ایک قسم کا پیشہ بنا لیا تھا اور شاید کچھ لوگ اب تک بناتے ہوئے ہیں۔

لہ یہ ایک شخصی اصطلاح ہے مطلب یہ ہے کہ ماضی کے ایسے حوادث و واقعات جن کے متعلق صحیح مواد ہمارے پاس نہ ہو۔ جہل کا اقرار و اعتراف بھی صحیح علمی طریقہ ان امور کے متعلق ہو سکتا ہے مگر وسوسہ کی خارشت سے مجبور ہو کر بعض لوگ کچھ نہ کچھ رائے ان کے متعلق قایم کر لینا ضروری سمجھتے ہیں ورنہ اپنی ذہنی کھلاہٹ سے سکون کی کوئی صورت ان کی سمجھ میں نہیں آتی آسان راستہ اس سلسلے میں یہی ہے کہ تکان اوڑھ کر پلنگ پر دراز ہو جاتے ہیں اور وسواسی تک بندیوں سے کام لے کر کوئی رائے قایم کرنے ماضی ہی نہیں بلکہ مستقبل کے متعلق بھی نتائج اور آراء

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

باور کرایا جاتا تھا کہ مشرک انسان عقلی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اپنے معبودوں کو بھی بدلتا چلا گیا
تا آنکہ آخری نقطہ جہاں تک پرانی دنیا کی عقل پہنچ سکی تھی " خدائے واحد " کا تخیل تھا، حاصل
یہی ہوا کہ توحید عہد قدیم کے عقلی ارتقاء کا نتیجہ ہے اور اب جدید دور میں انسانی عقل ترقی
کے جس زینے پر پہنچ چکی ہے اس نے اس " ایک خدا " کی ضرورت کے خیال کو بھی ختم کر دیا
اس آخری حاصل کو سطروں میں تو جگہ نہیں دی جاتی تھی لیکن جو طریقہ بیان اس مسئلہ میں اختیار
کیا گیا تھا اور جس معصومانہ سادگی اور خالص علمی لب و لہجہ میں شرک کے پیٹ سے توحید
کو نکالنے کی کوشش کی جاتی تھی اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر
آدمی کا ذہن " انکار خدا " کے نقطہ پر پھسل کر خود پہنچ جائے گویا بجائے " سطور " کے دل
کی بات " بین السطور " میں بڑے احتیاط کے ساتھ کھپانے والے کھپا دیا کرتے تھے انیسویں
صدی کے عام ادبیات میں اس عجیب و غریب مسئلہ کو کچھ ایسے شاطرانہ طریقہ سے سان دیا
گیا تھا کہ بڑے بڑے دینداروں مذہب کے علمبرداروں تک کو بھی اسٹیج ہی نہیں بلکہ
ممبروں سے بھی دیکھا جاتا تھا کہ " دین کی تشریح اسی راہ سے کر رہے ہیں حیرت ہوتی
تھی کہ آدم و حوا کا قصہ جو کم از کم سامی مذاہب کا ایک عام مشترک قصہ تھا اس قصے میں
انسان اول حضرت آدم علیہ السلام کا سامی مذاہب کی تمام کتابوں میں جن خصوصیتوں کے
ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے ان کو مانتے ہوئے لوگوں کے دل میں یہ بات کیسے جاتی تھی کہ ہمارے
باپ دادوں نے شرک سے شروع کر کے توحید کو اپنا دین بنایا ہے جس آدم اور حوا کے
حالات سے بھی آسمانی کتابوں میں روشناس کرایا گیا ہے وہ اتنے گئے گذرے نہیں معلوم

(بقیہ سلسلہ صفحہ گذشتہ) جن کا چرچا عوام میں پھیلا ہوا ہوتا ہے تحلیل و تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر لکافیاتی
مقدمات ہی سے ان نتائج و آراء کے استنباط میں کام لیا گیا ہے - ۱۲

ہوتے کہ سانپ۔ بچھو۔ آگ اور پانی۔ بجلی اور بادل جیسی چیزوں کو پوجتے ہوں۔

بہر حال یہ قصہ تو بڑا طویل ہے بلکہ اب تو ایک حد تک پارینہ کہانی ہو چکا ہے، خود یورپ کے علمی طبقوں میں اس "لحافی نظریہ" کا کافی مضحکہ اڑایا جا چکا ہے حال ہی کی ایک مطبوعہ کتاب (The Bible came alive) میں مسٹر مارسٹن نے اس لغو دعوے کی تردید کرتے ہوئے کہ توحید کا عقیدہ شرک سے پیدا ہوا ہے قدیم اقوام کی تاریخ کے مستند عالم مسٹر لانگڈن کے حوالے سے ان کے یہ فقرے نقل کئے ہیں کہ

"مذہب کی تاریخ کی یہ غلط تعبیر ہے کہ شرک ادنیٰ قسم کی تہذیب سے تعلق رکھتا ہے۔"

بلکہ اس کے برخلاف واقعہ یہ ہے کہ

"نسل انسانی کی قدیم ترین مذہب کی تاریخ توحید سے آخری درجہ تک کے شرک اور بدروحوں کے اعتقاد کی طرف ایک تیز رو پرواز ہے۔"

لانگڈن نے مختلف مشرکانہ تمدن و تہذیب کا حوالہ دیتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ

"درحقیقت شرک بہترین قسم کی تہذیب اور تمدن کی پیداوار ہے۔"

ان کا خیال ہے کہ شرک سے توحید نہیں پیدا ہوئی بلکہ

"توحید ہی سے شرک نے جنم لیا اور توحید ہی کی اسی شرح و توجیہ سے شرک پیدا ہوا جو غلط طریقہ پر کی گئی۔" دیکھو کتاب مذکور ص۱۵۲

دور کیوں جائیے خود مسلمانوں کی تاریخ ہی لانگڈن بے چارے کے دعوے کی تصدیق کے لئے کافی ہے وہ سارے شرکی کاروبار جن کا رواج مختلف شکلوں میں مسلمانوں میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا کیا یہ سب کچھ اسی زمانے کی یادگار نہیں ہے جب تمدن و تہذیب کی آخری ارتقائی مینار پر چڑھ کر مسلمان دنیا کی ساری قوموں کے مقابلہ میں سربلند

ہو چکے تھے۔

بہر حال اس وقت اس خاص مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے میں نے قلم نہیں اٹھایا ہے یہ تو ایک تمہیدی گفتگو تھی اس مختصر سے مضمون میں جس چیز کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ چند دلچسپ قدیم تاریخی وثائق ہیں، جن کا عنوان میں ذکر کیا گیا ہے۔

مصری تمدن و تہذیب کہئے یا فرعونی ہیکڑی اسی سے اپنے شجرۂ نسب کو ملاتے ہوتے یورپ کے عام مورخین اگرچہ مصر ہی کو تہذیب کا قدیم گہوارہ قرار دیتے ہیں لیکن بائبل ہی نہیں بلکہ قرآن نے بھی جس ترتیب کے ساتھ پیغمبروں کا اور ان قوموں کا ذکر کیا ہے جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے اس ترتیب کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو انسانیت کی تاریخ کا وہ دور جس کی تعبیر

"دجیلی تمدن"

سے ہم کر سکتے ہیں یعنی دجلہ و فرات کے درمیانی علاقے سے شروع ہو کر عرب کے جنوب میں عادی تمدن، اور شمال کے ثمودی تمدن ان کے سوا اسی کے آس پاس کے علاقوں سے گذرتے ہوئے بالآخر اس قدیم عہد کا اختتام دریائے نیل کے کنارے اس طوفانی جوش و خروش پر ہوا جسے فراعنہ کے اہرامی تمدن کا نام دیا جا سکتا ہے دجلہ اور نیل کے درمیان کا یہی علاقہ انسانی کمالات کی نشو و نما اور ان کے آثار و نتائج کے ظہور کی آماجگاہ زمانہ دراز تک بنا رہا ہے اگرچہ قوموں پر پیرانہ سالی کا جو شوق اس زمانہ میں عموماً مسلط ہے ہر قوم یہی چاہتی ہے کہ دنیا کی قوموں میں ماننے والے اسی کو سب سے زیادہ بوڑھی قوم مان لیں۔ یہ اور بات ہے لیکن جن حقائق و واقعات تک تاریخ کی رسائی اب تک ممکن ہو سکی ہے ان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے اور جس خطے میں بھی تہذیبی اور

تمدنی ترقیاں رونما ہوئی ہیں۔ ان سب کا زمانہ اسی قدیم دنیا کے بعد ہے بہرحال اور کچھ مانا جاتے یا نہ مانا جائے۔ . . . . . لیکن مصریوں کے تمدن کی غیر معمولی قدامت کا انکار نہیں کیا جا سکتا یہی ایک ایسی سرزمین ہے کہ چار چار پانچ پانچ ہزار کے تحریری وثائق اس کے پیٹ سے آج بھی برآمد ہو رہے ہیں، یورپ کے اہل علم کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے ان قدیم تاریخی وثیقوں کے پڑھنے کو ممکن بنا دیا[1] حال میں مصر کے ایک قبطی فاضل "انطرن زکری" نے ان ہی پرانے تاریخی وثیقوں میں سے چند خاص وثائق کا یورپین زبان کے ترجموں کی مدد سے عربی میں بھی ترجمہ شائع کیا ہے، مصری حکومت کے "متحف" یعنی میوزیم سے مترجم کا چونکہ تعلق ہے اس لئے اہم چیزوں تک رسائی ان کے لئے آسان تھی، اس کتاب میں مصر کے پرانے تراشیدہ مجسموں کی بھی بہت سی تصویریں شریک ہیں قدیم مصری تمدن کے سمجھنے کے لیے یہ کتاب مفید معلومات پر مشتمل ہے۔

مری خاص دلچسپی کی چیز اس کتاب میں ان تاریخی وثیقوں کے بعض خاص فقرے

---

[1] "ممکن بنا دیا ہے" یہ اس لئے میں کہہ رہا ہوں کہ "ہیروغلیفی" یا "ہیروطیقی" حروف کے پڑھنے کا جو طریقہ مغربی فاضلوں نے نکال لیا ہے اب اس کے متعلق تو شک و شبہ کی گنجائش کم ہی رہ گئی ہے لیکن پڑھ لینے کے بعد نتائج جو ان سے پیدا کئے جاتے ہیں ان نتائج کے متعلق بے محابا ایمان لانے کی بدعادت ہم مشرقیوں میں جو پھیل گئی ہے ضرورت ہے کہ اس پر نظرثانی کی جائے مگر یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ان حروف کے پڑھنے کا سلیقہ ہم خود اپنے اندر پیدا کریں ورنہ اندھی تقلید پر ہمارا جہل خود ہمیں مجبور کرتا رہے گا لوگوں کا یہ خیال کہ اس قسم کے پرانے حروف کا پڑھنا کوئی جدید اقدام ہے صحیح نہیں ہے فتوحات مکیہ میں شیخ ابن عربی نے اہرام کی بعض عبارتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پڑھنے والوں نے اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے دفلینہ طلبی کا خبط جیسا کہ ابن خلدون نے مقدمہ میں لکھا ہے مصریوں پر زمانے سے مسلط ہے کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اس

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اور مشتملات ہیں، ان ہی کو اس وقت پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یہ مصر کے پرانے کاغذ جسے "اوراق بردیہ" کہتے ہیں اسی میں لکھے ہوئے وثائق مختلف اوقات میں لوگوں کو ملے ہیں جن میں پہلا وثیقہ تو وہ ہے، جو بردی کے کاغذ کے اٹھارہ صفحات پر لکھا ہوا ہے قدیم فرعونی شہر طیبہ جسے آج کل الاقصر کہتے ہیں اسی کے قریب ایک مقبرے میں کسی مصری کسان کو یہ اوراق اس وقت ملے جب وہ اس مقبرے کی زمین کھود رہا تھا آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے ایک فرانسیسی فاضل نے ۱۸۴۷ء میں ان اوراق کو شائع کیا اس فرانسیسی فاضل کا نام (Prius ed'Aveme) پریس دادون تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ سرخ اور سیاہ روشنائی سے یہ مصری مخطوطہ لکھا ہوا تھا، مصر کے دو پرانے حکیم جن میں ایک کا نام قاق منا۔ اور دوسرے کا نام فتاح حتب تھا ان ہی دونوں کے وہ فقرے بتائے ہوئے ہیں جو ان اوراق میں درج تھے۔ مصری تاریخ کے محققین نے حساب کر کے اندازہ لگایا ہے کہ کم از کم پانچ ہزار سال قبل مسیح کی یہ کتاب ہے اسی لئے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دنیا کے کتب خانوں میں جتنی کتابیں اس وقت پائی جاتی ہیں ان میں سب سے قدیم ترین کتاب یہی مصری مخطوطہ قرار پا سکتا ہے: اس مخطوطہ کا قدیم مصری زبان سے یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا شابس (Chabas) اور ویری (Virey) نے فرانسیسی زبان میں لوتھ (Loth) نے لاطینی میں جرمنی میں بروگش پاشا نے اور انگریزی میں گن (Gunn) نے اس کو منتقل کیا،

(بقیہ سلسلہ صفحہ گذشتہ) ضبط میں ان حروف کے پڑھنے سے ان کو باز رکھا ہو گا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ گو یورپ بھی بہ ظاہر علم کے نام سے اس کام کو کرتا ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ پرانے دفائن و خزائن کی کوشش کو ان کی ان کوششوں میں دخل نہیں ہے۔ ملہ انگریزی میں "پیپرس" کاغذ کو اسی لئے کہتے ہیں کہ مصر کے "اوراق بردیہ" ایک خاص قسم کے پودے کے گودے سے بنائے جاتے تھے۔ جس کا نام پیپرس تھا۔

دوسرا مخطوطہ اسی سلسلہ کا وہ ہے جس کا زمانہ تین ہزار تین سو سال قبل مسیح متعین کیا گیا ہے یہ بھی الاقصر (طیبہ) ہی کے کھنڈروں کے پاس اس مقام میں ملا جسے دیر بحری کہتے ہیں، یہ مصر کے ایک کاہن آنی نامی کی طرف منسوب ہے، کہتے ہیں کہ اپنے شاگرد خون سو حتب نامی کو خطاب کرکے حکیم آنی نے یہ نصیحتیں کی تھیں اس مخطوطہ کا ترجمہ بھی فرانسیسی زبان میں شاباس نے اور دی رو جیہ نے جرمنی میں ارمن نے انگریزی میں پروفیسر ماس برو نے کیا ہے۔

تیسرا مخطوطہ آمن ہت من کان خت کی طرف منسوب ہے، کہتے ہیں کہ قدیم مصر کا زبردست ادیب تھا، تین ہزار سال قبل مسیح سمجھا جاتا ہے کہ یہ مصری تصنیف مرتب ہوئی، مسٹر بڈگ (Budge) نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔

بردی کے اوراق پر ایک اور مخطوطہ بھی مصری آثار کے محققین کو ملا ہے لیکن صحیح تخمینہ اس عہد کا نہ ہو سکا، تاہم قدامت میں اس کے بھی شبہ نہیں ہے۔ دیموطیقی حروف سے مختلف مغربی زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

انطرن زکری کے عربی تراجم سے مصر کے ان قدیم مخطوطات کے بعض فقروں کا ترجمہ میں یہاں درج کرتا ہوں، پہلے ان کو پڑھ لیجئے۔

(۱) سیدھی راہ چلو، نہ ہو کہ تم پر اللہ کا غضہ ٹوٹ پڑے۔

(۲) جھگڑنے میں ہٹ دھرمی سے پرہیز کیجیو، ورنہ خدا کی سزا کے مستحق بن جاؤگے

(۳) لوگوں کے دلوں میں دہشت نہ ڈالو، ورنہ خدا اپنے انتقام کی لاٹھی سے تمہیں پیٹے گا۔

(۴) ظلم اور زیادتی کے ذریعہ سے جس دولت کو کماکر تم جینا چاہتے ہو اور اسی

کے بل بوتے پر اگر امیر بننے کی تم کوشش کرو گے، تو خدا تمہاری نعمت تم سے چھین لے گا اور تم کو کنگال بے نوا بنا چھوڑے گا۔

(۵) خدا جسے چاہتا ہے آبرو اور عزت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے رسوا اور ذلیل کرتا ہے کیونکہ اسی کے ہاتھ سارے امور کی کنجیاں ہیں، خدا کے ارادے کا مقابلہ بے سود اور لاحاصل ہے۔

(۶) اگر تم دانش مند آدمی ہو تو چاہیے کہ اپنے بیٹے کی پرورش اس ڈھنگ سے کرو جس سے خدا خوش ہو۔

(۷) خلقت کا سارا کاروبار اس خدا کے ہاتھ میں ہے جو اپنی مخلوق کو چاہتا ہے

(۸) پستی کے بعد جب بلندی تمہیں میسر آئے، اور محتاجی کے بعد سرمایہ ہاتھ لگے تو جن لوگوں کے حقوق تمہارے مال میں ہیں ان کو محروم کرکے اس سرمایہ کو جمع کرنے کی کوشش نہ کیجیو کیونکہ اللہ کی نعمتوں کے تم امین ہو اور امین کا فرض ہے کہ جو امانت اُسے سونپی جائے اسے ادا کرے۔

(۹) دینی قاعدے (شرائع) اور قوانین کی خلاف ورزی کرنے والا بدترین سزا سے دوچار ہوگا۔

(۱۰) زانی کا مال صرف برباد ہونے کے لئے ہے، ہر زانی خدا کے اور لوگوں کے غصہ کا شکار ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ شریعت کا مخالف ہے اور فطرت کے قوانین کا بھی

(۱۱) خدا سے نزدیکی چاہتے ہو، تو اعمال و کردار میں چاہیے کہ خدا کے لئے اپنے آپ کو مخلص بنالو بندگی واقعی تمہاری سچی ہے اس کو جانچتے رہو تب خدا کی رحمت تمہارے شامل حال ہو جائے گی، اور اپنی چشم عنایت سے تم کو وہ دیکھنے لگے گا کیونکہ خدا کی بندگی

میں جو سستی سے کام لیتے ہیں ان ہی کو وہ چھوڑ دیتا ہے۔

(۱۲) تیرا پروردگار جن باتوں سے ناراض ہوتا ہو، ان کو لے کر اس کے سامنے نہ جا اور اس کی بادشاہت کے بھیدوں کے ٹٹول میں نہ پڑا کر کیونکہ عقلی پرواز کے حدود سے وہ باہر ہیں چاہئے کہ اللہ کی وصیتوں اور فرمانوں کو اچھی طرح یاد رکھا کرو وہ ان ہی کو اونچا کرتا ہے جو اس کی برتری کا اقرار کرتے ہیں۔

(۱۳) تہواروں کے دن خدا کے گھر میں شور وغل نہ مچاؤ اپنے پروردگار سے گڑگڑا کر مخلص دل اور پست آواز کے ساتھ دعا کیا کرو۔ دعاء کے قبول ہونے کی توقع ایسی صورت میں زیادہ ہوتی ہے۔

(۱۴) تم سے جب کوئی مشورہ چاہے تو کتب منزلہ (یعنی خدا کی اتاری ہوئی کتابوں) کے مطابق اس کو مشورہ دیا کرو۔

(۱۵) جھوٹی تہمت جس پر جوڑی جائے اس کو چاہئے کہ اس ظلم کو خدا کے سامنے پیش کردے سچی بات کے ظاہر کرنے اور جھوٹ کے مٹانے کا خدا ضامن ہے۔

(۱۶) سب سے بڑا آدمی وہی ہے جو حق اور سچائی کی راہوں پر گامزن ہے اور سیدھی راہ (صراط مستقیم) پر چلا جارہا ہے۔

(۱۷) پاپی آدمی دوسری زندگی میں آگ (دوزخ) سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔

(۱۸) انصاف کے حدود اٹل ہیں بدل نہیں سکتے۔

(۱۹) قناعت کامیاب زندگی کی واحد ضمانت ہے اور ہر قسم کی بھلائیوں اور نیکیوں کا سرچشمہ بھی وہی ہے۔

(۲۰) زندگی کی لذتوں کو وہ کھو بیٹھے گا جو اپنے آپ کو دنیا کے مشکلات ہی میں

اٹھاکر سارا وقت ان ہی کے نذر کر رہا ہے۔

(۲۱) نیکیوں اور خدا کی حمد وستائش اور اس کے آگے سجدہ ریزیوں ہی سے دلوں کے پاک کرنے میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

(۲۲) استوار اور محکم بنیاد پر اپنی زندگی کی تعمیر کو چاہیے کہ کھڑی کرو، اور کسی بلند مقصد کو سامنے رکھ کر آگے بڑھو اسی طریقہ سے پیری کی اس منزل تک پہنچ سکتے ہو جو تعریف کی مستحق ہو، اور آخرت (دوسری زندگی) میں بھی کسی جگہ کے بنا لینے میں اسی طریقہ سے تم کامیاب ہو سکتے ہو (یاد رکھو) کہ ابرار اور نیک لوگوں کو موت کی کش مکش اور اس کی سکرات پریشان نہیں کر سکتی۔

(۲۳) لوگوں کی برائیوں کے ذکر سے اپنی زبان کو پاک رکھنے کی کوشش کرو (یاد رکھو) کہ ساری برائیوں کی جڑ زبان ہی ہے بات کرنے میں اس کا لحاظ رکھا کرو کہ زبان سے اچھی باتیں نکلیں اور بری باتوں سے بچتے رہو کیونکہ قیامت کے دن ہر وہ بات جو تمہاری زبان سے نکلی ہے تم اس سے پوچھے جاؤ گے۔

(۲۴) اپنے والدین کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرتے رہنا، اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان باتوں کو اختیار کرنا چاہیے جو اُن کے لئے بھلی ہوں، والدین کے ساتھ حسن سلوک نفع پہنچانے والے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے اس کے قبول ہونے کی امید رکھنی چاہیے، تم والدین کے ساتھ اچھا سلوک جب کرو گے تو تمہاری اولاد بھی یہی برتاؤ تمہارے ساتھ کرے گی۔

(۲۵) ماں کو خدا نے تمہارے لئے مسخر فرما دیا، پیٹ میں رکھنے اور جننے دودھ پلانے میں تین سال تک وہ ہر طرح کی سختیوں کو برداشت کرتی ہے اور کڑیاں

جھیل جھیل کر تمہیں پالتی ہے تمہاری گندگیوں سے اسے گھن نہیں آتی اور تمہارے پڑھنے پالنے کی محنتوں سے وہ کبھی نہیں تھکتی ایک دن کے لئے بھی نہیں چاہتی کہ بجائے اپنے کسی دوسرے کے سپرد تمہیں کردے، تمہارے اُستاد کی خدمت کرتی ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک صرف اس لئے کرتی ہے تاکہ تمہاری تعلیم کی طرف پوری توجہ کریں پس اب جب تم خود صاحب اولاد بن چکے ہو، چاہیے کہ ان بچوں کے ساتھ ہی برتاؤ کرو جیسے تمہاری ماں نے تمہارے ساتھ کیا تھا، (دیکھو!) ایسا نہ ہو کہ تمہاری ماں تم سے بگڑ بیٹھے، نہ ہو کہ خدا کے سامنے ہاتھ اُٹھا کر تمہارے لئے وہ بددعا کرے ماں کی بددعاء سُنی جاتی ہے اور قبول ہو جاتی ہے۔

(۲۶) نشے باز کے گھر میں قدم نہ رکھنا خواہ اس کی وجہ سے عزت اور بلندی ہی کی تمہیں توقع کیوں نہ ہو۔

(۲۷) شراب خانوں کے گرد بھی کبھی نہ پھٹکنا شراب خوری کے بُرے انجام سے بچنے کی یہی ایک صورت ہے، شرابی سے ایسی غلطیاں صادر ہوتی ہیں جن پر ہوش میں آنے کے بعد وہ خود پچھتاتا ہے شرابی لوگوں کی نگاہوں میں ہمیشہ ذلیل وخوار رہتا ہے خود اس کے ساتھی جو اس کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں اور اس کی برائیوں میں اس کے ساجھی اور شریک رہتے ہیں ان کی نظروں میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

(۲۸) دوسرے کے مال کا چرانے والا کیا نہیں ڈرتا کہ اللہ اسی وقت اُس کی جان کو چھین لے اور اس کے مال ومنال کو تتر بتر کر دے اُس کے گھر بار کو اُجاڑ کر رکھدے

(۲۹) امیر آدمی جب کسی غریب کو ذلیل کرتا ہے تو یاد رکھو کہ اس امیر کو) خدا بھی رسوا کرے گا اس دنیا میں بھی، اور آگ کا عذاب آخرت میں بھی اس کو چکھائے گا۔

(۳۰) بدکردار سے بچتے رہنا کیونکہ بدکردار آدمی بے وقوف بھی ہوتا ہے اور خدا اور عام لوگ دشمنی کی نظر سے اس کو دیکھتے ہیں۔

(۳۱) خدا کی پاکی بیان کرتا رہ اور شیطان سے اکڑا رہ۔

(۳۲) کاروبار یا جائداد وغیرہ میں جو تیرے شریک ہوں ان کو حساب وکتاب میں دھوکے نہ دیا کرو اگر ایسا کروگے، تو خدا تم سے غصہ ہو جائے گا اور لوگوں میں تمہاری بددیانتی، بے وفائی کی شہرت ہوگی۔

(۳۳) جو کچھ تمہارے دل میں ہو دھوکہ دینے کے لئے لوگوں کے سامنے اس کے برعکس اپنے آپ کو پیش نہ کیا کرو اپنے ظاہر کو باطن کے مطابق رکھنے کی کوشش کرو (یاد رکھو کہ جھوٹ بولنے والے مکار دھوکہ باز کو خدا غصہ اور غضب کی نظر سے دیکھتا ہے

(۳۴) حلال ذریعہ سے حاصل کیا ہوا ایک حبہ حرام کے ہزار سے کہیں بہتر ہے

(۳۵) مال کی محبت میں سراسیمگی فضول ہے کیونکہ روزی تو بٹی ہوئی ہے اور ہر شخص کو وہی ملتا ہے جو اس کا حصہ ہے۔

(۳۶) مال اندوزی ہی کو اپنا سب سے بڑا مقصود اور اپنی کوشش کا محور نہ بنا کیونکہ خدا جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

(۳۷) ایسا امیر جو محتاج کو پیٹ بھر کھانا کھلاتا ہے خدا کو خوش کرتا ہے کیونکہ امیر کو خدا نے اپنی نعمتوں کا صرف امین بنایا ہے۔

(۳۸) غریب آدمی کو جو دیتا ہے وہ خدا کو دے رہا ہے۔

(۳۹) نیک آدمی اپنی آخرت (مرنے کے بعد کی زندگی) کو یاد کرتا رہتا ہے

(۴۰) بہشت ان ہی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو غریب آدمی کے لئے

قربانیاں کرتا ہے۔

(۴۱) ہر اس راستے سے دور رہنا، جو شیطان سے تم کو نزدیک کرتا ہو۔

(۴۲) جو باتیں ناجائز اور حرام ہیں ان کا ارادہ بھی نہ کیجیو کیونکہ دوسرے عالم میں اپنے حصے کو تم کھو دو گے۔

(۴۳) کامیابی اور سعادت واقبال صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی جسم کو پالتا رہے بلکہ حقیقی اقبال مندی یہ ہے کہ روح کو اس کی خوراک پہنچائی جائے۔

(۴۴) سرمایہ اکٹھا کرنے کی دھن میں نہ لگو، تم کیا جانتے ہو کہ انجام کن شکلوں میں تمہارے سامنے آنے والا ہے (یاد رکھو) کہ عن قریب اس سرمایہ کو چھوڑ کر تم چل دو گے اور دوسرے اس سے چین کریں گے۔

(۴۵) بدکار لوگوں سے نہ بات چیت کرنی چاہیے اور نہ کسی قسم کا کوئی کاروبار

(۴۶) دیکھو! لوگوں کو فریب میں مبتلا نہ کیا کرو ورنہ تم کو بھی لوگ دھوکے دیں گے

(۴۷) گھر میں فحش اور بری باتیں زبان پر نہ لایا کرو! یاد رکھو کہ تمہارے گھر والے تمہاری پیروی کریں گے، غیبت یعنی بیٹھ پیچھے کسی کی برائی نہ کرو۔

(۴۸) اپنے ہمسائے کی عورت کو ارادۃً نہ گھورو، جو ایسا کرتا ہے وہ ایک قسم کا کھیڑیا ہے۔

(۴۹) کسی کو دکھ نہ دو، خواہ ساری دنیا ہی تمہیں کیوں نہ مل رہی ہو۔

(۵۰) غریب آدمی کو مالی مدد سے محروم نہ رکھو مرنے کے بعد اسی کی وجہ سے تم رحم کے مستحق ہوگے۔

بردی یا پاپیرس پودے کے گودے کے کاغذ کے ان قدیم مخطوطات سے

(۳۰) بدکردار سے بچتے رہنا کیونکہ بدکردار آدمی بے وقوف بھی ہوتا ہے اور خدا اور عام لوگ دشمنی کی نظر سے اس کو دیکھتے ہیں۔

(۳۱) خدا کی پاکی بیان کرتا رہ اور شیطان سے کنارہ۔

(۳۲) کاروبار یا جائداد وغیرہ میں جو تیرے شریک ہوں ان کو حساب و کتاب میں دھوکے نہ دیا کرو اگر ایسا کروگے، تو خدا تم سے غصہ ہو جائے گا اور لوگوں میں تمہاری بددیانتی، بے وفائی کی شہرت ہوگی۔

(۳۳) جو کچھ تمہارے دل میں ہو دھوکہ دینے کے لئے لوگوں کے سامنے اس کے برعکس اپنے آپ کو پیش نہ کیا کرو اپنے ظاہر کو باطن کے مطابق رکھنے کی کوشش کرو (یاد رکھو کہ جھوٹ بولنے والے مکار دھوکہ باز کو خدا غصہ اور غضب کی نظر سے دیکھتا ہے

(۳۴) حلال ذریعہ سے حاصل کیا ہوا ایک حبہ حرام کے ہزار سے کہیں بہتر ہے

(۳۵) مال کی محبت میں سراسیمگی فضول ہے کیونکہ روزی تو بٹی ہوئی ہے اور ہر شخص کو وہی ملتا ہے جو اس کا حصہ ہے۔

(۳۶) مال اندوزی ہی کو اپنا سب سے بڑا مقصود اور اپنی کوشش کا محور نہ بنا کیونکہ خدا جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

(۳۷) ایسا امیر جو محتاج کو پیٹ بھر کھانا کھلاتا ہے خدا کو خوش کرتا ہے کیونکہ امیر کو خدا نے اپنی نعمتوں کا صرف امین بنایا ہے۔

(۳۸) غریب آدمی کو جو دیتا ہے وہ خدا کو دے رہا ہے۔

(۳۹) نیک آدمی اپنی آخرت (مرنے کے بعد کی زندگی) کو یاد کرتا رہتا ہے

(۴۰) بہشت ان ہی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو غریب آدمی کے لئے

قربانیاں کرتا ہے۔

(۴۱) ہر اس راستے سے دور رہنا، جو شیطان سے تم کو نزدیک کرتا ہو۔

(۴۲) جو باتیں ناجائز اور حرام ہیں ان کا ارادہ بھی نہ کیجیو کیونکہ دوسرے عالم میں اپنے حصے کو تم کھو دوگے۔

(۴۳) کامیابی اور سعادت واقبال صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی جسم کو پالتا رہے بلکہ حقیقی اقبال مندی یہ ہے کہ روح کو اس کی خوراک پہنچائی جائے۔

(۴۴) سرمایہ اکٹھا کرنے کی دھن میں نہ لگو، تم کیا جانتے ہو کہ انجام کن شکلوں میں تمہارے سامنے آنے والا ہے (یاد رکھو) کہ عن قریب اس سرمایہ کو چھوڑ کر تم چل دوگے اور دوسرے اس سے چین کریں گے۔

(۴۵) بدکار لوگوں سے نہ بات چیت کرنی چاہیے اور نہ کسی قسم کا کوئی کاروبار

(۴۶) دیکھو! لوگوں کو فریب میں مبتلا نہ کیا کرو ورنہ تم کو بھی لوگ دھوکے دیں گے

(۴۷) گھر میں فحش اور بری باتیں زبان پر نہ لایا کرو! یاد رکھو کہ تمہارے گھر والے تمہاری پیروی کریں گے، غیبت یعنی پیٹھ پیچھے کسی کی برائی نہ کرو۔

(۴۸) اپنے ہمسائے کی عورت کو ارادۃً نہ گھورو، جو ایسا کرتا ہے وہ ایک قسم کا بھیڑیا ہے۔

(۴۹) کسی کو دکھ نہ دو، خواہ ساری دنیا ہی تمہیں کیوں نہ مل رہی ہو۔

(۵۰) غریب آدمی کو مالی مدد سے محروم نہ رکھو مرنے کے بعد اسی کی وجہ سے تم رحم کے مستحق ہوگے۔

بردی یا پاپیرس پودے کے گودے کے کاغذ کے ان قدیم مخطوطات سے

صرف پچاس فقروں کا انتخاب ترجمہ کے لئے میں نے کیا، کوشش کی گئی ہے کہ سادہ لفظوں میں ہر فقرے کا لفظی ترجمہ پیش کر دیا جائے النظرن زکری نے ہر اس موقعہ پر جہاں آپ کو "خدا" کا لفظ میرے ترجمے میں ملے گا "اللہ" کا لفظ استعمال کیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے "اللہ" کا یہ لفظ کسی "قدیم مصری" لفظ کا ترجمہ ہے جس کا مفہوم وہی ہے جو عربی زبان کے لفظ "اللہ" سے سمجھا جاتا ہے[1]۔

کچھ بھی ہو یہ پچاس فقرے ہیں جن کی تاریخ آج سے پانچ ہزار سے سات ہزار برس تک پہنچتی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ گہری بات سوچنے کی یہ ہے کہ خدا اور خدا کی نازل کی

---

[1] النظرن زکری نے دیانۃ المصریین یعنی مصریوں کے مذہب کے نام سے اسی کتاب میں ایک مستقل باب لکھا ہے جس میں انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ قدیم مخطوطات جو مقبروں اور پرانے شہر کے کھنڈروں سے آج کل برآمد ہو رہے ہیں ان سے روز بروز یہ یقین پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے کہ ابتداءً مصر والوں کا مذہب توحیدی تھا وہ مرنے کے بعد دوسری زندگی کے بھی قائل تھے جنت و دوزخ کو بھی مانتے تھے لیکن بعد کو جیسے جیسے فرعونی تمدن کا زور بڑھا خالق کائنات کے مختلف اسماء و صفات کو استقلالی وجود عطا کیا گیا جس سے مصری ثالوث یعنی تین خداؤں والا عقیدہ پیدا ہوا یعنی امون دموت د خونسو یہ بجنسہ وہی بات ہے جو ہندوستان کی توحید میں بھی بالآخر برہما ۔ وشنو ۔ شیو نے تثلیث کا قالب اختیار کر لیا تھا ان ہی کا بیان ہے کہ علاوہ اس کے مصری اپنے آباد اجداد کی روحوں کو بھی پوجنے لگے ان کے ایک دیوتا کا نام اتوم بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اسی کا تلفظ اتم بھی ملتا ہے اور یہ آدم کے لفظ کی ایک صورت ہے ہندوستان میں بھی آتما اور مہاآتما کے الفاظ اسی مصری لفظ اتوم یا اتم سے ملتے جلتے ہیں کیا تعجب ہے کہ ان کی اصل بھی آدم ہی ہو دکا ت سے بدل جانا پرانی زبانوں کا عام دستور ہے کہ دونو قریب المخرج حروف ہیں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ خالق عالم کے متعلق مصریوں میں رع کا لفظ بھی مستعمل تھا جو شاید راعی (رکھوالا) کی ایک شکل ہو راتے بمعنی بادشاہ اب بھی ہندوستان میں مروج ہے دوسرا نام امون ہے جس کے معنے "نادیدہ" بیان کیا ہے ایک اور لفظ "نوتر" بھی مصریوں میں ملتا ہے جس سے مراد اللہ لیتے تھے ۱۲

ہوئی کتابوں، نیکی اور بدی، مرنے کے بعد ان کے نتائج کا ظہور بہ شکل بہشت و دوزخ اور وہ ساری باتیں جن کا ذکر ان فقروں میں کیا گیا ہے ان کے تذکرے میں جو بے ساختہ پن پایا جاتا ہے اور بیان میں ایسا لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے کہ گویا سننے والے موروثی طور پر ان باتوں کو مانتے چلے آرہے ہیں ہر ایک کی جانی بوجھی باتیں ہیں اس حیثیت سے اگر غور کیا جائے اور سوچا جائے کہ کتنی طویل تربیت کے بعد عوام میں اس قسم کی ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ ان مصری عقائد کے متعلق ماننا پڑے گا کہ ان کی عمر مذکورہ بالا مدت سے کہیں زیادہ طویل ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے یہ سوال اٹھا کر یعنی

اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَھُمْ مَّا لَمْ یَاْتِ اٰبَآءَھُمُ الْاَوَّلِیْنَ (المومنون)	کیا بات کو وہ سوچتے نہیں یا ان کے پاس کوئی ایسی بات آئی ہے جو ان کے پہلے باپ دادوں کے پاس نہیں آئی تھی ۔

جواب میں کبھی اس راز کا افشا کرتا ہے مثلاً فرمایا گیا ہے

لَقَدْ وَصَّلْنَا لَھُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ (القصص)	ہم ان کے لئے بات کو جوڑتے چلے آئے تاکہ وہ چونکتے رہیں ۔

اسی بنیاد پر قرآنی تعلیمات کو بجائے کسی "جدید نظام حیات" کے بار بار دہرا دہرا کر کبھی

اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی (الاعلیٰ)	یقیناً یہی بغیر کسی شک و شبہ کے پچھلی کتابوں میں بھی ہے ۔

کبھی

وَاِنَّہٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ	اور یقیناً وہ (یعنی قرآن) قطعاً پہلوں کی کتابوں میں تھا ۔

لہ اسی رسولاً بعد رسول عام مفسرین کی کتابوں میں اس آیت کا یہ مطلب آپ کو مل جائے گا ۱۲

وغیرہ الفاظ سے اسی حقیقت کو وہ ذہن نشین کرنا چاہتا ہے کہ یہ نسل انسانی کی زندگی کا پرانا اور قدیم ترین دستور ہے یہی آئین حیات تھا جو نوحؑ کو بھی عطا ہوا تھا اور ابراہیمؑ کو بھی موسیٰؑ کو بھی اور عیسیٰؑ کو بھی بلکہ سارے "النبیوں" کو اب پڑھتے قرآن میں آپ کو یہ چیز ملتی چلی جائے گی سورۃ الانعام میں اس نے پیغمبروں کی طویل فہرست دے کر اور یہ بتاتے ہوئے کہ اس فہرست میں جن لوگوں کا نام لیا گیا ہے وہ ہوں یا جو ان سے پہلے گذرے یا ان کے بعد آئے۔ ان میں نسلی تعلق ہو، یا نبوت و رسالت کی اخوت کا رشتہ ہو، الغرض سارے جہاں کے پیغمبروں کو خدا کی طرف سے جو راہ نمائی اور ہدایت عطا ہوئی تھی اسی کی طرف اشارہ کر کے خود صاحب قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ — یہی وہ لوگ ہیں جن کی خدا نے راہ نمائی کی ہیں
فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام) — چاہیئے کہ ان ہی کی راہ نمائیوں کی تم بھی پیروی کرو

ظاہر ہے جس امت کے پیغمبر ہی سے یہ مطالبہ کیا گیا ہو وہی امت اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتی ہے اور یہی اس کو سمجھایا بھی گیا ہے کہ قرآن کی شکل میں جس دین کا دستور اس کو عطا کیا گیا ہے یہ کوئی نیا دین اور جدید مذہب، یا **انوکھا** دھرم نہیں ہے بلکہ وہی قدیم موروثی دین ہے جس کی تعلیم جو آدم کی اولاد کو زمین کے اس کرے پر آباد ہونے کے ساتھ ہی مسلسل ملتی رہی ہے، اسی طرح ملتی رہی ہے جیسے ہوا، پانی، روشنی وغیرہ جیسی چیزیں ان تقاضوں کی تکمیل کے لئے قدرت ہی کی طرف سے مہیا کی گئی تھیں جن کا دوسری جاندار ہستیوں کے ساتھ انسان بھی محتاج تھا مشہور قرآنی آیت

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ — قطعاً وہ الدین یعنی آئینی زندگی، جو اللہ کے

(آل عمران) حضور سے ملا وہ "الاسلام" ہے

اس میں بھی قطعاً کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ پہلے آدمی کے جینے کا دستور خدا کے حضور سے کسی اور شکل میں ملا تھا اور اب بجائے اس کے کوئی نیا دین الاسلام کے نام سے لوگوں کو دیا جا رہا ہے بلکہ صاف اور واضح مطلب اس کا یہی ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے کہ "الاسلام" ہی وہ دین ہے جو خدا کے حضور سے عطا کیا گیا اور اسی دین کی پابندی کا مطالبہ ہر زمانے میں ان لوگوں سے کیا گیا جو انسان بن کر دنیا میں آئے۔

المسلم یا عام ہندی محاورے کے رد سے مسلمان آدم کی اولاد کے ان ہی افراد کا نام ہے جنہوں نے اپنے اسی موروثی، قدیم دین "الاسلام" کے پا لینے میں کامیابی حاصل کی ہے اسی طرح ہر وہ شخص جو اس زمین پر آدمی بن کر پیدا ہونے کے باوجود اس "قدرتی آئین" کے مطابق زندگی بسر کرنے سے بھڑک رہا ہے یقین ہے کہ درحقیقت اپنے آباء و اجداد کے صحیح دین اور دھرم سے وہ بھڑک رہا ہے، اور یہ عجیب بات ہے کہ بھڑکنے کی وجہ اپنے نزدیک یہی ٹھہراتے ہوتے ہے کہ اسلام کو قبول کر کے اپنے باپ دادوں کے قدیم دین یا دھرم سے وہ دور ہو جائے گا۔ یاللعجب[1]۔

آخر مصر ہی کے باشندوں کو دیکھئے ہزارہا سال کے پرانے وثائق کے جو چند فقرے آپ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں ان کا پڑھنے والا اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتا ہے

---

[1] خدا جانے سمجھنے والوں نے یہ کیسے سمجھ لیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ جن عیسائیوں نے اسلام قبول کر لیا کیا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے الگ ہو گئے یا مسلمان ہونے والے یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظمت و احترام کو دل سے نکال بیٹھے ہیں قرآن دنیا کے مذاہب اور مذاہب کے داعیوں سے بجائے تکذیب کے جب تصدیق کا تعلق رکھتا ہے تو اس قسم کے بے معنیٰ وسوسوں کو بجز نادانی اور نافہمی کے اور کیا سمجھا جائے۔ ۱۲

کہ مصر والے آج سے ہزارہا سال پیشتر بجنسہ ان ہی باتوں کو مانتے تھے جن کی قرآن تعلیم دے رہا ہے نہ صرف اصولی اور اساسی چیزیں جن کا مبدء اور معاد یا بالفاظ دیگر خدا اور آخرت، وحی، نیکی و بدی کے قوانین سے تعلق ہے بلکہ ایسی باتیں مثلاً مسکرات (نشہ پیدا کرنے والی چیزیں) آپ دیکھ رہے ہیں کہ مصر کے اہل علم وفضل اپنی قوم کو ان کے استعمال سے کیا ٹھیک اسی لب ولہجہ میں روک رہے تھے، جس طرز و انداز میں آج مسلمانوں کے مولوی اور صوفی یا علماء مشائخ ان کو منع کرتے ہیں عورتوں کے متعلق یورپ کی تہذیب جدید نے تو یہ پھیلانا شروع کیا ہے کہ پیدا ہی کی گئی ہیں وہ اس لئے کہ مرد کو جس حد تک ان کو گھورنے کا موقع مل سکتا ہو محرم اور غیر محرم کی تمیز کئے بغیر ان کو گھورتا ہی چلا جائے۔ انسانیت کی تکمیل ہی اس پر موقوف ہے کہ مردوں کا کوئی مجمع، ان کی کوئی مجلس وجود انسانی کے اس نازک ترین حصے کی جلوہ آرائیوں سے خالی نہ ہو، مگر مصر کے عہد قدیم میں مغرب کی تہذیب جدید کے اسی کامل انسان کو آپ دیکھ چکے کہ بجائے آدمی کے بھیڑ یا ٹھیرایا جاتا تھا۔

بہرحال بردی کے یہ کاغذات اتفاقاً مل گئے ہیں اور ان میں سے بھی صرف چند ضروری فقروں کا میں نے ترجمہ کیا ہے، ورنہ مصریوں کے قدیم دین کے سارے وثائق اگر مل جاتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کے جزئیات تک ان میں نہیں مل سکتے تھے بلکہ جو کچھ مل چکا ہے میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں بھی صراحتہً نہ سہی اشارۃً بہت سی چیزیں کم از کم مجھے ایسی دکھائی دیتی ہیں کہ نسل انسانی کے دین کی تازہ ترین قرآنی شکل میں اور مصر کے اس قدیم ترین دین میں فرق کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے میرا تو خیال ہے جن پچاس فقروں کا ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے اگر شروع ہی میں ان کے متعلق

یہ بتانہ دیا جاتا کہ مصر کے پرانے کھنڈروں سے پانچ چھ ہزار سال پیشتر کے جو کاغذات برآمد ہوئے ہیں ان ہی سے یہ فقرے نقل کئے گئے ہیں تو میں یقین کرتا ہوں کہ پڑھنے والے شاید یہی سمجھتے کہ شیخ سعدی یا ملا حسین واعظ کاشفی یا عطار و سنائی وغیرہ مسلمانوں کے بعض بزرگوں کی کتابوں سے یہ چیزیں نقل کی گئی ہیں اب امتحان لے کر دیکھئے یہ بتائے بغیر کہ ان کی اصل کیا ہے کسی کو سنائیے اور پوچھئے کہ یہ کس کا کلام ہو سکتا ہے؟ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ سننے کے ساتھ کہنے والے یہی کہیں گے مسلمانوں کے کسی عالم یا صوفی کے یہ اقوال ہیں یہی نہیں بلکہ عہد فراعنہ کی مصری تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے ہزارہا سال پیشتر تو ان کے دین کی وہی نوعیت تھی جس کا پتہ مذکورہ بالا فقروں کے مضامین سے چلتا ہے لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتے چلے گئے تو ایک طرف ان کا تعمیری ذوق، عام علوم و فنون میں انہماک بھی اسی نسبت سے بڑھتا چلا گیا طب اور ادویہ کی تحقیق میں اس حد تک وہ پہنچ گئے تھے کہ موت تو ان کے بس کی بات نہ تھی لیکن مرنے کے بعد سڑنے اور گلنے سے لاشوں کو بچا لینے میں وہ کامیاب ہو چکے تھے، پتھر، لکڑی اور مختلف قسم کی دھاتوں سے انسانوں اور حیوانوں کی مورتیوں کے تراشنے میں ان کی چابکدستیاں آج بھی دنیا کو ششدر بنائے ہوئے ہیں فوجی قوت میں ترقی کے اس نقطے تک پہنچ چکے تھے کہ اس زمانے میں دنیا کا جو قابل لحاظ حصہ تھا، اس کو وہ فتح کر چکے تھے، انطرن زکری نے لکھا ہے۔

”کشور کشائی میں ان کا دائرہ اس حد تک وسیع ہو چکا تھا کہ ایک طرف شام و لبنان میں ان کے جھنڈے لہرا رہے تھے اور دوسری طرف فرات کے مشرقی ساحل تک گھستے ہوئے چلے گئے، شمال میں فلسطین تک اور جنوب میں سوڈان تک ان کے مقبوضات

میں شریک ہو چکا تھا"
انطرن نے اسی کے بعد لکھا ہے

وَھذہ اشھر بلاد العالم التی کانت معروفۃ فی ذلک الزمان ص۲۳ اس زمانے میں یہی علاقے دنیا کے مشہور مقامات تھے۔

مگر جہاں یہ سب کچھ ہو رہا تھا وہی دوسری طرف بتدریج لڑھکتے لڑھکتے اور ڈھلکتے ہوئے مصر کے بھی باشندے آخر میں زندگی کے جس دینی قالب پر اصرار کرنے لگے اس کی تصویر انطرن ہی نے ان الفاظ میں کھینچی ہے یہ لکھنے کے بعد کہ

"فراعنہ کی حکومت کے آخری دور میں اس زمانے تک جب رومانیوں نے مصر کو اپنے امپائر میں شریک کر لیا تھا"

یہ حالت ہو گئی تھی کہ

"پرندوں اور مچھلیوں، سانپوں، مگرمچھوں، بلوں، بلیوں، کتوں اور مینڈھوں تک کو وہ پوج رہے تھے۔

وہی لکھتے ہیں کہ

"اپنے ان مقدس معبودوں کی تحنیط کرتے (یعنی جن دواؤں کی وجہ سے لاش نہیں سڑتی تھی ان ہی کو بھر کر ممی بناتے تھے) اور بڑے تزک و احتشام سے ان دیوتاؤں کو وہ دفن کرتے تھے" ص۱۵۲

(باقی آئندہ)

ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ

(از جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصفؔ دہلی)

(۲)

لوہارو لوہارو کی چھوٹی سی نیم مختار ریاست پنجاب کے گوشہ جنوب مشرق میں واقع ہے صاحب کمشنر دہلی اس کے پولٹیکل ایجنٹ ہیں لارڈ لیک نے نواب احمد بخش خاں کو ۱۸۰۶ء میں جو سند عطا کی تھی اس کی رو سے یہ ریاست بطور دوام نواب صاحب کے خاندان کو اس شرط پر عطا ہوئی کہ عندالطلب سرکار کو دو سو سوار دیں۔ ان کو اپنی رعایا پر دیوانی و فوجداری کے کامل اختیارات حاصل ہیں۔ مگر سزائے موت کے لئے صاحب کمشنر دہلی کا متفق ہونا ضروری ہے۔ اس ریاست کا رقبہ دو سو ۲۸۰ اسی میل مربع ہے۔ آبادی ۲۰ ہزار کے قریب ہے آمدنی تقریباً ۶۵ ہزار روپیہ سالانہ ہے یہ ریاست تھوڑی سی فوج بھی رکھتی ہے اس کی ایک حد پر بیکانیر اور جیپور کی ریاستیں ہیں اور دوسری سرحد پر جیند اور حصار ہیں۔ لوہارو کا قریبی اسٹیشن بھوانی ہے جو اس سے ۳۵ میل کے فاصلے پر ریواڑی فیروز پور لائن پر واقع ہے۔

اس ریاست کو ۲ عدد توپ کی اجازت ہے نواب[1] کی ذاتی سلامی ۹ ضرب توپ سے دی جاتی ہے[1]۔ نواب شمس الدین احمد خاں کے بعد ریاست لوہارو نواب امین الدین خاں کے سپرد کی گئی ۱۲۸۶ھ میں ان کا انتقال ہوا اور مہرولی میں درگاہ حضرت خواجہ

[1] ترجمہ پنجاب چیفس

قطب الدین بختیار کاکی کے قریب جو نواب علاء الدین کی ٹہر واڑ ہے جس کو اب صندل خانہ کہتے ہیں اس میں دفن کئے گئے (اسی جگہ اب استاد مرحوم حضرت سائل کا مزار ہے)

نواب امین الدین احمد خاں کے بعد ان کے صاحبزادے نواب علاء الدین احمد خاں علائی جانشین ہوئے ان کا انتقال ۱۸۸۴ء میں ہوا تو ان کے صاحبزادے نواب سر امیر الدین احمد خاں عرف فرخ مرزا جانشین ہوئے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے نواب اعز الدین احمد خاں عرف اعظم مرزا جانشین ہوئے۔ اور اب اعظم مرزا کے صاحبزادے نواب امین الدین احمد خاں ثانی موجودہ آخری زمانہ والئے لوہارو ہیں۔

۱۹۴۵ء کے چھپنے کی رو سے ریاست لوہارو کی آمدنی ساڑھے چار لاکھ روپے ہوتی ہے[1]۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ تو قومی حکومت نے ریاستوں کو توڑ کر بعض ریاستوں کو صوبوں میں شامل کر دیا اور بعض ریاستوں کی یونین بنادی۔ یہ ریاست بھی اسی ضمن میں ختم ہو گئی۔

نواب امین الدین احمد خاں اور ان کے فرزند نواب علاء الدین احمد خاں۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں اور ان کے فرزند نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب (جد حضرت سائل) سے مرزا غالب کے نہایت خوشگوار اور دوستانہ تعلقات تھے علاء الدین احمد خاں علائی تخلص کرتے تھے۔ ضیاء الدین احمد خاں اردو میں رخشاں اور فارسی میں نیر تخلص کرتے تھے یہ دونوں بھائی مرزا غالب کے شاگرد خاص تھے۔ مرزا غالب کے خطوط کا بیشتر حصہ ان حضرات کے ناموں سے بھرا ہوا ہے علائی کا ذکر ایک مردجہ شعر میں بھی موجود ہے

---

[1] تاریخ روساتے پنجاب[2] مولنا اطہر ہاپوڑی بروایت نواب جلال الدین احمد خاں بن نواب اعز الدین احمد خاں مرحوم والی لوہارو

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

نواب ضیاء الدین احمد خاں | مرزا غالب سے تلمذ رکھتے تھے اور ان کے خلیفۂ اول تھے۔ نواب صاحب موصوف کی شادی اپنی چچازاد بہن سے ہوئی تھی۔ جن کا نام تھا حاجی بیگم بنت قدرت اللہ بیگ فیروز بن شرف الدولہ قاسم جان۔ حاجی بیگم کا انتقال ۱۳۱۲ھ میں ہوا۔ مہرولی میں اسی صندل خانہ میں مدفون ہیں جہاں حضرت سائل اور نواب ضیاء الدین احمد خاں اور نواب امین الدین احمد خاں مدفون ہیں۔ نواب صاحب موصوف رؤسائے شاہجہان آباد میں نہایت ذی اقتدار اور بارسوخ اعلیٰ درجے کے سخن فہم سخن سنج اور تاریخی معلومات کا سرچشمہ مانے جاتے تھے۔ بڑے غیور اور پابند وضع رئیس تھے۔ قطع نظر کمال شاعری و انشاء پردازی کے تاریخ، جغرافیہ، علم انساب، علم اسماء رجال، تحقیق لغات اور جنرل انفورمیشن (معلومات عامہ) میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے اگرچہ انھوں نے فنون مذکورہ میں کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی لیکن اکثر مصنفین ان سے مدد لیتے تھے اور جو مشکل پیش آتی تھی اس میں ان سے مشورہ لیتے تھے خصوصاً ایلیٹ صاحب نے جو ہندوستان کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی ہے اس کی تالیف و ترتیب میں نواب ممدوح نے بے انتہا مدد پہنچائی تھی جس کا مصنف نے اپنی کتاب کے دیباچے میں خود اعتراف کیا ہے[1]۔

نواب صاحب کی عمر اس وقت ۷ برس کی تھی جبکہ ان کے والد نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہوا۔ والدہ ماجدہ اور برادر معظم نواب امین الدین احمد خاں کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔

تفسیر و حدیث مولوی کریم اللہ شاگرد حضرت شاہ عبد القادر رحمہ اللہ سے

---

[1] خمخانۂ جاوید و یادگار غالب

پڑھی۔ ادب و فقہ مفتی صدرالدین آزردہ شاگرد حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ سے اور منطق و فلسفہ مولانا فضل حق خیرآبادی سے پڑھا۔ فارسی میں مرزا غالب سے استفادہ کیا۔

افسوس کہ نواب صاحب کا مجموعۂ کلام ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں ضائع ہوگیا امن ہونے کے بعد کچھ پرانے پرچوں اور مسخ شدہ مسودات سے اور کچھ حافظے بہ زور دیکر قلمبند کیا گیا۔ جس کو "صحیفہ زرین" کے نام سے ان کے چھوٹے صاحبزادے نواب احمد سعید خاں مرحوم اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر و آنریری مجسٹریٹ دہلی نے ۱۹۱۶ء میں شائع کیا۔

حضرت مفتی صدرالدین صاحب آزردہ اور مولٰنا فضل حق خیرآبادی اور مرزا غالب اگرچہ نواب ضیاء الدین احمد خاں کے اساتذہ میں تھے مگر ان سے دوستانہ اور ہم جلیسی کے مراسم بھی تھے۔ مولوی فضل حق صاحب ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے فرو ہونے کے بعد بہ الزام بغاوت گرفتار کر کے رنگون بھیج دیئے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ نواب صاحب موصوف نے ان کی تاریخ وفات کہی "فضل حق مرد" (۱۲۷۹ھ) اور اسی سنہ میں رنگون میں بہادر شاہ کا انتقال ہوا نواب صاحب نے مادۂ تاریخ کہا "خلد خوابگاہی" (۱۲۷۹ھ)۔

"صحیفہ زرین" (یعنی مجموعہ کلام نیر رخشاں) پر جناب سائل نے بھی قطعہ تاریخ طباعت کہا ہے جو اس کے آخر میں شامل ہے

تقریباً ۱۸۶۰ء میں نواب صاحب موصوف نے دہلی کی آثار قدیمہ کی سوسائٹی میں ایک لکچر دیا تھا جس میں انھوں نے تاریخی واقعات سے یہ ثابت کیا تھا کہ قطب مینار مسلمانوں کا ہی بنایا ہوا ہے اور لکچر کے خاتمے پر کہا کہ اس سے زیادہ قوی ثبوت اور کوئی پیش

نہیں کیا جا سکتا کہ ان لوگوں کے مردے خود اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے کلام کی خود تصدیق کریں۔[1]

چونکہ نواب ممدوح اہل کمال ہونے کی وجہ سے اہل کمال کے عاشق تھے اور خصوصیت سے غالب سے ان کا خاص تعلق تھا۔ ان کی چچا زاد بہن امراؤ بیگم مرزا غالب سے منسوب تھیں وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ مگر زیادہ تر فارسی نظم و نثر لکھتے تھے۔ اور مرزا کے قدم بقدم چلتے تھے۔ مرزا نے جو ایک قصیدہ نہایت بلیغ و لطیف نواب ممدوح کی شان میں لکھا ہے اور جس میں ان کے استاد ہونے پر فخر کیا ہے اس کے کچھ اشعار مختلف مقامات سے التقاط کر کے یہاں لکھے جاتے ہیں :۔

صد آفتاب تواں ساختن بباز یچہ	ز ذرہ کہ بود در ضیائے نیّرِ من
نہ ایں سپہر نہ ایں مہر عالمے دگر است	من آسمانم و داد مہرِ نور گسترِ من
من آں سپہر کہ دائم چنانکہ مہر بماہ	بہ مہر نور دہد نیّرِ منورِ من
منم خزینہ راز او دُرِ خزینہ راز	ضیائے دین محمد کہین برادرِ من
بدین و دانش و دولت یگانہ آفاق	بعمر کہتر و از روئے رتبہ مہتر من
بمہر دل بہ برادر دھم نہ یعقوبم	کہ پور خویش بود دلستان و دلبرِ من
سخن سرائے نوائین نوائے را نازم	بنالہ ہم نفس من بہ شور ہم سر من
بہ نکتہ شیوۂ شاگرد من بہ من ماناست	صنم بصورت خود می تراشد آزر من
اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم	بود بہ پایہ ارسطوئے من سکندر من
زمین کوئے مرا آسمان کند ہر صبح	طلوع نیر روشن ز طرف منظر من
اگر شوم بہ مثل آتشے شرارہ فشاں	شود بقاعدۂ ہمدم سمندرِ من

[1] واقعات دار الحکومت جلد سوم صفحہ ۱۸۵

بہ بحر گر فتدم رہ، بود سفینۂ من	بہ تخت گر بودم رائے گردد افسر من
بہ مہر دوست دہم دل نشاط خاطر من	بہ کین خصم نہم رخ لوائے لشکر من
گرم ز عقدہ تبہ گشتہ کار مونس من	درم ز کار فرو ماندہ دست یاور من
ز بے زر روئے تو پیدا فروغ دانش و داد	بدیں فروغ جہاں تاب گشتہ اختر من
ز تو کہ آئینہ فیض صحبت اوئی	ہوائے دیدن غالب فتادہ در سر من
مرا ستودی و گفتی کہ من از آن توام	فدائے آن تو بادا اقل و اکثر من
سعادت و شرف چوں منے بود ز کمال	نہ بس بود کہ بود چوں توئے ثناگر من
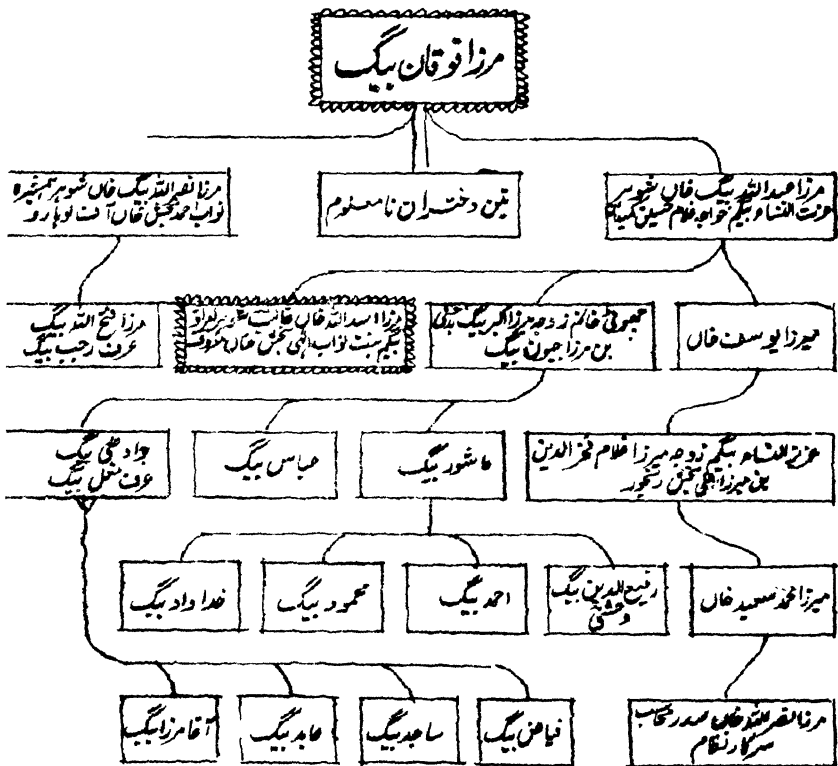
(از "یادگار غالب" و "غالب از مہر" وغیرہ)

نواب صاحب اور مرزا غالب کے تعلقات کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ غالب کی وفات کے بعد آٹھ سو روپیے کا قرضہ نواب موصوف نے ادا کیا غالب کا فارسی دیوان پہلی مرتبہ نولکشور پریس میں نواب صاحب موصوف کے اہتمام سے ۱۸۶۱ء میں چھپا اور اس کا مسودہ شہاب الدین احمد خاں ثاقب (والد محترم حضرت سائل) نے منشی نولکشور کو بھیجا تھا۔ مرزا غالب کا تمام مجموعۂ تصانیف نواب صاحب موصوف کے پاس جمع تھا اور انھوں نے اس کی عمدہ مطلا جلدیں بنوالی تھیں[۱] مرزا غالب کی ایک فارسی تصنیف جس کا نام "دستنبو" ہے اس میں مرزا صاحب نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے حالات لکھے ہیں مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ جب انگریزوں نے شہر کو فتح کر لیا تو عزت و ناموس کے خیال سے نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں اپنے اہل و عیال کو لے کر لوہارو کی طرف روانہ ہوئے مہرولی میں قیام کرتے ہوئے دوجانہ پہنچے وہاں کے رئیس حسن علیخاں بہادر نے ان کی بڑی مدارات کی۔ کمشنر دہلی نے دونوں کو واپس بلا لیا اور جواب طلب کیا،

[۱] یادگار غالب صفحہ ۹۳　[۲] غالب از مہر وغیرہ

صلح آمیز جواب پاکر کچھ تعرض نہ کیا اور قلعے میں قیام کی اجازت دی۔ دہلی میں ان کا مکان بالکل لٹ گیا تھا اور مہرولی کے قیام کے دوران میں بھی ان کا سامان خوب لٹا اور اسی میں مرزا غالب کا مجموعۂ تصانیف بھی ضائع ہو گیا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد بڑی محنت اور جستجو سے جو کچھ مل سکا دوبارہ جمع کیا گیا۔[۱]

اُستاد مرحوم (حضرت سائل) نے ایک واقعہ مجھ سے بیان کیا تھا عرصہ گذر جانے کی وجہ سے حافظہ پر زور دیکر لکھتا ہوں ایک مرتبہ اُستاد ذوق کابلی دروازہ کے قریب جہاں ان کا دولت خانہ تھا کسی جگہ پیشاب کرنے کے لیے بیٹھے اس اثناء میں ایک مصرع ذہن میں آگیا۔ پیشاب سے فارغ ہو کر استنجا سکھاتے ہوئے اور مصرع ثانی کی فکر کرتے ہوئے چل پڑے۔

اس قدر استغراق ہوا کہ چاندنی چوک، صدر بازار، سبزی منڈی ہوتے ہوئے اسی حال میں ملکدار خاں کے ترپولیہ تک پہنچ گئے اتفاق سے نواب ضیاء الدین احمد خاں اپنے باغ کی طرف سے اپنی بگھی میں شہر کی طرف آرہے تھے انھوں نے استاد ذوق کو سرِ شام اس جگہ دیکھ کر تعجب کیا، بگھی روک کر اُترے اور پکار کر کہا اُستاد آپ یہاں کہاں؟ اب استاد ذوق جاگے اور چاروں طرف دیکھنے لگے ڈھیلا پھینک کر کہنے لگے لاحول ولا قوہ کہاں آگیا؟ پھر فرمایا کہ کابلی میں پیشاب کرتے بیٹھا تھا ایک مصرع ذہن میں آگیا تھا اس پر مصرع ثانی کی فکر کر رہا تھا۔ بڑی خیر ہوئی کہ تم نے دیکھ لیا ورنہ میں جانے کہاں پہنچ جاتا نواب صاحب نے ان کو اپنی بگھی میں بٹھا کر گھر پہنچایا اور حضرت ظفر بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے حضور کے استاد کی جان بچائی ہے مجھے اس کا انعام مطلوب ہے پھر پورا واقعہ حضور سلطانی میں عرض کیا گیا کافی دیر تک دلچسپی

---

[۱] دستنبوئے غالب مطبوعہ لٹریری سوسائٹی پریس بریلی ۱۸۶۵ء

رہی۔ بادشاہ نے کئی بہنگیاں آموں کی اور کچھ خلعت وغیرہ نواب صاحب کو عطا فرمایا اور استاد کی جان بچنے کے شکریہ میں خیرات وغیرہ بھی کی نواب ضیاء الدین احمد خاں کا وہ باغ اب بھی موجود ہے اس کا نام "نور باغ" ہے یہ محلدار خاں سے تین میل کے فاصلے پر آزاد پور کے متصل ہے اس کے دروازے کے بائیں بازو پہ کتبہ لگا ہوا ہے (نور باغ ۱۲۵۹ھ) اب دلی کی آٹھویں بربادی میں نور باغ بھی نہ رہا رہے نام اللہ کا) نواب صاحب موصوف کے انتقال کے بعد اُن کی محل سرائے . . . . جو گلی قاسم جان میں ہے اور نور باغ معظم زمانی بیگم (عرف بگا بیگم) کے حصے میں آیا تھا ان کے بعد ان کی تین صاحبزادیوں جند بیگم، بند بیگم، مچھن بیگم اور ان کی اولاد میں منتقل ہوا۔ اب اس میں جند بیگم زوجہ تاباں مرحوم اور بند بیگم زوجہ نواب بشیر الدین احمد خاں کے صاحبزادے سام مرزا اور خسرو مرزا وغیرہ اور مچھن بیگم زوجہ کرنل زبیدا حمد کی اولاد اپنے حصے کے مطابق شریک ہیں نواب صاحب کی کوٹھی اور کتب خانہ اور نقد روپیہ اور کچھ جہرولی کی جائداد زمین وغیرہ نواب احمد سعید خاں کے حصے میں آئی تھی

نواب بشیر الدین احمد خاں

معز الدین احمد خاں
سام مرزا

ناصر الدین احمد خاں
خسرو مرزا

عالیہ سلطان بیگم زوجہ
سر عبد الصمد خاں رامپور

فخر سلطان بیگم زوجہ نواب
اعز الدین احمد اعظم مرزا

ظہیر الدین خاں
بابر مرزا

خدیجہ سلطان بیگم
زوجہ ثانی اعظم مرزا

ثریا سلطان بیگم
زوجہ محمد عامر عباسی

فرید الدین احمد خاں

سعید الدین
احمد خاں

سلیم الدین
احمد خاں

عماد الدین
احمد خاں
عرف مسعود مرزا

آمنہ سلطان
بیگم زوجہ
متوفیہ بابر مرزا

عالم ماہ سلطان
زوجہ خوانیہ محمد
حمید خاں ہز
پاکستان سیکرٹری

عابدہ سلطان
زوجہ نواب
زادہ محمد سلیم
سیکرٹری

شاہدہ
سلطان

یہ شجرہ نواب خسرو مرزا نے مجھے بتایا ہے

نواب شمس الدین احمد خاں کے بعد جب ریاست لوہارو نواب امین الدین احمد خاں کے قبضے میں آئی تو ان دونوں بھائیوں میں اختلاف شروع ہوا دس بارہ سال کے بعد اکتوبر ۱۸۴۲ء میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نے دعویٰ دائر کیا فیصلہ یہ ہوا کہ ریاست تقسیم نہیں کی جائے گی بلکہ حسب دستور روپیہ ملتا رہے گا پھر روپیہ کی مقدار کے متعلق اختلاف ہوا اس کے نتیجہ میں بارہ ہزار روپیہ سالانہ کے بجائے اٹھارہ ہزار روپیہ سالانہ کر دیا گیا۔[1]

نواب ضیاء الدین احمد خاں کے انتقال کے چار پانچ سال کے بعد ۱۸۸۸ء میں یہ الاؤنس گھٹا کر بارہ ہزار روپیہ سالانہ کر دیا گیا جو حصہ رسدی نواب سعید الدین احمد خاں اور اُن کے چار بھتیجوں اور نواب مرحوم کی چار بیگمات میں تقسیم ہوتا رہا۔

نواب صاحب کا انتقال ۱۳۰۲ھ م ۱۸۸۳ء میں ہوا مولوی رضی الدین احمد صاحب دہلوی نے قطعہ تاریخ کہا جو قبر پر کندہ ہے:۔

چوں ضیاء الدین احمد خاں کشید رخت از دنیا سوئے دارالسلام

گفت ہاتف یا رضی سالِ وفات روز شنبہ سیزدہ شہر صیام
۱۳۰۲ھ

اور مہر دلی میں اپنے بھائی نواب امین الدین احمد خاں کے پہلو میں دفن ہوئے۔ دلی کی آٹھویں بربادی میں آثار قدیمہ کو بہت بری طرح برباد کیا گیا۔ نواب امین الدین احمد خاں کا مزار تو

[1] تاریخ رؤسائے پنجاب

خیمہ بچ گیا مگر نواب ضیاء الدین احمد خاں کا مزار توڑ پھوڑ دیا گیا۔ کرنل زیڈ احمد (ذوالنور علی احمد) شوہر مھن بیگم کا مزار اور خوبصورت سنگ مرمر کا مجحر وغیرہ بالکل ندارد ہو گیا یعنی زمین پر مٹی کا ڈھیر بھی نہیں دکھائی دیتا۔ (رہے نام اللہ کا)

نواب صاحب موصوف رشتے میں داغ کے چچا ہیں جب داغ کا دیوان گلزار داغ چھپا تو انھوں نے نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا نواب صاحب نے تقریظ لکھی :-

نازم آں نخلبند معنی را — کہ بیاراست از سخن صد باغ
گل رنگین باغ دل افروز — در خوشبوئے عطر بیز دماغ
روح نازک خیالی او را — باید آسوئے عرش جست سراغ
معنی نغز از دلش ریزاں — چوں مئے ناب از کنار ایاغ
کردہ مشکیں غزال مضموں صید — صفحۂ خاطرش ختن را راغ
جمع کردہ کلام روشن خویش — کہ شبستان فکر راست چراغ
ہر گہ از طبع تازہ اش دل خواہ — للہ الحمد دست داد فراغ
سال ختمش بجواں کہ ایں دیواں — زد بدلہا جدید سکہ داغ[1]
ساخت ایں قطعہ نیر از دہلی — نزد نواب میرزا ابلاغ

نواب صاحب موصوف کے متعلق سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں جو کچھ لکھا ہے اور مرزا عبد الغنی ارشد گورگانی استاد جناب سائل ہے نے ایک مدحیہ قصیدے میں جو کچھ اظہار عقیدت کیا ہے اس سے ان کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے یہ خاصا

[1] صحیفۂ زریں صفحہ ۱۵۲

طویل قصیدہ ہے اس میں سے چند اشعار درج ذیل کرتا ہوں :-

ساقیا عید است و خرم شد زمانِ آفتاب آفتابے با یدم اندر میانِ آفتاب

ہاں بہ بزم میکشاں ساغر خرامی کار تست بر فلک بیں دورۂ رطل گرانِ آفتاب

موج موج آب گلگوں بر بساطِ من فگن تاز بیمش لرزہ افتد بر روانِ آفتاب

آفتاب ار میہمان صبح عید میکشاں است صبح عید میکشاں یہ میہمانِ آفتاب

دشتہا بر فرق بردارم ز جوشش نشۂ انگنم خاک خجالت در دہانِ آفتاب

چوں ازیں صہبا خمارم فرق بر بالا کشد مدحت ممدوح گویم از زبانِ آفتاب

مطلع روشن نجوانم در حضور منعمے آنکہ نورش بر فزاید عز و شانِ آفتاب

ایکہ رایت مظہر راز نہان آفتاب دیکھ رویت آفتاب اندر جہانِ آفتاب

اے ضیاء الدین احمد خاں بہادر نام تو آفتاب آسمان و آسمانِ آفتاب

تو ضیائی و ز ضیا مہر ست بالا در جہاں ذات پاکت کے تواں گفتن لبانِ آفتاب

ارزش از گوہر نکو باشد نہ از ارزش گہر
رفعت شانش فزوں تر از گمان آفتاب (صحیفۂ زریں)

نیّراں کے انتقال پر مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے جو انتہائی دردانگیز اور دل ہلا دینے والا مرثیہ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں نواب صاحب کی ذاتِ گرامی علم و فضل کے کس قدر بلند مقام پر تھی اور دنیائے ادب کو ان کے نہ ہونے سے کتنا عظیم نقصان برداشت کرنا پڑا۔

مرثیہ نواب ضیاء الدین خاں مرحوم دہلوی متخلص بہ نیّر (۲ اکتوبر ۱۸۸۵ء)

گرم ہنگامہ شو اے نالۂ دل ہاں برخیز از پئے برہمیِ عالم امکاں برخیز

اے جنوں باز بتاراج گریباں برخیز — تو ہم اے آہ جہاں سوز بساماں برخیز

چشم خونابہ فشاں خواست چو طوفاں کردن

خون شو اے دل کہ توانم سر و ساماں کردن

آسماں حلقۂ ماتم شدہ چوں است و چہ ہست — دو جہاں اینہمہ درہم شدہ چوں است و چہ ہست

اختراں دیدۂ پرنم شدہ چوں است و چہ ہست — مہر داغ دل عالم شدہ چوں است و چہ ہست

شاہد روز بمرگ کہ ؟ بماتم بنشست

از چہ ؟ لیلائے شب آشفتۂ دود ہم بنشست

ہمچناں زخم جگر ہست نمک سود ہنوز — تا چہ ہست ایں کہ دل از نالہ نیاسود ہنوز

آتشے ہست ہمانا کہ رود دود ہنوز — اشک از دیدہ برآید جگرآلود ہنوز

فاش گویم کہ سخن گوئے زماں روئے نہفت

تیرہ شد دہر کہ نیر ز جہاں روئے نہفت

آنکہ آراست ز نو زلف پریشان سخن — آں طراز سخن آں یوسف کنعان سخن

آنکہ لعل و گہر افشاند بدامان سخن — آنکہ صد پایہ فزود از سخنش شان سخن

دو سہ روز است کہ از جام اجل مدہوش است

عالمے زد سخن ماندہ و او خاموش است

شاعرے کز دم کلکش ہمہ جادو است سخن — آں گراں پایہ کہ دوں مرتبہ دست سخن

خواجہ او بود و تواں گفت کہ ہندو است سخن — فیض او بیں کہ بایں رنگ بایں بو است سخن

اینک از دست اجل جیب و جگرش چاک است

پایۂ فن بفلک بردہ و خود در خاک است

علم وفن را بجہاں داد گرے بود نماند　　نکتہ سنج سخن ودیدہ ورسے بود نماند

درجہاں نخل ہنر را ثمرے بود نماند　　نظم را فائدہ و بال و پرے بود نماند

اے سخن گریہ بروز سیاہت باید کرد

اے ہنر رحم بحال تبہ ات باید کرد

شبلیا دست نہ در دامن ادراک بزن　　شیشہ صبر دریں حادثہ بر خاک بزن

اے جنون جیب مگر بیان خرد چاک بزن　　تو ہم اے نالہ سراپردہ افلاک بزن

گر نہ خوں گشتہ بمژگان ترم می آئی

آخر اے دل بچہ کار دگرم مے آئی　　(کلیات شبلی فارسی)

نواب صاحب موصوف کے دو فرزند تھے اول نواب مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب دوم میرزا سعید الدین احمد خاں طالب (عرف نواب احمد سعید خاں) اور ایک صاحبزادی تھیں معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم جو مرزا باقر علی خاں کامل ابن عارف کو منسوب تھیں۔

نواب میرزا سعید الدین احمد خاں طالب | معروف بہ نواب احمد سعید خاں (دہلوی) ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے ۱۸۷۹ء میں سر رابرٹ ایجرٹن لفٹننٹ گورنر پنجاب نے آپ کو سرکاری ملازمت میں منتخب کیا۔ آٹھ سال تک اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہے ترک ملازمت کے بعد میونسپل کمشنر بھی ہو گئے تھے ابتداء میں چند غزلیں مرزا غالب کو دکھائیں ان کے انتقال کے بعد اپنے بھائی حضرت ثاقب سے اصلاح لینے لگے پھر اپنے والد کے ایما سے میر مہدی مجروح کو کلام دکھایا[1]۔ نہایت پابند وضع خوش رو خوش خو اور ذی علم بلند خیال شاعر تھے خمخانۂ جاوید پر جو آپ نے تقریظ لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لغات

[1] خمخانہ جاوید جلد پنجم

اور زبان کے بارے میں آپ کی معلومات بھی بہت وسیع درجہ رکھتی ہیں۔ ریاست ٹونک سے پانسو روپیہ ماہوار وظیفہ تھا[1]۔ یکم ستمبر ۱۹۲۵ء مطابق ۱۳۴۳ھ میں انتقال ہوا اور اپنے والد محترم نواب ضیاء الدین احمد خاں کے قریب مہرولی میں مدفون ہوئے

دہلی گلی قاسم جان میں احاطہ کالے صاحب کے قریب جو نواب احمد سعید خاں کی مسجد کہلاتی ہے یہ دراصل ان کے پردادا عارف جان کے بڑے بھائی نواب قاسم جان نے ۱۱۹۳ھ میں بنوائی تھی[2]۔

نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب | نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کے بڑے صاحبزادے تھے چھوٹی سی عمر میں اپنے ذاتی علم و فضل اور خوش اخلاقی کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر لی تھی اور آنریری مجسٹریٹی کے عہدے پر بھی فائز تھے۔ مرزا غالب انھیں بہت عزیز رکھتے تھے علمی استعداد بہت معقول تھی عین عالم شباب میں بعمر ۲۹ سال ۶ رمحرم الحرام ۱۲۸۶ھ یوم دوشنبہ مطابق ۹ راپریل ۱۸۶۹ء میں اپنے والد محترم کے سامنے ہی انتقال کیا اور وصیت کے مطابق درگاہ قدم شریف میں نواب شمس الدین احمد خاں کے پہلو میں دفن ہوئے[3] اس وقت استاد مرحوم حضرت سائل کی عمر ۵ سال کی تھی۔ اس لئے دادا کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی نواب مرزا شہاب الدین احمد خاں بہادر کی شادی سکندر جہاں بیگم کے ساتھ ہوئی تھی۔ مرزا غالب نے اس موقع پر سہرا کہا جس کے دو شعر غیر مطبوعہ کلام میں پائے جاتے ہیں:۔

ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدیں خاں — بزم شادی ہے فلک کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں سمجھو — ہے تو کشتی میں دلے بحر رواں ہے سہرا

۱؎ واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم ص۱۰۱ ۲؎ ایضاً ص۲۳۳ ۳؎ خمخانہ جاوید

سکندر جہاں بیگم یعنی سائل صاحب کی والدہ نواب شمس الدین احمد خاں کی نواسی اور نواب سعادت علی خاں کی صاحبزادی اور نواب قاسم علی خاں رئیس جادرہ کی بہن تھیں بعد میں یہ ریاست پاٹودی کے دیوان تھے۔ نواب صاحب کی دو بہنیں تھیں ایک سکندر جہاں اور دوسری اکبری بیگم۔ سکندر جہاں نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو اور اکبری بیگم نواب مختار حسین خاں والی پٹودی (المتوفی ۱۸۷۸ء) کو منسوب تھیں۔

اکبری بیگم کی بیٹی گوہر سلطان زمانی بیگم عرف ممو بیگم (یعنی سائل صاحب کی خالہ زاد بہن) تھیں جو سائل صاحب کو منسوب ہوئیں اور اکبری بیگم کے صاحبزادے یعنی نواب ممتاز حسین خاں بن نواب مختار حسین خاں کو نواب قاسم علی خاں کی صاحبزادی سردار جہاں بیگم منسوب ہوئیں یہ سائل صاحب کی ماموں زاد بہن ہیں۔

نواب عباس علی خاں اور سردار جہاں بیگم یہ دو اولادیں نواب قاسم علی خاں کی مجھے معلوم ہیں نواب عباس علی خاں جن کی جائداد عباس منزل کے نام سے اردو بازار میں تھی ان کے فرزند کاظم علی خاں آجکل امریکہ میں ہیں۔
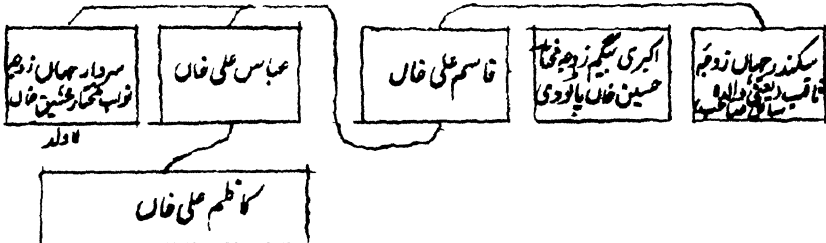
شب معراج

(از حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب)

" یہ تقریر سنہ رجب المرجب کی ستائیسویں شب کو ۱۰ بج کر ۵ منٹ پر آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی گئی تھی۔ جو آل انڈیا ریڈیو کے شکریہ کے ساتھ شریکِ اشاعت کی جارہی ہے"

" برہان "

مادی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اسباب و علل کے پابند ہوتے ہیں لیکن دنیائے روحانیات میں جو کچھ ہوتا ہے دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا فلسفی اُس کے اسباب و علل کو متعین کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا شب معراج کا واقعہ بھی ان ہی روحانی واقعات میں سے ایک ہے۔ معراج لفظ عروج سے بنا ہے جس کے معنیٰ ہیں رفعت اور بلندی۔

چونکہ اسی رات میں پیغمبر اسلام کو وہ بزرگی اور سربلندی حاصل ہوئی تھی جس کی نظیر روحانیات کی تاریخ میں بھی نہیں ملتی اور جس کی بدولت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی رات میں کعبۃ اللہ سے چل کر مسجدِ اقصیٰ اور وہاں سے روانہ ہوکر "ملاءِ اعلیٰ" کی سیر فرمائی تھی، اس لئے یہ رات شبِ معراج کہلاتی ہے اور قرآنِ عزیز نے اسی واقعہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی عظمت و جلالت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔!

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ		(خداوند قدوس کی) وہ (ذات) پاک ہے جو

لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ	شب کے وقت اپنے بندہ کو مسجد حرام
الْاَقْصَى الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ	سے مسجد اقصیٰ کی جانب لے گیا جس کے
مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ	ماحول (اور گرد و پیش) کو ہم نے بابرکت بنایا
(بنی اسرائیل پ ۱۵)	ہے، تاکہ ہم اُس (بندے) کو اپنی کچھ نشانیاں
	دکھائیں بیشک وہ (ذات خداوندی) سمیع و
	بصیر ہے۔

اسی مبارک رات میں سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کائنات علوی کے وہ مشاہدے فرمائے جن کا تذکرہ بخاری اور مسلم جیسی حدیث کی مستند کتابوں میں تفصیل کیسا تھ موجود ہے۔

پھر یہ عظیم المرتبت رات مذہب اور روحانیت کے نقطۂ نظر سے اس لئے بھی یکتا اور بے نظیر سمجھی جاتی ہے کہ اسی شب میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے محبوب ترین پیغمبر" حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کو نہ صرف وہ قرب روحانی اور شرف ہمکلامی ہی عطا فرمایا جس کو قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز کے ساتھ آیت فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى" میں بیان کیا ہے بلکہ اسی شب معراج میں اپنے اس جلیل القدر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے امت مسلمہ کو وہ راستہ بھی دکھایا جسے اختیار کرنے کے بعد عبد اور معبود کے درمیان حقیقی ربط و تعلق پیدا ہو سکتا ہے" اور سرگوشی اور بات چیت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ یہی وہ مبارک رات ہے جس میں پانچ وقت کی وہ نماز فرض ہوئی ہے جس کو اگر حقیقی روح کیسا تھ ادا کیا جائے تو وہ نہ صرف روحانی سکون اور اطمینان

خاطر پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے بلکہ انسان کو برائیوں اور بے حیائیوں سے بھی روکتی ہے
اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ نماز فحش اور بیہودہ باتوں سے روکتی ہے
یہی نماز اللہ اور بندے کے درمیان براہ راست وہ ربط اور تعلق پیدا کرتی ہے جس کو
حدیث صحیح میں الصلوٰۃ معراج المومنین کے الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے یعنی نماز مومنین
کی معراج ہے

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے شب معراج اُن یادگار دنوں میں سے نہیں ہے جن
کو مادی تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر کے مستقبل کے حوالے کیا ہے اس کے برعکس
اس رات میں روح کی پاکیزگی اور عالم روحانیت کی ناقابل پیمائش بلندیوں تک جسد و روح
انسانی کی پرواز کا ایک ایسا مظاہرہ پیش آیا جس نے تشکیل حیات، اخوت انسانی
اور مساواتِ اسلامی کے وہ درخشاں نقوش بطور یادگار چھوڑے جن کی شہادت ختم المرسلین
محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک ایک گوشہ سے ملتی ہے اور اگر انسان
آج بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھے تو اسلامی تعلیمات
آج بھی دنیا کے امن و اطمینان کی ضامن بن سکتی ہیں ۔ کاش دنیاء انسانیت اس
روشن، درخشاں، اور تابناک حقیقت کو چشم بصیرت سے مطالعہ کرے، اور محبت
اخوت، مساوات و عدل گستری کا سبق لے۔

قرآن حکیم کی سورۃ والنجم اور سورۃ بنی اسرائیل رہتی دنیا تک اس شب نور کی برکتوں
کو پیش کرتی اور ان پر شہادت دیتی رہیں گی بشرطیکہ دیکھنے اور سننے والا گوش حق نیوش
اور چشم حقیقت بیں رکھتا ہو۔

غرضیکہ تاریخ انسانیت میں شب معراج ایسی یادگار شب ہے جس میں حق و

صداقت کے پیغام کو مکہ کی وادیوں سے لے کر مدینہ منورہ کی فضاؤں تک پہنچا دیا گیا تھا یا بالفاظ دیگر وہ ہجرت جیسے پاک اور مقدس کردار و عمل کے لئے ایک تمہید اور مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہجرت سے قبل مکہ کی زندگی مسلمانوں کے لئے مصائب و آلام کے باعث شب تار کی حیثیت رکھتی تھی شب معراج اسی شب تار کے لئے نور کا تڑکا بن گئی۔ اور ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں دس سالہ دعوتِ حق اور پیغامِ صداقت نے دوستوں اور دشمنوں سے عقیدت و اعتراف کے جو تحفے حاصل کئے یہ سب کچھ اسی شب نور کا کرشمہ تھا۔ جس کے بعد دنیا نے تاریکی سے روشنی کی طرف قدم اُٹھایا۔ نفرت کی جگہ محبت نے لی نسلی و خاندانی تفوق و برتری کی حدیں ٹوٹ گئیں اور اُن کی جگہ ہمہ گیر انسانی محبت اور بھائی چارہ نے حاصل کر لی، ظلم و استبداد کے پرچم سرنگوں ہو گئے اور داد رسی وانصاف کا نشان بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا خاندانی عصبیت، نسلی پستی و بلندی اور سفید و سیاہ کے امتیازات سے یکسر منہ موڑ کر اخوۃ و مساوات کی قدرتی اور فطری منزل کی جانب گامزن نظر آنے لگی۔

حتّٰی کہ تاریخ مذاہب و روحانیات کا یہ حیرت زا واقعہ جب اسباب و علل کے تلاش کرنے والے مادہ پرستوں اور فلسفیوں کے سامنے اچنبھا بن کر آیا تو اُن کو بھی یہ اعتراف کئے بغیر چارہ نہ رہا کہ یہ سب کچھ مادی اور دنیاوی وسائل سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کی پشت پر کوئی ایسی روحانی طاقت موجود نہ ہو جس کو خواہ آنکھ نہ دیکھ سکے اور کان اس کی آواز نہ سن سکیں، لیکن واقعات اور مشاہدات انسان کو اس قوت کے وجود کا اقرار واعتراف کرنے پر مجبور کر دیں۔

یہ سب کیا تھا اور کیوں تھا؟ اس حقیقت کی تفصیل میں جائیے تو کہنا پڑتا ہے
کہ شب معراج کائنات روحانی کے لئے ایک ایسے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے جہاں
پہنچکر انسان نے ہجرت جیسے پاک اور مقدس مرحلہ کی جانب قدم بڑھایا یا پھر اُسے ایسا
متن کہنا چاہئے جس کی شرحِ ہجرت کی صورت میں نمودار ہوئی اور ہجرت ہی کے نتیجہ میں
کائناتِ انسانی کو، امن، خداپرستی، محبت واخوت عمومی، توحید الٰہی، دادرسی، غریبوں کی
اعانت اور گمراہ کن سرمایہ پرستی کی اہانت جیسے بلند اور زریں اصول اختیار کرنے اور اُن پر
کاربند ہونے کی دعوت دی گئی۔

اور یہ دعوتِ حق دنیا کے کانوں تک اُس وقت پہنچی جبکہ انسان اُس کے لئے
گوش برآواز تھا یا پھر یوں کہئے کہ اس وقت دنیا ایک ایسے موڑ پر کھڑی تھی جس کی ایک
جانب تاریکیوں کے وہ بادل تھے جن سے وہ دور بھاگ جانا چاہتی تھی اور دوسری طرف
وہ روشنی تھی جو چمک چمک کر اُسے صراط مستقیم کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

انسان نے اس اشارہ کو سمجھا اور روشنی کی طرف قدم بڑھا کر پستی سے بلندی
کی جانب گامزن ہوا۔ آج ! تعلیم کی کمی اور مذہبی احکام سے ناواقفیت کی بدولت ایک جانب
تو خود مسلمان اس شب نور کی عظمت وبرکات کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور دوسری جانب
اُن ہی کی غفلت کے نتیجہ میں غیر مسلم بھی اس مقدس رات کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا رہے
کاش ہم آج بھی اس حقیقت کو سمجھ سکیں اور زندگی کا ہر گوشہ ان احکام کی تعمیل
وتکمیل کے لیے وقف کر دیں جو اس صورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر
کی معرفت صادر فرمائے تھے اور اس طرح اپنے کردار وعمل میں وہ محاسن پیدا کر سکیں
جو خیر القرون کے مسلمانوں کا طرۂ امتیاز رہی ہیں۔

یقیناً ان ہی محاسن کا احیاء ہماری تمام مشکلات و مصائب کا صحیح علاج ثابت ہو سکتا ہے۔ اور ان ہی کی بدولت آج بھی مسلمانوں میں وہ جذب و کشش پیدا ہو سکتی ہے جس نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل مسلمانوں کو مرجع خاص و عام بنا دیا تھا۔ دنیا کے ہر گوشہ اور ہر قوم میں انھیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ایک سچے مسلمان کو دیکھ کر عالم انسانی اس حقیقت کو پکار اٹھتا تھا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم وہ بہترین جماعت ہو جو انسانوں کے نفع
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ	کے لئے پیدا کی گئی۔ بھلائی کا حکم کرتے ہو اور
الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو

بلاشبہ مسلمان عالم انسانی کی اصلاحِ اخلاق، رشد و ہدایت، خدمت گذاری اور دادرسی کے لیے پیدا کیا گیا تھا اور اس امت کے داعی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں یہ شرف اسی لئے عطا کیا گیا تھا اور کائنات علوی و سفلی کے مشاہدے اس لئے کرائے گئے تھے کہ آپ کا وجود مسعود ہر ملک اور ہر قوم کے لئے رحمت عالم ثابت ہو اور اس آفتاب رسالت کی نورانی کرنیں نسل و خاندان کے دائروں، عرب و عجم کی حدوں کو توڑ کر کرۂ ارض اور عالم انسانی پر پرتو فگن بن سکیں۔

گویا واقعات شب معراج تفسیر اور تشریح ہیں "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ" کی! پس سچے ایمان والے وہ ہو سکتے ہیں جو اپنے عمل اور کردار سے اس دعوت رحمت کو لبیک کہیں اور اسوۂ نبوی پر عمل پیرا ہو کر اس ہادی اعظم اور داعی حق کے ساتھ اپنی وابستگی واطاعت گذاری کا عملی ثبوت پیش کر سکیں۔

خدا تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔
وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

ادبیات

"فطرت کے ساتھ"

(شمس نوید)

حسیں خلوت سی خلوت ہے
مرے ہمراہ فطرت ہے

دھندلکا شام کا خاموش گرد و پیش پر طاری — یہ لہراتی ہوئی پگڈنڈیاں کھیتوں کے سینہ پر
افق پر وہ غروب مہر کے آثار دھندلے سے — شفق کی سرخیاں لرزاں فضائے آبگینہ پر

یہ دریا اور یہ انگڑائیاں موجوں کی دریا پر — یہ اڑتے طائروں کا چلتا پھرتا عکس پانی پر
کھڑی ہے دور اک کشتی مگر ملاح کشتی کا — بہا جاتا ہے خود اپنے ہی نغموں کی روانی میں

بڑی رنگین فرصت ہے!
مرے ہمراہ فطرت ہے

شب صحرا میں یہ اسرار سے بھرپور اندھیارے — اندھیروں پر سفر کرتا ہوا جھرمٹ ستاروں کا
فضا ڈوبی ہوئی ہے ایک روحانی تصور میں — ہوائی سنسنی میں ہے ترنم آبشاروں کا

مجھے کتنی مسرت ہے!!
مرے ہمراہ فطرت ہے

نکھرتا جا رہا ہے ہر طرف کرنوں کا شیرازہ — ابھرتے چاند سے روشن ہے کہساروں کی پیشانی

یہ بہتی چاندنی کھیتوں صحراؤں میں وادی میں تلاطم خیز سی ہے نور پاکیزہ کی طغیانی

یہ دنیا ہے کہ جنت ہے؟

مرے ہمراہ فطرت ہے

یہ میرے شوق کا عالم ہے گہرا راز سربستہ یقیناً ہے مرے جذبات کا مرکز یہیں کوئی

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری روح نے شاید اسی وادی میں دیکھا تھا کبھی خواب حسیں کوئی!

کشش ہے جاذبیت ہے

مرے ہمراہ فطرت ہے

تبصرے

رضیہ سلطانہ التمش | از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی تقطیع خورد ضخامت ۵۴ صفحات قیمت ۸ر پتہ:- مکتبۂ ادب اردو بازار دھلی

یہ کتابچہ کہنے کو رضیہ سلطانہ کی سوانح حیات میں ہے لیکن دراصل نصف سے زائد ضخامت میں رضیہ کے باپ سلطان شمس الدین التمشؒ کے حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں پھر رضیہ کے جو حالات لکھے گئے ہیں وہ ناقص اور ناتمام ہیں رضیہ سلطانؒ اور یاقوت حبشی کے تعلق پر جدید تحقیقات کی روشنی میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور بعض محققین اس سے قبل بہت کچھ اردو میں لکھ بھی چکے ہیں، تاہم ایک معمولی اردو خواں کے لئے یہ کتابچہ مفید ہوگا اور اس میں اس کو کام کی باتیں ملیں گی!!

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسنِ خاص: جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہینگی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہینگے۔

۲۔ محسنین: جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہونگے، ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین: جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائینگے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائیگا۔

۴۔ احبا: نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبا میں ہوگا ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لیے ہے۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے ۲؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰؍

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

بُرہان

جلد بست وسوم شمارہ (۲)

اگست ۱۹۴۹ء مطابق شوال المکرم ۱۳۶۸ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج کل "وقت کا ایک اہم سوال" کے عنوان سے بعض اخبارات و رسائل میں ایک سوال کا چرچا ہو رہا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "مسلمان آج کل ذلیل و خوار کیوں ہیں؟ حالانکہ قرآن مجید میں ان کے لئے دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبود کا وعدہ ہے" اس سوال کو وقت کا ایک اہم سوال کہا گیا ہے جس پر ارباب قلم اپنی قوت خامہ فرسائی و زود نویسی و بسیار نویسی کا مظاہرہ کر رہے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ سوال انتہائی تعجب انگیز بھی ہے اور حد درجہ افسوسناک و شرمناک بھی!

تعجب انگیز اس لئے کہ مسلمانوں پر جو مصائب و آفات نازل ہوئے ہیں اور اب وہ جس شکنجۂ بیم و رجا میں کس کر رکھ دیئے گئے ہیں ان کی درد انگیزی و ہیبت ناکی کا تقاضا تھا کہ ان کی آنکھ کھل جاتی اور انھیں معلوم ہو جاتا کہ وہ کیا اسباب ہیں جن کے باعث آج ان کو یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے لیکن اگر ان کو اب بھی ان اسباب کا احساس نہیں ہوا جیسا کہ یہ "اہم سوال" پیش کرنے سے معلوم ہوتا ہے تو ان کی اس بے حسی و بے خبری کا ماتم جتنا بھی کیا جائے کم ہے۔ گویا ان کی مثال اس بدنصیب انسان کی ہے جو زہر کی پھنکی مارنے کے بعد سکرات موت سے دو چار ہے ہاتھ پاؤں سے دم کھنچ کھنچ کر سینہ کی طرف آ رہا ہے نبض چھوٹ گئی ہے سانس اکھڑ چکا ہے اور زندگی کے در و دیوار پر موت کا بھیانک سایہ دراز ہوتا جا رہا ہے اور اس کے باوجود اس شخص کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اسے موت کیوں آ رہی ہے؟ اور وہ سوچتا ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں تو بڑے مضبوط تھے۔ اور اس کی تندرستی پر تو لوگوں کو رشک آتا تھا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ اسے یک بیک موت نے آ دبوچا ہے۔

ایک انسان اگر زہر کو زہر سمجھ کر کھاتا ہے اور اس کے بعد اس پر موت کے آثار طاری ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو اسے ذرا شک ہوتا ہی نہیں اور وہ اعضاء کی تشنجی کیفیت محسوس کرتے ہی یقین کر لیتا ہے کہ زہر نے اپنا کام شروع کر دیا ہے لیکن اگر اس نے زہر کو دوا یا کسی چیز کے دھوکہ میں کھا لیا ہے تب بھی جب اس چیز کے کھاتے ہی اس پر آثار مرگ طاری ہونے شروع ہو جاتے ہیں تو اب اس کو یہ خیال خود پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوا کے یا کسی اور چیز کے دھوکہ میں زہر کھا گیا ہے پھر اس کا یہ خیال یقین سے بدل جاتا ہے جب ایک دو ڈاکٹر بھی اس کی تصدیق کر دیتے ہیں کہ واقعی ایک نہایت مہلک قسم کا زہر کھا گیا ہے پس آپ اس بدنصیب کو کیا کہیں گے جس کی صورت حال یہ ہو کہ جب وہ زہر کو کسی عمدہ اور مفید چیز کے دھوکہ میں کھا رہا تھا اس وقت ایک دو نہیں بیسیوں تجربہ کار ڈاکٹروں نے، سینکڑوں مخلص اور خیر خواہ دوستوں نے اور جان نثار عزیزوں اور رشتہ داروں نے پکار پکار کر اور چیخ چیخ کر خبردار کیا کہ اس نے جو شیشی اٹھائی ہے وہ دوا کی نہیں زہر کی شیشی ہے اور اس کے استعمال سے اس کا مرض دور نہیں ہوگا بلکہ وہ اور موت کی گود میں جا پڑے گا۔ لیکن اس بدقسمت نے کسی کی ایک نہیں سنی۔ اس نے سب کی تغلیط کی۔ سب کو احمق اور بیوقوف کہا۔ اور صرف اس قدر ہی نہیں بلکہ ان سب کو اپنا بدخواہ اور دشمن بھی بتایا اور سب کے منع کرنے کے باوجود زہر کو پی ہی گیا۔ اب اس کے بعد ان تیمارداروں کے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ کوئی پوچھے تو اس "مرحوم" کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیں کہ

"جان دے دی لاکھ سمجھاتے رہے"

تعجب انگیز ہونے کے علاوہ یہ سوال صد درجہ افسوسناک بھی ہے اور شرمناک بھی اور یہ اس لئے کہ ان مصائب و آفات کے بعد بھی اگر مسلمانوں کو اپنی بدعملیوں اور احکام خداوندی کی نافرمانیوں

پر تنبہ نہیں ہوتا اور اس بنا پر وہ بجائے منفعل، نادم اور خدا کے حضور میں شرمسار و تائب ہونے کے ابھی یہ ہی پوچھ رہے ہیں کہ یہ مصائب کیوں آئے۔ اور اُن کی حالت یہ کس لئے ہوگئی تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ گویا قدرت کو ظالم بتا رہے ہیں اور بالواسطہ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ قدرت کو مسلمانوں سے ہی کوئی خاص عناد ہے۔ کہ جب کبھی ہندوستان میں کوئی انقلاب رونما ہوتا ہے۔ خواہ وہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہو یا ۱۹۴۷ء کا بہر حال اس کا نتیجہ غیر مسلموں کے حق میں بہتر ہوتا ہے اور مسلمانوں کے حق میں بُرا۔ غیر مسلموں کی بن آتی ہے اور مسلمانوں کی بنی بنائی بگڑ جاتی ہے آپ پر اگر کوئی مصیبت آئی ہے تو اب آپ کے لئے صرف دو ہی راہیں ہیں ایک تو یہ کہ کھلے اور صاف لفظوں میں اس کا اقرار کیجئے کہ یہ مصیبت آپ کے اپنے ہاتھوں آئی ہے اور اس کی پوری ذمہ داری آپ کے سر ہے اور اگر آپ اس اقرار کے لئے آمادہ نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس مصیبت اور آفت کے مستحق نہیں تھے لیکن اس کے باوجود قدرت نے آپ کو اس میں مبتلا کر دیا تو گویا قدرت ظالم ہوئی ستمگر اور بے انصاف ہوئی ظاہر ہے کہ قدرت کو ایسا ناپاک الزام دینا مسلمان تو مسلمان کسی ادنیٰ درجہ کے انسان کا بھی کام نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں دونوں باتیں بالکل صاف صاف ہیں ایک یہ کہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا" (چہ جائیکہ وہ اپنے نام لیواؤں اور اپنے حبیب کے غلاموں پر ظلم کرے) اور دوسری یہ کہ جو جیسا کرتا ہے (وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم) ویسا پاتا ہے اور نیز یہ کہ تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں آتی ہے"

کہا جاتا ہے ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو مارا۔ لوٹا۔ برباد کیا اور اب بھی مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں وہ انھیں لوگوں کی وجہ سے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں پر ان ظالموں کو مسلط کس نے کیا؟ وہ کون ہے جس نے ان کو قوی بنا دیا اور مسلمانوں کو اس درجہ کمزور کہ وہ اپنی عزت و آبرو اور جان و مال کی طرف سے مدافعت بھی نہیں کر سکے؟ اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہے

کہ قدرت نے ایسا کیا؟ اور مشیت خداوندی نے ایسا ہی چاہا؟ اب سوال یہ ہے کہ قدرت نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا لا محالہ جواب یہ ہے کہ مسلمان اپنے اعمال و افعال اور اپنے فکر و نظر کے اعتبار سے یُذِیقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ اس سزا کا مستحق تھا اور عدلِ ایزدی کا یہ ہی تقاضا تھا اور اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر وہ ہی قدرت پر بے انصافی کا الزام عائد ہوتا ہے اور قدرت ان تمام چیزوں سے بلند و بالا اور ماوراء ہے

دیکھئے! حضرت موسیٰ نے قارون اور اس کے ساتھیوں کو ہزار سمجھایا کہ اللہ کی زمین پر گھمنڈ نہ کرو اور خدا کے سوا کسی غیر کا سہارا مت پکڑو مگر جب وہ نہیں مانا تو آخر کار خدا نے قارون اور اس کے ہمراہیوں کو مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا کر کے ختم کر دیا قرآن میں اس واقعہ کا بیان اس طرح ہے۔

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ فَمِنْهُمْ مَنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُمْ مَنْ أَغْرَقْنَا

بے شبہ موسیٰ ان لوگوں کے پاس کھلی کھلی باتیں لیکر پہنچے لیکن انھوں نے دنیا میں گھمنڈ کیا۔ حالانکہ وہ بڑائی میں خدا سے آگے نکل جانے والے نہیں تھے پس نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان سب کو ان کے اپنے اپنے گناہ کی پاداش میں دھر پکڑا۔ چنانچہ کسی پر پتھراؤ کیا کسی کو سامعہ پاش چیخ نے پکڑ لیا کسی کو زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔

عذاب کی ان مختلف قسموں کے ذکر کے بعد ارشاد ہے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ

اور اللہ کو کیا پڑی تھی کہ وہ ان پر ظلم کرتا ملکہ ان لوگوں نے تو خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔

بعض لوگ اس خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ ہوا وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لئے ایک ابتلا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں نے اس پر صبر کیا تو آخرت میں ان کے مدارج و مراتب زیادہ ہونگے اور ان کی نیکیوں میں اضافہ کر دیا جائیگا خوب یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کا خیال سرتاسر شیطان کا دھوکہ اور نفس کا فریب ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کو نہ تباہی و بربادی کے ان اسباب سے توبہ کی توفیق ہو اور نہ آئندہ کے لئے انھیں اپنی حالت سدھارنے اور اس کی اصلاح کرنے کی جانب توجہ ہو۔

جو شخص اسلامی تعلیمات اور اُن کی روح سے واقف ہے اسے ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں تامل نہیں ہو سکتا کہ یہ جو کچھ ہوا اور موجودہ حالت یہ دونوں اللہ کی طرف سے مسلمانوں پر ایک نہایت شدید قسم کا عذاب ہے۔ ابتلا یا آزمائش ہرگز نہیں ہے۔

ابتلا اور عذاب ان دونوں کی ظاہری شکل میں اگرچہ یک گونہ مشابہت ہوتی ہے لیکن در حقیقت دونوں میں بنیادی اعتبار سے بڑا فرق ہے۔ ابتلا میں انسان کو واقعہ کے اسباب و علل پر اختیار نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہوتا ہے اچانک ہوتا ہے اور بالکل غیر اختیاری طور پر ہوتا ہے شخص مبتلیٰ بہ کو ان اسباب کی تخلیق و تعمیر میں دخل نہیں ہوتا اس کے برخلاف عذاب کی صورت یہ ہوتی ہے کہ عذاب میں گرفتار ہونے والا خود ان اسباب کو پیدا کرتا ہے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس کو اسباب کی اس نوعیت خاص کا علم بھی تھا۔ یا نہیں مثلاً اگر ایک شخص قاعدہ میں چلتا چلتا اچانک پھسل پڑے اور اس سے چوٹ لگ جائے تو یہ ابتلاء ہے اور اگر ایک شخص گیلی اور پھسلواں زمین پر بے تحاشا دوڑا جا رہا ہے اور وہ دوڑتے دوڑتے گر جائے اور ہاتھ پاؤں کو زخمی کرلے تو یہ ابتلا نہیں عذاب ہے، آزمائش نہیں سزا ہے۔ ایک اور مثال یہ ہے کہ ایک شخص اگر ناکردہ گناہ چوری کے الزام میں پکڑ لیا جائے یا کسی حق بات کا

مجاہدانہ اعلان کرنے کی پاداش میں قید خانہ میں بند کردیا جائے تو یہ ابتلا ہے اور اگر اس کے برعکس چوری کرتا ہوا گرفتار ہو جائے اور قید میں ڈال دیا جائے تو یہ عذاب کہلائے گا۔ قرآن مجید میں بنی اسرائیل کا جو واقعہ نقل کیا گیا ہے اس سے یکجائی طور پر ابتلا اور عذاب دونوں کا فرق بیّن طور پر معلوم ہوتا ہے اور ساتھ ہی یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ابتلا کی صورت میں قرآن، صبر۔ توکل اور تسلیم و رضا کا مطالبہ کرتا ہے اور عذاب کی صورت میں توبہ۔ اپنے کئے پر ندامت اور پشیمانی اور انابت الی اللہ کا

چنانچہ غور کرو کہ جب فرعون اور ہامان نے حضرت موسیٰ کے ساتھ ربوبیتِ حق کے متعلق گفتگو میں شکست کھائی اور اس نے بنو اسرائیل کے متعلق ان کو ہر قسم کی ایذا رسانی کا فیصلہ کرلیا تو چونکہ بنی اسرائیل کا ان مصائب اور شدائد میں گرفتار ہو جانا محض حضرت موسیٰ کی پیروی اور کلمۂ حق کی پذیرائی کی وجہ سے تھا اور اس بناء پر یہ عذاب نہیں بلکہ ابتلا تھا اس لئے حضرت موسیٰ نے ان لوگوں کو صبر کی اور اللہ سے مدد مانگنے کی ہدایت کی۔

قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِہِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ (اعراف)	موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم اللہ سے مدد مانگو اور صبر سے کام لو بلاشبہ زمین اللہ کی ملک ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام بہرحال پرہیزگاروں کا ہی اچھا ہوتا ہے۔

لیکن جب انھیں لوگوں کی سرکشی۔ نافرمانی اور احکامِ خداوندی سے بے پروائی حد سے متجاوز ہو گئی یہاں تک کہ وہ گوسالہ پرستی بھی کرنے لگے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کیا چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُھُمْ	بے شبہ وہ لوگ جنھوں نے بچھڑہ کو اپنا پوجا

غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ

کے لئے اختیار کرلیا ان پر اللہ کا غضب عنقریب پہنچے گا اور وہ دنیوی زندگی میں ذلیل بھی ہوں گے اور ہم اللہ پر بہتان باندھنے والوں کو اسی طرح ان کے عمل کا بدلہ دیتے ہیں

مسلمانوں کا نظم مملکت اردو

"ایک مفید اور شاندار کتاب"

مسلمانوں کا نظم حکومت و مملکت تاریخ کا عد درجہ اہم اور معرکہ خیز موضوع ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس مہتم بالشان عنوان پر اب تک کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی تھی، جس کا قالب وقت کے تقاضوں کے مطابق ہو، مصر کے مشہور فاضل اور علوم قدیمہ و جدیدہ کے ماہر ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور حق یہ ہے کہ تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ موصوف کی تالیف "النظم الاسلامیہ" ترتیب کی خوبی، انداز بیان کی دلپذیری اور اختصار و جامعیت کے لحاظ کے بے مثل ہے۔ مسلمانوں کا نظم مملکت اسی کتاب کا نہایت کامیاب ترجمہ ہے جس میں اصل کی تمام خوبیاں اور خصوصیتوں کو اسی شان سے قایم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، مقدمہ کے علاوہ کتاب کو پانچ بابوں پر تقسیم کیا گیا ہے، پہلا باب سیاسی نظام، دوسرا باب نظام حکومت، تیسرا باب نظام مالیات، چوتھا باب نظام عدالت، پانچواں باب غلامی، اس کتاب کے مطالعہ سے مسلمانوں کے نظم مملکت کی صاف ستھری اور محققانہ تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ صفحات ۴۸۰ بڑی تقطیع للعہ روپے مجلد صہ روپے۔

مینجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر

{از جناب مولوی غلام ربانی صاحب ایم-اے (عثمانیہ)}

(۳)

آخر اس وقت رقاع[۱] سے جیسے کام لیا جاتا تھا ابتدائی کتابت کے وقت بھی کیا یہی رقاع نہیں مل سکتا تھا حیرت ہوتی ہے کہ قرآن ہی میں لوگ یہود کے متعلق

کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا — ان کی مثال اس گدھے کی ہے جو کتابیں لادے ہو

اور ان جیسی دوسری آیتیں پڑھتے ہیں اور اسی کے ساتھ یہ بھی باور کئے جاتے ہیں کہ عرب کتابی ساز و سامان سے بالکل خالی تھا یہودیوں کو تو لکھنے کے لئے اتنا سامان مل سکتا تھا کہ گدھے بن کر اس کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد سکتے تھے لیکن پیغمبر کو قرآن کے چند اوراق کے لئے وہی چیزیں نہیں مل سکتی تھیں جن پر یار خر کے برابر یہ کتابیں لکھا کرتے تھے۔ مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ ۞

---

[۱] لغت کی کتاب مجمع البحار میں "رقاع" کی تحقیق کرتے ہوئے ایک دوسری حدیث بھی نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن لوگ آئیں گے وعلی رقبتہ رقاع تخفق پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے اراد بالرقاع ما علیہ من الحقوق المکتوبۃ فی الرقاع جس کا مطلب یہی ہوا کہ دین اور قرض وغیرہ جیسے مطالبات ادا کئے بغیر جو مریں گے قیامت کے دن ان مطالبات کے وثائق کو اپنی اپنی گردنوں میں باندھے نمودار ہوں گے اور مطالبات کے یہ وثائق رقاع میں لکھے ہوں گے، جس سے معلوم ہوا کہ رقاع کا یہ لفظ جو رقعہ کی جمع ہے اس کے متعلق یہ بات کہ وثائق اس پر لکھے جاتے تھے عرب کا عام دستور تھا گویا کاغذ کے لفظ کا جو حال اس وقت اردو میں ہے بلکہ "رقعہ" کا لفظ اردو میں بھی تو آج تک لکھی ہوئی تحریروں کے لئے بولا جاتا ہے دیکھو مجمع البحار ص۲۷ ج۱

واقعہ یہ ہے کہ عرب کی ایامِ جاہلیت کی تاریخ سے جو واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس ملک کے شمال و جنوب میں کتب خانوں کے مختلف مراکز پائے جاتے تھے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے بہرحال ان تاریخی روایات کی روشنی میں قرآن کے اجمالی بیان کی یہ تشریح پیدا ہوتی ہے کہ قرآن کی ہر آیت کو ایک تو اس وقت لکھ لیا جاتا تھا جس وقت وہ نازل ہوتی تھی پھر ہر ہر سورہ مرتب ہونے کے بعد جس حد تک پہنچ جاتی تھی رسول اللہ صلعم اپنے صحابیوں کو لکھوا دیتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر قرآن کے لکھنے کے جس کام کا ذکر مستدرک حاکم والی روایت میں کیا گیا ہے اس میں کتابت قرآن کی اسی دوسری منزل کا پتہ ان الفاظ میں جو دیا گیا ہے کہ وہ ہم تالیف کرتے تھے" صحابہ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف سورتوں میں جدید اضافے وحی کے ذریعہ جو ہوتے رہتے تھے ان اضافوں کو متعلقہ سورتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ کے سامنے بیٹھ کر جوڑتے تھے، اور یوں تدریجاً قرآن کی ان سورتوں کے وہ نسخے جو صحابہ کے پاس جمع ہوتے چلے جاتے تھے مکمل ہوتے رہے[1]۔

---

[1] مستدرک حاکم کی مذکورہ بالا روایت یعنی صحابی کا بیان کُنا جلوسا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن فی الرقاع (ہم لوگ رسول اللہ کے ارد گرد بیٹھ کر قرآن کو رقاع میں تالیف کرتے تھے) خود اسی میں تالیف کرنے کا جو ذکر ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نقل نہیں کرتے تھے بلکہ جن جن سورتوں کی متعلقہ آیتیں اس وقت تک نازل ہو چکی ہوتیں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کی سورتوں کے ان مقامات پر ترتیب دے کر لکھا کرتے تھے جہاں پر ان کو ہونا چاہئے تھا۔ . . . . بیہقی نے بھی تالیف کا مطلب یہی لیا ہے لکھا ہے کہ المراد تالیف ما نزل من الآیات المفرقة فی سورھا وجمعھا (حاشیہ بخاری ج۲ مطبوعہ ہند) جس کا حاصل وہی ہے جو میں نے عرض کیا اس کثرت سے صحابیوں نے براہ راست قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا تھا کہ عہد عثمانی میں جب حکومت کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ جس جس کے پاس پورا قرآن یا اس کی سورتیں ہوں ان کو لے کر حاضر ہوں تو بیان کیا جاتا ہے کہ لوگوں نے لا لا کر جمع کرنا شروع کیا کان الرجل یجیئ بالورقة والادیم فیه القرآن (یعنی [illegible] قرآن کے ساتھ حاضر ہوتے) اسی میں یہ بھی ہے کہ حتی جمع من

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

پس یہی نہیں کہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر صحابہ صرف زبانی ہی یاد کرتے تھے، بلکہ جو لکھنا جانتے تھے وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر جیسے جیسے سورتیں مکمل ہوتی چلی جاتی تھیں ان کی نقل بھی لیتے چلے جاتے تھے اور آنحضرت کے منشاء کے مطابق ان کو مرتب کرتے جاتے تھے اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے جس وقت تشریف لے گئے تو صحابہ کے سینوں میں بھی، اور ان کے سفینوں میں بھی قرآن محفوظ تھا سینوں کی حفاظت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ عہد نبوت ہی میں بیر معونہ کا واقعہ پیش آیا تو جیسا کہ بخاری میں ہے شہید ہونے والوں کی تعداد ستر کے قریب تھی دھوکہ دے کر کفار نے ان کو قتل کر دیا تھا اور یہ سارے کے سارے قراء یعنی حافظ قرآن تھے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے کل ایک سال بعد عرب کی ایک مقامی یورش کو دبانے کے لئے عہد صدیقی میں یمامہ (نجد) فوجی دستہ بھیجا گیا تھا لیکن اتفاقاً کثیر تعداد شہید ہو گئی، اس میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کے حفاظ کی تعداد جیسا کہ بخاری کے حاشیہ میں ہے۔

کان عدتہ من القراء سبعمائۃ — قرآن کے حفاظ اس جنگ میں جتنے شہید ہوئے تھے ان کی تعداد سات سو تھی۔ ص ۵۷۵ ج ۲

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ذلک کثرۃ (یعنی بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ بہر حال کہنے کی بات یہ ہے جب یہ سارا ذخیرہ جمع ہو گیا تب حضرت عثمانؓ تشریف لائے روایت میں ہے

فدعاھم رجلا رجلا فناشدھم لسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو املہ علیک فیقول نعم۔ کنز العمال ج ۲ ص ۳۶۱

ایک ایک آدمی (یعنی صحابی) کو بلاتے اور قسم دے دے کر فرماتے کہ واقعی تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سن کر لکھا ہے صحابی کہتے کہ ہاں

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں قرآنی سورتوں کی ایسی نقلیں کتنی کثرت سے صحابہ میں پھیل چکی تھیں جو خود رسول اللہ کی لکھوائی ہوئی تھیں ۱۲ مناظر احسن گیلانی

لہ اس تعداد پر تعجب نہ کرنا چاہئے عام

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ایک معمولی مقامی مہم میں شہید ہونے والوں کے اندر خیال تو کیجئے کہ جب سات سات سو صحابی ہوتے تھے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ میں کتنی زیادہ تعداد حفاظ کی پائی جاتی تھی اور یہی حال مکتوبہ نسخوں کی کثرت کا معلوم ہوتا ہے جو ان ہی صحابیوں کے پاس موجود تھے مکہ کے ابتدائی زمانہ ہی میں کون نہیں جانتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام میں اسی وجہ سے داخل ہوئے تھے کہ ان کی بہن قرآن پڑھ رہی تھیں انھوں نے اس کو چھیننا چاہا تو بہن نے انکار کر دیا۔ یہ واقعہ مشہور ہے اور سب جانتے ہوئے کچھ نہیں تو ابتداءِ اسلام کا یہی ایک واقعہ اس عامیانہ خیال کی تردید

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تاریخوں مثلاً طبری وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے ایک ہزار اور کئی سو آدمی مسلمانوں کی نوج کے یمامہ کی اس مہم میں شہید ہوئے تھے، شہداء میں بڑے بڑے لوگ مثلاً سالم مولیٰ ابی حذیفہ اور حضرت عمر کے حقیقی بھائی زید بن الخطاب رضی اللہ عنہما اس جنگ میں کام آئے۔ قرآن کے متعلق حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ کو خاص خصوصیت صحابہ میں حاصل تھی بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن چار صحابیوں سے قرآن پڑھنے کا حکم عام مسلمانوں کو دیا کرتے تھے ان میں ایک سالم بھی تھے طبری وغیرہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سالم کے ساتھ جو فوجی دستہ تھا وہ اہل القرآن کا فوجی دستہ سمجھا جاتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے سالم ہی سے قرآن پڑھا تھا اور استاد کے ساتھ سب ہی شہید ہوئے تھے حضرت سالم کہتے بھی تھے کہ ہم قرآن والے لوگ ہیں پیچھے ہٹ نہیں سکتے اور واقعہ یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رسول اللہ ہم لوگوں کو قرآن یاد کراتے تھے خود صحابہ پر بھی قرآن کے سیکھنے پڑھنے اور یاد کرنے کا جو بے پناہ جذبہ مسلط تھا اور اسی کے ساتھ اس کا بھی اگر خیال کیا جائے کہ امامت سے لے کر قبر میں دفن ہونے تک امتیاز در ترجیح کا واحد معیار عہد نبوت میں صرف یہ تھا کہ قرآن کس کو زیادہ یاد ہے وہی امام بنایا جاتا تھا اور شہیدوں میں دفن کے وقت اسی کو پہلے دفن کیا جاتا تھا جو قرآن کے یاد کرنے میں زیادہ آگے ہوتا تھا عرب کا دماغ عام مشغلوں سے اس وقت خالی تھا علمی پیاس ان میں جب پیدا ہوئی تو سب سے پہلے تشنگی بجھانے کے لئے ان کو قرآن ہی ملا صحابہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن ان کے سینوں میں اس طرح جوش مارتا رہتا تھا جیسے کھولتی ہنڈیا جوش مارتی ہے جب ایک جگہ چند صحابی بھی جمع ہو جاتے تھے تو لوگوں کا بیان ہے کہ دوی کدوی النحل (شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ) کی آواز گونجنے لگتی تھی یعنی قرآن

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کے لئے کافی ہے کہ ابتدائی یادداشتوں کے سوا کتابی شکل قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک حاصل نہ کر سکا، کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان عورتوں تک کے پاس قرآن کی نقلیں مکہ معظمہ ہی میں اور وہ بھی شروع اسلام ہی میں جب پائی جاتی تھیں تو زمانہ جیسے جیسے آگے کی طرف بڑھا کوئی وجہ ہو سکتی تھی کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی نقل نہ حاصل کرتے ہوں، ذرا خیال تو کیجئے کہ بخاری وغیرہ میں لوگ یہ بھی پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابیوں کو منع فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کو لے کر دشمن کے ملک میں نہ جایا کرو اگر مکتوبہ شکل میں قرآن کے نسخے صحابہ کے پاس موجود ہی نہ تھے تو اس حکم کے معنی کیا ہونگے اسی طرح کی روایتیں ہیں کہ ناظرہ یعنی دیکھ کر قرآن کے پڑھنے کا ثواب رسول اللہ زیادہ بتلاتے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کا ورد ہر ایک شروع کر دیتا تھا ان حالات میں اس پر کیوں تعجب کیجئے اگر یمامہ کی لڑائی میں سات سو قرآن کے حفاظ شہید ہو گئے واقعہ کی اہمیت ہی کا اقتضا تو ہوا جو حضرت صدیق اکبر کو قرآنی صحیفوں کی شیرازہ بندی پر اصرار کے ساتھ آمادہ کیا۔ مناظر احسن گیلانی (حاشیہ صفحہ ۷۷)

[1] سیرۃ ابن ہشام میں ہے کہ بہن کے زد و کوب سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عمر کو اپنی حرکت پر شرمندگی سی پیدا ہوئی اور بہن سے بولے کہ اعطینی الصحیفۃ التی سمعتکم تقرؤن انفا یعنی جو صحیفہ (کتاب) تم لوگوں سے میں نے ابھی پڑھتے ہوئے سنا مجھے دو، اس پر ان کی بہن نے کہا کہ تم ناپاک ہو ایسی حالت میں اس کو چھو نہیں سکتے فاغتسل فاعطته الصحیفۃ (تب حضرت عمر نے غسل کیا اور ان کی بہن نے صحیفہ ان کو دیا) صحیفہ دینے کے اس قصہ کا ذکر علاوہ سیرت کی کتابوں کے دارقطنی کی سنن میں بھی ہے۔ البتہ بجائے غسل کے اس میں وضوء کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے بہرحال فاعطاہ الصحیفۃ کے الفاظ اس روایت میں بھی ہیں، روض الانف میں لکھا ہے کہ اس صحیفہ میں صرف ایک سورۃ طٰہٰ ہی نہیں تھی بلکہ طٰہٰ کے سوا کا بھی پتہ چلتا ہے بعض روایتوں میں ہے کہ اذا الشمس کورت کی سورۃ بھی اس صحیفہ میں تھی جو حضرت عمر نے اپنی بہن سے مانگ کر پڑھا تھا۔ دیکھو صفحہ ۲۱۴ روض الانف مصری ۱۲ [2] مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ [illegible]

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کہ زیادہ سے کیا اس حکم کی تعمیل کا تو یہ قرآن کے بغیر ممکن تھی بس واقعہ یہی ہے جیسا کہ صحابہ خود
ہی بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر وہ قرآن کی نقل حاصل کیا کرتے
تھے اور یوں بکثرت قرآنی سورتوں کی نقلیں صحابہ کے پاس موجود تھیں لیکن اسی کے ساتھ یہ
بھی واقعہ ہے کہ قرآن کی یہ سورتیں جن کی حیثیت مستقل رسالوں اور کتابوں کی تھی ان سب کو
ایک ہی تقطیع اور سائز کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا طریقہ رسول اللہ کے
عہد میں مروج نہیں ہوا تھا بلکہ ایک ہی مصنف کی مختلف کتابیں الگ الگ جلدوں کی شکل
میں جیسے آجکل چھپی ہوئی ملتی ہیں یہی حال گویا عموماً قرآن کی ان سورتوں کا سمجھنا چاہیے تھا اگرچہ
بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر ایک سے زائد صحابیوں نے یہ کام بھی
کر لیا تھا لیکن اس کا عام رواج نہیں ہوا تھا[1] آنحضرت صلعم کے بعد عہد صدیقی میں قرآن کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ قرآن پڑھنے کا درجہ اسی قدر بلند ہے جتنا کہ فرض نماز کو نفل نماز پر فضیلت۔ حاصل یہ ہے
بعض روایتوں میں ہے کہ اللہ رسول کو جو دوست رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ قرآن کو مصحف میں پڑھے اور یہ روایتیں
تو صحاح کی عام کتابوں میں پائی جاتی ہیں مگر دارمی کی وہ تاریخی روایت جس میں ہے کہ رسول اللہ آخری خطبہ میں
جب اس مقام پر پہنچے یعنی فرما رہے تھے کہ لوگو! قبل اس کے کہ علم اٹھا لیا جاوے اس کو حاصل کر لو اس
پر ایک اعرابی نے کہا کہ کیا علم اٹھا لیا جائے گا حالانکہ "المصاحف" یعنی مکتوبہ قرآن کے نسخے ہمارے درمیان
موجود ہیں کیا اس سے زیادہ صریح شہادت اس بات کی مل سکتی ہے کہ عہد نبوت میں گھر گھر قرآن کے نسخے
پھیل چکے تھے اس سلسلے میں چاہا جائے تو اور بھی بہت سی روایتیں جمع ہو سکتی ہیں ۱۲ مناظر احسن گیلانی

[1] مراد اشارہ بخاری وغیرہ کی اس روایت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
عہد میں قرآن کو چار آدمیوں نے جمع کیا اور یہ سب انصار سے تھے یعنی ابی بن کعب، معاذ بن جبل، ابو زید
و زید بن ثابت عام طور پر جمع کرنے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ زبانی یاد کیا تھا مگر بیر معونہ میں ستر صحابی ایسے
شہید ہوئے تھے جن کے متعلق بیان کیا گیا ہے جمعوا القرآن ابن شہاب زہری بجائے جمعوا کے قد وعوا

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

جو خدمت ہوئی ہے اس کا تعلق اسی واقعہ سے ہے میرا اشارہ بخاری وغیرہ کی اسی مشہور روایت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ یمامہ میں حفاظِ قرآن کے شہداء کی غیر معمولی کثرت کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی درخواست پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلعم کے خصوصی کاتبِ وحی زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ ایک نسخہ قرآن کا وہ تیار کریں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) زبانی یاد کیا تھا ان لوگوں نے قرآن کو) (دیکھو کنز العمال) مگر بجز حفظِ قرآن کو ان ہی چار انصاری صحابیوں تک محدود کر دینے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے میرے نزدیک ان چار صحابیوں نے کتابی شکل میں پورے قرآن کو جمع کیا تھا، یعنی قرآن کی کل سورتیں یا سارے قرآنی رسائل ان کے پاس مکتوبہ شکل میں موجود تھے اور یہ انحصار بھی بظاہر انصاری صحابیوں کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے محمد بن کعب القرظی کے حوالہ سے کنز العمال ہی میں جو روایت ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں جمع القرآن فی زمان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خمسۃ من الانصار (یعنی انصار کے پانچ آدمیوں کا یہ حال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انھوں نے قرآن جمع کیا تھا) طبرانی کے حوالہ سے کنز العمال ہی میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ انصاریوں میں مجمع بن جاریہ نے بھی قرآن جمع کیا تھا بجز دو یا تین سورتوں کے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی مصنف کی جیسے کل کتابیں لوگ جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن اکثروں کے پاس کل تصنیفات نہیں ہوتے عہدِ نبوت میں عام صحابہ کا قرآنی سورتوں کے متعلق یہی حال تھا کنز العمال میں ابن داؤد کی کتاب المصاحف کے حوالے سے صحابہ کے متعلق یہ الفاظ صراحتًا بھی منقول ہیں یعنی کتبوا اخلاثی فی الصحف والالواح (یعنی صحابہ نے قرآن کو صحیفوں اور تختیوں میں لکھ لیا تھا) ج ۲ ص ۲۵ بر مسند احمد میں لوگوں سے کیا کہوں کنز العمال ہی میں اس واقعہ کا تذکرہ جو ملتا ہے کہ قیس بن مروان نامی ایک صاحب کوفہ سے حضرت عمر کے پاس آئے اور آکر عرض کیا کہ ایک شخص کو کوفہ میں چھوڑ کر آیا ہوں جو قرآن کو زبانی لکھواتا ہے سن کر راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمر غصہ سے بے خود ہو گئے اور غصہ میں فرما رہے تھے ارے یہ کون شخص ہے جو ایسی حرکت کرتا ہے، قیس نے کہا کہ عبداللہ بن مسعود یہی کرتے ہیں، ابن مسعود کا نام سن کر حضرت عمر کچھ ٹھنڈے پڑے اور فرمایا کہ خیر قرآن کے جاننے والوں میں میں نہیں جانتا کہ ان سے بھی بڑا عالم کوئی رہ گیا ہے" (کنز ج ۲ ص ۲۵) میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس روایت کے بعد یہ خیال کہ عام طور پر قرآن کو زبانی لکھوانے کی ممانعت تھی اور یہ کہ جو بھی قرآن لکھتا تھا کسی مکتوبہ نسخے سے نقل کرتا تھا اگر قایم کیا جائے تو اس کے سوا کیا کوئی دوسرا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ مناظر احسن گیلانی

نہ سمجھنے والوں نے خدا جانے اس روایت سے کیا کچھ سمجھ لیا اور عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے بعض اس روایت کو پیش کر کے مدعی ہو گئے کہ کتابی شکل قرآن نے عہد صدیقی ہی میں اختیار کی ورنہ اس سے پہلے اس کی حیثیت زبانی یادداشتوں کی سی تھی۔ مگر جو کچھ اب تک عرض کیا جا چکا ہے اس سے واقف ہونے کے بعد کوئی صاحب فہم لمحہ بھر کے لئے کیا اس مغالطے میں مبتلا رہ سکتا ہے؟ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ فقط لکھوانے ہی کا اگر قصہ ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی وہ تو خود لکھوا سکتے تھے۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس فرمان کے نافذ کرنے میں کشمکش کا اظہار کیا گو بعد کو راضی ہو گئے انھوں نے کہا تھا کہ میں اس کام کو کیسے کروں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا بخاری کی روایت کے یہ الفاظ ہیں

کیسی عجیب بات ہے کہ رسول اللہ کا تو قاعدہ تھا کہ اترنے کے ساتھ ہی قرآن کی ہر آیت کو لکھوا دیتے تھے پھر حضرت ابو بکر کا یہ کہنا کہ رسول اللہ نے جس کام کو نہیں کیا اس کام کو میں کیسے کروں اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

پس اصل واقعہ یہی ہے کہ قرآن کی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا کام اور وہ بھی حکومت کی طرف سے یہی ایسا کام تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انجام نہیں دیا تھا، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی خدمت کا مطالبہ کر رہے تھے چاہتے تھے کہ خلافت اور حکومت کی جانب سے اس کام کو باضابطہ طور پر انجام دلایا جائے بلاشبہ یہ ایک نیا اقدام تھا اور ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس اقدام کے متعلق تردد ہوا تو اس کی یقیناً گنجائش تھی، لیکن بعد کو خود ان کا فیصلہ بھی یہی ہوا کہ بجائے متفرق رسالوں کی صورت میں رہنے کے یہ زیادہ مناسب ہے کہ تمام قرآنی سورتوں کو ایک ہی تقطیع

کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں سب کو مجلد کرا دیا جائے پھر جیسا کہ سب جانتے ہیں بخاری کی اسی روایت میں ہے کہ حضرت زید بن ثابت کو حکومت کی طرف سے اس خدمت کے انجام دینے کے لئے ابوبکر صدیق رضی نے مقرر کیا۔ زید بن ثابت رضی نے بڑی محنت اور جان فشانی سے اس کام کو پورا کیا[1]، کام کی رپورٹ کرتے ہوئے وہی باتیں کیں جو آج بھی کتابوں کے نقل کرنے والے خصوصاً قرآن جیسی اہم کتابوں کے لکھنے والے اور چھاپنے والے عموماً کرتے اور کہتے ہیں یعنی مختلف نسخوں کو بھی انھوں نے لکھتے وقت پیش نظر رکھا اور اسی سلسلہ میں آنحضرت صلعم کی لکھوائی ہوئی ابتدائی یادداشتیں جو رقاع، عسیب، لخاف وغیرہ پر تھیں ان کو بھی انھوں نے اپنے سامنے لکھتے وقت رکھ لیا تھا نیز ہر آیت کی تصحیح دو دو حافظوں سے بھی کرتے چلے جاتے تھے البتہ وہی سورہ برات کی آخر کی دو آیتیں ان کے متعلق رپورٹ میں انھوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ آنحضرت صلعم کی لکھائی ہوئی یادداشتوں میں وہ یادداشت نہ ملی جس میں یہ آیتیں لکھی ہوئی تھیں اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ دو حافظوں کی تصحیح کی شرط جو تھی اس شرط کی پابندی بھی ان آیتوں کے متعلق میں نے نہیں کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست ان کو میں سنتا رہا اور ایک ایسے صحابی جن کی شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شہادتوں کے مساوی قرار[2] دیا تھا یعنی خزیمہ رضی بن ثابت انصاری کی تصحیح کو کافی سمجھا جسکی وجہ غالباً وہی تھی

---

[1] امام مالک شہاب زہری سے اور شہاب زہری عبد اللہ بن عمر کے صاحبزادے سالم کے حوالے سے یہ روایت نقل کرتے تھے کہ زید بن ثابت نے "القراطیس" پر ابوبکر کے حکم سے قرآن کی کل سورتوں کو لکھا تھا، غالباً ایک ہی تقطیع کے اوراق جب بنائے جاتے تھے ان کو قراطیس کہتے تھے دیکھو اتقان صفحہ ۵۸ ج ۱ ایک سائز کے اوراق پر لکھے ہونے کی وجہ سے ابوبکر صدیق کی حکومت کے مرتب کردہ اس نسخہ کو "ربعہ" بھی کہتے تھے دیکھو اتقان صفحہ ۵۹ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طول و عرض ان اوراق کا مساوی تھا "ربعہ" (چوکھوٹا) کا لفظ بھی بتاتا ہے ۱۲ مناظر احسن گیلانی

[2] واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک بدوی جس کا نام سواء بن قیس المحاربی تھا اس نے رسول اللہ صلی

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کہ سورہ برات کی ان آیتوں کو بطور وظیفہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیوں کو پڑھنے کا عام حکم دے رکھا تھا، اسی لئے عام طور پر جانی پہچانی یہ دونوں آیتیں تھیں۔

بہر حال حکومت کی جانب سے ایک ہی تقطیع پر تمام قرآنی سورتوں کے لکھوانے اور سب کو ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا مرحلہ تو عہد صدیقی ہی میں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک سال بعد ہی پورا ہو چکا تھا، علامہ قسطلانی شارح بخاری کے حوالے سے الاتقان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اللہ علیہ وسلم سے ایک گھوڑے کی فروخت کا معاملہ کیا تھا، پھر مکر گیا اور بولا کہ معاملہ کس کے سامنے ہوا؟ واقعہ یہ تھا کہ معاملہ کے وقت کوئی دوسرا موجود نہ تھا، خزیمہ انصاری نے فوراً ہو کر کہا کہ بیشک معاملہ ہوا تھا، رسول اللہ نے پوچھا کہ تم کب موجود تھے جو گواہی دے رہے ہو، خزیمہ نے کہا کہ آپ کی رسالت کو جب ہم حق سمجھتے ہیں تو بھلا گھوڑے کے معاملے میں آپ کوئی خلاف واقعہ دعویٰ فرما سکتے ہیں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقعہ پر فیصلہ فرمایا کہ خزیمہ جس کی موافقت یا مخالفت میں گواہی دیں ان کی گواہی کافی قرار دی جائے گی (اسد الغابہ ج ۲)
ثم ان صحابی کا نام خزیمہ تھا یا ابو خزیمہ؟ بات یہ ہے کہ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راویوں میں سے کسی راوی کو ان کا نام خزیمہ یاد رہا اور کسی کو ابو خزیمہ، اگرچہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ خزیمہ نام بتانے والے صحت سے زیادہ قریب ہیں ان روایتوں میں ایک اختلاف یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق عہد صدیقی کی قرآنی خدمت سے تھا یا حضرت عثمان کی حکومت نے جو کمیٹی بٹھائی تھی، اس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا مگر ظاہر ہے کہ عہد عثمانی میں اس واقعہ کے پیش آنے کی صورت ہی کیا تھی، عہد صدیقی میں قرآن کے سارے اجزاء کی شیرازہ بندی ہو چکی تھی عہد عثمانی میں تو عہد صدیقی کے اسی مرتبہ نسخہ کی نقل کی گئی تھی جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن چند آیتوں کے متعلق زید بن ثابت نے یہ بیان دیا تھا یہ آیتیں سورہ برات کی آخری دو آیتیں تھیں یا الاحزاب کی یعنی رجال صدقوا ما عاہدوا اللہ الایہ والی آیت تھی، روایت کے راویوں کو اس میں بھی اشتباہ ہوا اور غالب قرینہ یہی ہے کہ برات ہی والی آیت تھی کیونکہ عام طور پر بطور وظیفہ کے ان ہی دو آیتوں کے پڑھنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا اسی لئے ہر خاص و عام کے یاد ہونے کی وجہ سے زیادہ تفتیش و تلاش کی ضرورت بھی نہ تھی، بلکہ روایتوں کے مختلف الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو ان سے واقعہ کی اصل صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی یادداشتوں میں سے صرف یہی ٹکڑا جس میں برات کی یہ دونوں آیتیں تھیں

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

نے نقل کیا ہے کہ

قد کان القرآن کلہ کتب فی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکنہ غیر مجموع فی موضع واحد (الاتقان ج ۱)

(قرآن کل کا کل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں لکھا جا چکا تھا البتہ ایک جگہ ساری سورتوں کو جمع نہیں کیا گیا تھا یعنی ایک جلد میں مجلد ساری سورتیں نہ ہوئی تھیں)

حارث محاسبی نے جو امام حنبل کے معاصر ہیں اپنی کتاب فہم السنن میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں قرآنی یادداشتوں کا جو مجموعہ تھا "

کان القرآن فیہا منتشرا فجمعہا جامع وربطہا بخیط حتی لا یضیع

(اسی میں قرآنی سورتیں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں ابوبکر کے حکم سے جامع قرآن زید بن ثابت نے ایک جگہ سب سورتوں کو جمع کیا اور ایک دھاگے سے سب کی شیرازہ بندی کی۔

اور یہی کام یعنی ایک جلد میں مجلد کرانے کا کام عہد صدیقی میں انجام پایا لیکن دوسروں کو بھی اسی کی تقلید پر نہیں ساری سورتوں کو ایک ہی تقطیع پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرائیں اور سورتوں کی جلد بندی میں جو ترتیب رکھی گئی تھی اسی کی پابندی کریں اس پر لوگوں کو مجبور نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک ہی مصنف کی چند کتابوں کو مختلف سائز کے اوراق پر لوگ چھاپتے ہیں اور کسی خاص ترتیب کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) زید کو بتلا رہا تھا وہ خود فرماتے ہیں کہ وہ ٹکڑا مفقود تھا فالتمستھا فوجدتھا مع خزیمہ یعنی ہم لوگوں نے اس کو ڈھونڈھنا شروع کیا تو خزیمہ کے پاس وہ گم شدہ رقعہ یا ٹکڑا مل گیا) بجائے فرد صیغے کے التمسنا ہم لوگوں نے ڈھونڈھا جمع کا صیغہ [illegible] استعمال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے صحابی بھی تلاش میں شریک تھے خزیمہ کے پاس یہ رقعہ یا ٹکڑا کیسے پہنچ گیا تھا ممکن ہے کہ نقل کرنے یا کسی دوسری غرض سے رسول اللہ سے خزیمہ مانگ کر لے گئے اور واپسی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی یا کسی اور وجہ سے واپس کرنے کا موقعہ ان کو

پابندی کے بغیر جس کے جی میں جس طرح آتا ہے ان کی جلد بند ہوتا ہے کچھ یہی حال حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت تک رہا لوگوں کی انفرادی آزادی میں حکومت نے دخل دینا مناسب نہ خیال کیا لیکن مختلف ممالک و امصار کے لوگ جب اسلام میں داخل ہوئے جن میں عرب ہی نہیں بلکہ بیرون عرب کی بھی ایسی بڑی آبادیاں شریک تھیں جن کی مادری زبان عربی نہ تھی، عربی الفاظ و حروف کے صحیح تلفظ کی قدرت طبعاً ان میں نہیں پائی جاتی تھی نیز خود عرب میں بھی قبائلی اختلاف لب ولہجہ میں بکثرت پایا جاتا تھا اور اختلاف کی یہ نوعیت دنیا کی تمام زبانوں میں عام ہے۔ ابن قتیبہ نے لب ولہجہ کے قبائلی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ

فالھذلی یقرء عتی حین والاسدی یقرء تعلمون بکسر والتمیمی یھمل والقریشی لا یھمل۔

ہذلی یعنی بنی ہذیل کے قبیلہ والے (حتی حین) کو عتی عین پڑھتے ہیں، اسی طرح تعلمون کی ت کو زیر کے ساتھ اسدی یعنی بنی اسد والے تلفظ کرتے ہیں اسی طرح تمیمی ہمال سے کام لیتا ہے قریشی یہ نہیں کرتا۔

اسی طرح تابوت کا تلفظ خود مدینہ والے تابوہ کرتے تھے اور بھی اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں قرآن کے پڑھنے میں عربی قبائل اور عجمی نومسلموں کی طرف سے ان اختلافات کا جب ظہور ہوا اور ہر ایک اپنے تلفظ کی صحت پر اصرار بے جا کرنے لگا تو اس وقت حضرت حذیفہ بن یمان صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس نسخہ کی نقل کے لئے ایک سررشتہ قائم کر دیا جو عہد صدیقی میں تیار ہوا تھا اس سررشتہ کے افسر وہی حضرت زید بن ثابت ہی مقرر کئے گئے جنہوں نے عہد صدیقی میں نسخہ تیار کیا تھا اور مزید گیارہ ارکان کا ان کی

---

[1] تبیان فی مباحث القرآن صفحہ ۔ صالح الجزاوی [2] زید بن ثابت نوعمری میں مسلمان ہوئے تھے آنحضرت (بقیہ برصفحہ آئندہ)

امداد کے لئے اضافہ کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ کتابت کی حد تک قرآن کو اسی لہجہ اور تلفظ میں لکھا جائے جو رسول اللہ صلعم کا تلفظ اور لہجہ تھا اسی سررشتہ نے چند نقلیں تیار لیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف صوبوں کے پایہ تخت میں پہنچ کر فرمان جاری کردیا کہ اپنے اپنے قبائل یا انفرادی لہجوں یا تلفظ کے لحاظ سے لکھے ہوئے قرآن لوگوں کے پاس جو موجود ہیں وہ حکومت کے حوالہ کر دئے جائیں تاکہ ان نسخوں کو معدوم کر دیا جائے۔

عہد عثمانی میں قرآنی خدمت کی صحیح تنقیح | حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں قرآن شریف کی خدمت یہی اور صرف یہی ہوئی ہے جو بجائے خود بہت بڑی اور اہم خدمت ہے ورنہ عربی قبائل اور عجمیوں کے مختلف تلفظ کی بنیاد پر لکھے ہوئے قرآن خدانخواستہ اگر دنیا میں پھیل جاتے تو خدا ہی جانتا ہے کہ دشمنان اسلام اس بات کو بتنگڑ بنا کر بات کہاں سے کہاں پہنچا دیتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ کتابت کی حد تک انھوں نے قرآن میں وحدت کا رنگ پیدا کر دیا رہا تلفظ تو ظاہر ہے کہ اس میں وحدت کا مطالبہ ان کے بس کی بات تھی بھی نہیں اسی لئے اس مطالبے کو نظر انداز کر دیا گیا اور آزادی بخشی گئی کہ جس کا جو تلفظ ہے یا تلفظ کی جس نوعیت پر جو قادر ہے اسی تلفظ اور لب و لہجے میں قرآن شریف کو وہ پڑھ سکتا ہے ایک حدیث بھی رسول اللہ صلعم کی موجود تھی جس میں فیصلہ فرمادیا گیا تھا کہ قرآن مجید ایک ہی "حرف" یعنی تلفظ پر نازل نہیں ہوا ہے بلکہ "سبعۃ احرف" یعنی متعدد تلفظ کی اس میں گنجائش ہے۔ اگرچہ کوشش تو اسی کی کرنی چاہئے کہ اسی لب و لہجہ میں قرآن کی تلاوت ہر مسلمان کو میسر ہو جو رسول اکرم صلعم کا لب و لہجہ تھا اسی لئے تجوید اور قرأت کا ایک مستقل فن ابتداء ہی سے مسلمانوں میں مروج ہو گیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت کے ساتھ کتابت کا کام ان سے لیا کرتے تھے حتیٰ کہ اسی سلسلہ میں یہودیوں کے حروف اور زبان کی تعلیم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انھوں نے حاصل کی تھی یہ ان صحابیوں میں ہیں جنھوں نے تصنیفی یادگار چھوڑی فرائض و مواریث کے متعلق ان کی ایک کتاب کا ذکر مورخین کرتے ہیں۔ ۱۲ مناظر احسن گیلانی

اور عبرت کے لئے (یعنی یہ بتانے کے لئے کہ کوشش کی جائے تو غیر عربی آدمی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریشی لب ولہجہ میں قرآن پڑھ سکتا ہے) قرأت وتجوید کے لئے اسی قسم کے لوگوں کا عہد صحابہ وتابعین ہی میں عموماً انتخاب کیا گیا جو نسلاً عرب نہ تھے فن قرأۃ کے ائمہ بعد کو بھی عجمی نژاد قاریوں کی جماعت ہوئی۔[له]

بہرحال حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ کا کارنامہ قرآن کے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ یہی ہے کہ کتابت کی حد تک تلفظ اور لب ولہجہ کے جھگڑوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا اور یہ کام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تقریباً کل چودہ پندرہ سال بعد انجام پایا۔ آج ممکن ہے کہ خلافت عثمانی کے عہد کی اس قرآنی خدمت کی قیمت و اہمیت کا لوگوں کو صحیح اندازہ نہ ہو سکے لیکن ذرا سوچئے تو سہی کہ ابتداء ہی میں مسلمانوں کو کتابت کی اسی ایک شکل پر جمع نہ کر دیا جاتا تو نتیجہ کیا ہوتا۔؟

عجمی مسلمانوں کو تو ابھی جانے دیجئے خود عربی قبائل میں تلفظ اور لہجوں کے اختلافات کیا معمولی تھے قرآنی آیت "قد جعل ربک تحتک سریا" کو قبیلہ قیس والے چونکہ تانیث کا تلفظ ش سے کرتے تھے ظاہر ہے کہ اس بنیاد پر یہی آیت قیس کے قبیلہ والوں کے قرآن میں اسی شکل میں لکھی ہوئی ملتی یعنی "قد جعل ربش تحتش سریا" قیس کے اس طرز تلفظ کا اصطلاحی نام کشکشۂ قیس تھا اسی طرح تمیم والے اَن کے لفظ کو عن کی شکل میں ادا کرتے تھے اس کا نام عنعنۂ تمیم تھا مثلاً عسی اللہ ان یاتی بالفتح کو عسی اللہ عن یاتی

له اور واقعی اس پر تعجب ہوتا ہے کہ قراء قرآن کے طبقہ اولیٰ ہی میں ہم قالون اور ورش وغیرہ نام رکھنے والے بزرگوں کو پاتے ہیں۔ ورش تو خیر کہتے ہیں کہ ورشان (فاختہ) کے عربی لفظ کا اختصار ہے لیکن قالون کے متعلق تو اس کی تصریح کی گئی ہے کہ یہ یورپین یعنی رومی لفظ ہے مانا جاتا ہے کہ عربی میں پہنچ کر صرف اتنا تصرف ہوا کہ کالون کو قالون یعنی کاف کو قاف سے بدل دیا گیا کہتے ہیں کہ کالون کے معنی جید کے ہیں۔ باقی یوں بھی آپ کو قراء سبعہ جو اس فن کے ائمہ ہیں ان میں زیادہ تر عجمی النسل اور موالی طبقہ سے تعلق رکھنے والے حضرات ملیں گے۔ ۱۲ مناظر احسن گیلانی

یا شغیم کی شکل میں ادا کرتے تھے اور سب سے دلچسپ اس قبیلہ کا تلفظ تھا جو س کو ت کی شکل میں ادا کیا کرتا تھا اسی وجہ سے پوری سورہ والناس کی ہر آیت کے آخری لفظ میں بجائے س کے ان کے قرآن میں ہم گویا ت لو پاتے مثلاً قل اعوذ برب النات الخ اس معاملہ میں لوگ اس درجہ مجبور تھے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی جو ہذلی قبیلہ سے تھے ان تک کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس لئے ٹوکا کہ وہ "حتیٰ حین" کا تلفظ "عتیٰ عین" کی شکل میں کر رہے تھے۔

جب خالص عربی قبائل کا یہ حال تھا تو بیچارے عجمیوں میں پہنچ کر قرآنی نسخوں کی جو حالت ہوتی وہ ظاہر ہے۔

دور کیوں جائیے ہندوستان ہی کا نتیجہ کیا ہوتا کھلی ہوئی بات ہے کہ اس صورت میں جتنے قرآن پنجاب میں طبع ہوتے اس میں ہر جگہ بجائے ق کے ک ہی چھاپا جاتا اسی طرح دکن میں جو قرآن چھپتے ق کی جگہ خ اور خ کی جگہ ق لوگوں کو ہر جگہ نظر آتا اور اس قسم کے اختلافات کو کون گن سکتا ہے ہر تھوڑے فاصلہ سے تلفظ اور لہجے کے یہ اختلافات زبانوں میں پیدا ہی ہو جاتے ہیں۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مدرسہ کے معلمین جو مختلف لہجوں میں قرآن پڑھاتے تھے انھیں میں کَفَّرَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا کی نوبت تک آگئی تھی تو سمجھا جا سکتا ہے کہ آگے بڑھکر یہی اختلافات مسلمانوں کو خطرہ کے کس نقطہ تک پہنچا دیتے؟۔

واقعہ یہ ہے کہ ــــــ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت کی اس خدمت کے مسلمان بہت ممنون نظر آتے ہیں اور عموماً اس کا تذکرہ کرتے ہیں حتیٰ کہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے

ل قبائل عرب کے لب ولہجہ کے اختلافات کے سلسلہ میں جو مثالیں دی گئی ہیں علاوہ دوسری کتابوں کے الجزائری کی تبیان میں بھی اس کا کافی مواد مل سکتا ہے دیکھئے صفحات ۳۰، ۴۷، وغیرہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی روایت کا ذکر بھی اسی کتاب میں کیا ہے ۱۲۔

کہ "عثمان نے بہت اچھا کیا اور جو کچھ کیا ہم سب کے مشورہ سے کیا انھوں نے پوچھا کہ مسلمانوں میں یہ جھگڑا جو چھڑ گیا ہے کہ ہر ایک اپنی قرأت کو دوسروں کی قرأت سے بہتر قرار دیتا ہے بلکہ دوسرے کی قرأت کو کفر کی حد تک بھی پہنچا دیا جاتا ہے اس کا علاج کیا کیا جائے؟ ہم لوگوں نے پوچھا آپ نے کیا علاج سوچا ہے۔ عثمان نے کہا

(ہری) ان نجمع الناس علی مصحف واحد[1] — میں خیال کرتا ہوں کہ لوگوں کو ایک ہی مصحف پر جمع کر دیا جائے۔

یہی "جمع الناس علی مصحف واحد" عہد عثمانی کی قرآنی خدمت کی صحیح تعبیر ہے یعنی مسلمانوں کو ایک ہی مصحف پر آپ نے جمع کر دیا۔ عوام نے ان کے اسی خطاب کو جامع القرآن[2] کے نام سے مشہور کر دیا جو نہ صرف یہی کہ واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ عام طور پر اس تعبیر سے بڑی غلط فہمی پھیل گئی۔ لوگ سمجھنے لگے کہ حضرت عثمان رضی سے پہلے گویا قرآن جمع کیا ہوا یا لکھا ہوا نہ تھا ورنہ یہ تو خیر ایک تعبیری غلطی ہے بجائے جامع القرآن کے جامع الناس علی القرآن سے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا اس کی اصلاح ہو سکتی ہے مگر یہی قصہ یعنی حضرت عثمان رضی کی طرف قرآن کی اسی خدمت کا انتساب اور اس کی شہرت ایک بڑے فتنے کا مقدمہ بن گئی۔ اور اب ہم اسی فتنے کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

---

[1] دیکھو مختصر کنز العمال برحاشیہ مسند احمد صفحہ ۵ جلد ۲ [2] یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں میں یہ غلط فہمی زمانہ سے پھیلی ہوئی ہے تیسری صدی کے مشہور صوفی اور عالم حارث محاسبی کا یہ قول اتقان میں سیوطی نے نقل کیا ہے المشهور عند الناس ان جامع القرآن عثمان وليس كذلك انما حمل عثمان الناس على القراءة لوجه واحد (لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان جامع القرآن ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے انھوں نے لوگوں کو قرآن کی ایک ہی قراۃ پر صرف جمع کیا) صفحہ ۶۲ اتقان ہی میں ابن التین کا قول نقل کیا ہے کہ صرف قریش کے لغت اور لب ولہجہ پر حضرت عثمان نے قرآن لکھوایا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کان وسع فی قراءتہ بلغة غيرهم رفعاً للحرج والمشقة کتابت کی حد تک قریش کے لب ولہجہ کی پابندی کی گئی باقی پڑھنے میں حضرت عثمان نے بھی اجازت دے رکھی تھی کہ دوسرے لہجہ وتلفظ میں بھی لوگ پڑھیں اس سے تنگی اور مشقت کا ازالہ مقصود تھا صفحہ ۶۱

(باقی آئندہ)

ہزارہا سال کے قدیم ترین تاریخی وثائق قرآن کی روشنی میں

(۲)

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ

(حیدرآباد دکن)

حیرت ہوتی ہے کہ سحر اور جادو میں ایک طرف ان ہی مصریوں نے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ بعض مورتیاں اس شکل میں برآمد ہوئی ہیں کہ ایک آدمی مگرمچھوں کو پاؤں کے نیچے دبائے ہوئے ہے، اور اپنے دونوں ہاتھوں میں متعدد سانپوں، بچھوؤں کو بھی پکڑے ہوئے ہے اور ان ہی کے ساتھ دم کے ساتھ شیر کو بھی اٹھائے ہوئے ہے، یہ مورتی مصری میوزیم میں موجود ہے،

مگر دوسری طرف ان ہی آثار سے جو مصر کے مختلف مقامات سے برآمد ہو رہے ہیں اور چوتھی، پانچویں صدی قبل مسیح کے مورخین مثلاً ہیرودوٹس یونانی، ڈیوڈورس صقلی، پلوٹارک وغیرہ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی جانوروں کو مصری آخر میں پوجنے لگے تھے۔

عہد فراعنہ میں کہتے ہیں کہ یکے بعد دیگرے تیس خانوادوں کی حکومت مصر میں قایم ہوتی رہی افلاطون کا بیان ہے، کہ مصریوں کے دین اور دھرم کی اس عجیب وغریب شکل کی ابتدا چھبیسویں خانوادے سے شروع ہوئی، اور رومی جب مصر پر قابض ہوئے تو ملک ان ہی حیوانی معبودوں اور دوسرے دیوتاؤں کے نیچے پڑا ہوا تھا، حالت یہ ہوگئی، کہ جن سانپوں کی پرستش کرتے تھے اگر وہ کاٹتا تو اس کو خوش قسمتی خیال کرتے تھے۔ یا جن درندوں کو پوجتے تھے اگر پکڑ لیتا تو بخوشی اس پر راضی ہوجاتے

تھے کہ ان کو پھاڑ کر کھا جائے۔"

حیوان پرستی کے سلسلے میں مصریوں کا ذوق عجیب تھا، مذکورہ بالا حیوانی معبودوں کے ساتھ ساتھ ان کا بڑا زبردست معبود سانڈ تھا جسے وہ ابیس[1] بھی کہتے تھے اور بیل ہی کی شکل کا ایک معبود دھاتور نامی تھا، اور جہاں ایسے بھاری بھرکم بدن والے جانور کو وہ پوجتے تھے، وہیں ایک حقیر کیڑا، جسے عربی میں جعل کہتے ہیں، اور مصر کی پرانی زبان میں اس کا نام "خپر" تھا شکل جس کی یہ بتائی گئی ہے، یہ کیڑا مصریوں کے اہم معبودوں میں شمار ہوتا تھا، عہدِ فراعنہ کے پچھلے دور کے مورخین نے بعض دلچسپ لطائف بھی مصریوں کی حیوان پرستی کے سلسلے میں نقل کئے ہیں مثلاً ڈیوڈور سیقلی نے لکھا ہے کہ

---

[1] واللہ اعلم بیل، عربی تلفظ جس کا بعل ہے اس کی پرستش کا رواج دنیا میں کس بنا پر ہوا۔ زرعی جانور ہونے کی وجہ سے اس کی پرستش ہوتی تو چاہئے کہ جن ملکوں میں بجائے بیلوں کے گھوڑوں سے ہل جوتتے ہیں وہاں کے لوگ گھوڑوں کو پوجتے اور گھی دودھ وغیرہ اگر اس کی علت ہوتی تو غریب بھینس (جاموس) جو مصر وغیرہ میں بھی بکثرت پائی جاتی ہے اس کی زیادہ مستحق تھی شیخ اکبر محی الدین بن عربی نے لکھا ہے کہ عرش کے اٹھانے والے فرشتوں میں ایک فرشتے کی شکل بیل جیسی ہے، یہودی روایات میں بھی یہ قصہ ملتا ہے شیخ اکبر نے اس پر اضافہ بھی کیا ہے کہ جس زمانے سے بیل کو لوگوں نے معبود بنایا اس فرشتے کے چہرے پر غم کے آثار، طاری ہیں ہمیشہ وہ مغموم رہتا ہے، بہر حال اسباب کچھ بھی ہوں جو مورتیاں مصر سے برآمد ہورہی ہیں ان میں ابیس اور دھاتور کی مورتیاں بھی ملی ہیں، علاوہ اس کے مصریوں کا قاعدہ یہ بھی تھا کہ ایک خاص قسم کا سانڈ جس میں خاص خاص علامتیں ہوتی تھیں تلاش کرکے وہ لایا جاتا تھا اور عظیم الشان مندر میں وہ رکھا جاتا تھا۔ بڑے بڑے کاہن اس کی سیوا کرتے تھے جب ابیس مر جاتا تو پہلے اس کو دریائے نیل میں غسل دیا جاتا پھر حنوط کرنے والی دواؤں کو اس میں بھر کر بڑے دھوم دھام سے اس کو دفن کر دیا جاتا تھا اس کے جنازے میں کاہن خاص طریقے سے ناچا کرتے تھے اسی طرح جب نیا ابیس اپنی خاص علامتوں کے ساتھ مل جاتا تو پھر بڑی خوشی منائی جاتی تھی اور اس وقت کا ناچ بھی خاص ڈھنگ کا ناچ ہوتا ۔ الادب والدین الظنون زکری

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

"کسی رومی سپاہی نے ایک بلّے کو مار ڈالا، مصر والوں نے اس بلّے کے قصاص میں اس رومی کو قتل کر دیا۔"

اسی طرح پلوٹارک نے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ

"مصر کے وسطانی علاقہ صوبہ سینوپولیت نامی کے باشندے ایک خاص قسم کی مچھلی کا شکار کر کے اس کو چٹ کر گئے جو صوبہ کسرنیک کے رہنے والے مچھلی کی اس قسم کی پوجا کرتے تھے یہ خبر مچھلی کے پوجاریوں کو جب ملی تو انھوں نے سینوپولیت والوں کے نام اعلان جنگ کر دیا بڑی زبردست لڑائی ہوتی آخر اس کتّے کے پکڑنے میں کامیاب ہوتے جو سینوپولیت والوں کا معبود تھا انھوں نے مچھلی کے قصاص میں اس کتّے کو ذبح کیا اور انتقام کی آگ بجھائی"

مصر قدیم کا مورخ اسٹرابون بھی ہے اس نے لکھا ہے کہ

"مصر والے گھڑیالوں اور مگرمچھوں کے لئے کھانے کا نظم بڑے تزک و احتشام سے مختلف دریاؤں میں کرتے تھے اور بیش قرار رقوم اس پر وہ خرچ کیا کرتے تھے"

ہیروڈوٹس نے بھی لکھا ہے کہ

"مصری جن جن جانوروں کی پوجا کرتے تھے ان کی لاشوں کو وہ بادشاہوں کے مقبروں میں دفن کیا کرتے تھے اور ان معبود جانوروں کے دفن میں اپنے ماں باپ اور عزیزوں قریبوں سے بھی زیادہ دلچسپی لیتے اور بیش قرار مصارف کا بار اٹھاتے"

انطون زکری کا بیان ہے کہ

"حال میں ایک بڑے گہرے خندق سے ہزار ہا ہزار بلّیوں، اور مگرمچھوں کی لاشیں برآمد ہوئی ہیں جو ممی (حنوط) کی ہوئی تھیں" ص۱۵۲

مصر کی تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ تیس خاندانوں کی حکومت عہد فراعنہ میں یکے

بعد دیگرے جو قایم ہوتی رہی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ کم از کم حضرت مسیح علیہ السلام سے چار ہزار برس پیشتر سے شروع ہو کر نقتانی بوس ثانی پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے سمجھا جاتا ہے کہ تین سو پچاس قبل مسیح میں فراعنہ کے اس دور کا انقراض ہوا، رومی اسی کے بعد مصر پر قابض ہو گئے، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ سراغ لگانے والے مختلف قرائن اور شہادتوں کی روشنی میں اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ ہزارہا سال تک توحید و آخرت پن اور باپ یعنی نیکی و بدی، بر دائم بہشت و دوزخ مرنے کے بعد دوسری زندگی پہ اور اسی قسم کی وہ ساری باتیں جن کی تعلیم خدا کے پیغمبروں نے دنیا کو دی ہے یہی چیزیں مصریوں کی دینی زندگی کے جوہری حقائق تھے، لیکن مصر کے اسی موحد ملک کے باشندے عروج و ارتقاء کی آخری بلندیوں پر جب پہنچ گئے تو شش نق اور تاکلوت نامی فرعونوں کے زمانے میں جو اٹھائیسویں خانوادے کے حکمران تھے تخمینہ کیا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ سے تقریباً ایک ہزار سال سے آگے ان کی حکومت کا عہد متجاوز نہیں ہوتا، اسی زمانے میں خالق عالم کے سامنے سے جُبب کبھی کوئی قوم ہٹی ہے تو دیکھا گیا کہ ہر ایک کے سامنے پڑی ہوئی ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ جبل جیسے کیڑے تک کو معبود بنا لینے پر وہ راضی ہو گئے، وہ کتوں کو بھی پوجنے لگے، اور بلیوں کو بھی، سانپوں کو بھی اور بچھوؤں کو بھی،

اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ کچھ نہیں تو صرف مصر قدیم کی تاریخ ہی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو نظر آئے گا کہ ابتداءً ہر قوم و ملت کو خالق عالم کی طرف سے پیغمبروں اور رسولوں نے توحید ہی کی تعلیم دی ہے شرک میں جب کبھی اور جہاں کہیں بھی قومیں مبتلا ہوئی ہیں وہ اپنے ابتدائی دین سے دور ہونے کے بعد ہی ہوئی ہیں اس قسم کی قرآنی آیتیں مثلاً

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (سورہ نحل)	ہم نے ہر امت (قوم) میں اپنے پیغام پہنچانے والے پیغامبر بھیجے یہ پیغام دے کر، کہ اللہ ہی کو پوجتے رہو، اور الطاغوت (یعنی خدا

* ... انجام ان کے سامنے آیا جو خدا کے سامنے سے ... بعد ہر قوم کے سامنے آیا ... یعنی ایک خالق کے سامنے سے۔

سے سرکش بنانے والی چیزوں، سے بچتے رہنا۔

یہ واقعہ ہے کہ ان کا صحیح مطلب دنیا کی قوموں کی تاریخ ہی کے پڑھنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے خود اسی آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے

فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُکَذِّبِیْنَ　　پھر چلو پھرو زمین میں اور دیکھو! کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

کاش! تفسیر کی تمام کتابوں کے ساتھ ساتھ قرآن کو سمجھنے کے لئے اس قرآنی مشورے کو ہمارے علماء سنتے، سیر فی الارض ہی کی تعمیل کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ زمین کے مختلف حصوں میں جو قومیں گذری ہیں کتابوں میں ان کا مطالعہ کیا جائے اور ان زبانوں کے سیکھنے کی کوشش کی جائے جن سے زمین کی پرانی امتوں کے حال کے جاننے میں مدد مل سکتی ہے۔

تصحیح

(نواب سراج الدین احمد خاں سائل) کی پہلی قسط جو جون ۱۹۴۹ء کے نمبر میں شائع ہوئی ہے اس میں ص ۳۶۷ پر دوسری سطر کو صحیح کرکے یوں پڑھئے:۔

"تھے اور ایک مقدس بزرگ تھے) یہ حویلی بنیادی بیگم زوجہ نواب غلام حسین خاں مسرور نے"

اور صفحہ ۳۷۲ پر پانچویں اور چھٹی سطر کو درست کرکے یوں پڑھیئے:۔

"نواب احمد بخش خاں کے بھائی کی پوتی لکھا ہے وہ خورشید بیگم کے بطن سے مرزا اکبر علی خاں کی بیٹی تھی۔ خورشید بیگم کی ماں مبارک بیگم تھی جو جنرل اخترلونی کی داشتہ تھی اور جس کی بنوائی ہوئی لال مسجد دہلی میں"

(حفیظ الرحمن واصف)

قدرتی نظام اجتماع

از جناب مولوی محمد ظفیر الدین صاحب پورہ نوڈیہادی استاد دار العلوم معینیہ، سانحہ

بعض احباب کے حسب مشورہ اپنی کتاب "نظام مساجد" کا ایک باب پیش خدمت ہے خدا کرے یہ کتاب جلد طباعت کی منزل سے گذر کر اہل علم اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔

اب ذرا تفصیلی طور پر اس قدرتی حسنِ انتظام کی حکمتوں میں غور و فکر کرنا ہے کہ حضرت حق جل مجدہٗ نے نظامِ مساجد میں مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی دینی و دنیوی فلاح و نجاح کو کس عمدگی کے ساتھ جمع فرما دیا ہے۔

اجتماع کے مرکزی گھر | اس میں تو شبہ نہیں کہ مسجدوں کا قدرتی نظام ہی اس لئے قایم کیا گیا ہے کہ انتشار و تشتت اور نفاق و شقاق کا قلع قمع کر دیا جائے اور بکھرے موتیوں کو ایک سلک گہر میں پرو کر اللہ تعالیٰ کے مقدس دربار میں ایک صف اور ایک جماعت کے اندر بغلگیر کر دیا جائے اور پوری نیازمندانہ شان سے کھڑا کر کے دن رات کے پانچ وقتوں میں ان کی زبان سے یہ دعا بار بار دہرائی جائے۔

"اے وہ ذات کہ سب تعریفیں تجھ ہی کو زیبا ہیں ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان برگزیدہ بندوں کا راستہ جن پر تو نے انعام و اکرام فرمائے ان ملعون انسانوں کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہے اور نہ ان کا راستہ جو راہ راست سے بھٹک کر گمراہ ہیں"

یہی وجہ ہے کہ نماز کا درجہ توحید کے بعد ہی رکھا گیا ہے، اور اسلام کی بنیادی چیزوں میں اس کو خاص اہمیت دی گئی ہے پھر توحید کی جھلک جماعت کی نماز میں قایم رکھ کر مسجدوں کا نظام برپا کیا اور ان کے ذریعہ عبادت کی روح اور اطاعت کی جان کو اجاگر کیا،

مسجدوں کے مرکزی گھر ہونیکا ثبوت قرآن سے | قرآن پاک اور احادیث نبوی کے الفاظ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ نمازوں کی ادائیگی با جماعت مسجدوں ہی میں مطلوب ہے اور شریعت مطہرہ میں ان مسجدوں کو مرکزی گھر ہونے کی حیثیت حاصل ہے

مندرجہ ذیل آیتوں اور حدیثوں میں غور فرمائیں ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (اعراف - ۳)

اور سیدھا کرو اپنے چہروں کو ہر مسجد کے پاس، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طور پر کرو کہ عبادت اس کے لئے خاص ہے۔

اس آیت کے تحت "صاحب تفسیرات احمدی" تحریر فرماتے ہیں۔

ففی الایۃ دلیل علی فرضیۃ القیام فی الصلوٰۃ.... وادائھا فی المسجد وعدم اختصاص بمسجد ما

اس آیت سے نماز میں قیام کی فرضیت ثابت ہوتی ہے اور یہ کہ "وہ مسجد میں ادا کی جائے" ہاں وہ کسی خاص مسجد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے

ابوبکر جصاص لکھتے ہیں

والثانی فعل الصلوٰۃ فی المسجد وذالک یدل علی وجوب فعل المکتوبات جماعۃ لان المساجد بنیت للجماعات (احکام القرآن)

دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ "نماز مسجد میں پڑھی جائے جس سے پتہ چلا کہ فرض نماز با جماعت واجب ہے کیونکہ مسجدیں قیام جماعت کے لئے بنائی گئی ہیں۔

ان سے نمایاں طور پر ثابت ہوا کہ فرض نماز باجماعت مسجد میں ہونی چاہئے، کیونکہ تعمیرِ مساجد کا مقصد یہی ہے، دوسری آیت لب ولہجہ کو سامنے رکھتے ہوئے ملاحظہ ہو۔

فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ	ان گھروں میں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے
فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ	کہ ان کی تعظیم کی جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے
رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ	ان (مسجدوں) میں صبح و شام ایسے لوگ (نمازوں میں)
ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ	اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں جن کو اللہ کی یاد سے اور
(نور - ۵)	(بالخصوص) نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے سے نہ خرید
	غفلت میں ڈالنے پاتی ہے اور نہ فروخت۔

اس آیت کا طرزِ بیان بھی بتلاتا ہے کہ مسجدوں کا یہ واجبی حق ہے کہ اللہ کی دوسری عبادت اور نماز انہی میں ادا کی جائے کیونکہ بیوت سے مراد مسجد ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ جونہی فرض نماز کے لئے اذان پکاری گئی بازار والوں کی ایک جماعت سب چھوڑ چھاڑ مسجد چل کھڑی ہوئی، یہ منظر دیکھ کر آپ نے بے ساختہ فرمایا انہی لوگوں کے متعلق کتابِ مقدس کا اعلان ہے رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ الخ۔

احادیث سے ثبوت | اس باب میں حدیثیں بکثرت آئی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازیں مسجدوں ہی میں ادا کی جائیں، مسلم شریف کی ایک لمبی حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں جس کے راوی عبداللہ بن مسعودؓ ہیں

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علمنا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سنن ھدی کی
سنن الھدی وان من سنن الھدی	تعلیم فرمائی اور سنن ھدی سے ہی یہ ہے کہ نماز
الصّلوٰۃ فی المسجد الذی یوذن فیہ	اس مسجد میں ادا کی جائے جس میں اذان ہوتی ہو،
... وانکم لو صلیتم فی بیوتکم کما	اگر تم نے اپنے گھروں میں نماز پڑھی جیسا کہ یہ منافق

یصلی ھذا المتخلف فی بیتہ لترکتم سنۃ نبیکم ولو ترکتم سنۃ نبیکم لضللتم ص۲۳۲ ج۱ | اپنے گھر میں نماز پڑھتے ہیں تو یا شبہ تم نے اپنے نبی کی سنت ترک کر دی اور جس وقت تم نے اپنے نبی کی سنت ترک کر دی یقین کرو گمراہ ہوچکے ہو

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

صلوۃ الرجل فی الجماعۃ تضعف علی صلوتہ فی بیتہ وسوقہ خمسا وعشرین ضعفا وذالک انہ اذا توضأ فاحسن الوضوء ثم خرج الی المسجد (بخاری) | مرد کی جماعت کی نماز اس کی اس نماز سے جو اپنے گھر یا بازار میں پڑھے پچیس گونہ زیادہ ہے اور یہ اس لئے کہ اچھا وضو کیا اور پھر مسجد کو چلا۔

ثم خرج الی المسجد کا جملہ واضح دلیل ہے کہ جماعت کی نماز مسجد ہی میں مطلوب ہے چنانچہ اس سلسلہ میں ابن حجر رح لکھتے ہیں

مقتضاہ ان الصلوۃ فی المسجد جماعۃ تزید علی الصلوۃ فی البیت والسوق جماعۃ وفرادی (فتح الباری ص۹۳ ج۲) | اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جماعت کی نماز جو مسجد میں پڑھی جاتے وہ ثواب میں اس نماز سے بڑھی ہوئی ہے جو گھر اور بازار میں پڑھی جاتے خواہ باجماعت ہو خواہ تنہا تنہا

پھر مزید بحث کے بعد خلاصہ تحریر فرماتے ہیں

بل الظاھر ان التضعیف المذکور مختص بالجماعۃ فی المسجد (فتح الباری ص۹۳ ج۲) | بلکہ ظاہر بات یہ ہے کہ چند در چند ثواب کی زیادتی جو مذکور ہوئی وہ مسجد کی با جماعت نماز کے ساتھ مختص ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ باجماعت نماز کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

وکان الاسود اذا فاتتہ الجماعۃ ذھب الی مسجد آخر وجاء انس رضی الی مسجد قد صلی فیہ فاذن واقام وصلی جماعۃ (بخاری)

حضرت اسودؓ کی جب جماعت چھوٹ جاتی تھی تو جماعت کے لئے دوسری مسجد میں تشریف لیجاتے اور حضرت انسؓ ایک مسجد میں آتے جہاں جماعت ہو چکی تھی تو آپ نے پھر اذان پکاری اقامت کہی اور باجماعت نماز ادا کی

ان تعلیقات سے بھی معلوم ہوا کہ جماعت کی نماز کو مسجد کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے تب تو حضرت اسود رضی اللہ عنہ جماعت نہ ملنے کی صورت میں دوسری مسجد کا قصد فرماتے، اور وہاں جماعت سے نماز ادا کرنے کی سعی کرتے، گھر وغیرہ میں جماعت ثانیہ کا خیال تک نہ کرتے، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اس کے تحت رقمطراز ہیں۔

والذی یظھر لی ان البخاری قصد الاشارۃ باثر الاسودؓ وانسؓ الی ان الفضل الوارد فی احادیث الباب مقصور علی من جمع فی المسجد دون من جمع فی بیتہ ۔۔ لان الجمع لو لم یکن مختصا بالمسجد لجمع الاسود فی مکانہ ولم ینتقل الی مسجد اخر لطلب الجماعۃ ولما جاء انسؓ الی مسجد بن رفاعۃ (فتح الباری ج ۲)

مجھ پر جو کچھ ظاہر ہوا وہ یہ ہے کہ بخاریؒ نے حضرت اسود اور انسؓ کے اثر کو بیان کر کے اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہا ہے کہ جو فضیلت اور ثواب کی زیادتی اس باب کی حدیثوں میں مذکور ہے وہ اس باجماعت نماز کے لئے متعین ہے جو مسجد میں پڑھی جائے گھر کی جماعت کے لئے نہیں اگر جماعت کی نماز مسجد کے ساتھ مخصوص نہ ہوتی تو یقیناً حضرت اسودؓ اپنے مکان میں جماعت کرتے اور طلب جماعت کے لئے دوسری مسجد نہ جاتے اور نہ حضرت انسؓ ہی ابن رفاعہ

کی مسجد میں تشریف لائے۔

ان تصریحات کے بعد یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ جماعت کی نماز مسجد ہی میں مطلوب ہے اور مسجد کو اس باب میں خصوصیت حاصل ہے گھر میں با جماعت نماز مسجد چھوڑ کر پڑھی نہیں جاسکتی، یہی حافظ ابن حجرؒ ایک دوسری حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

والمقصود الاصلی فی الجماعۃ ایقاعھا فی المسجد (فتح الباری)	جماعت کا مقصد اصلی یہ ہے کہ وہ مسجد میں قائم کی جائے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں

در بدائع گفتہ کہ واجب است، بر حر، عاقل، بالغ کہ معذور نیست حاضر شدن بمسجد برائے جماعت، (اشعۃ اللمعات ص۴۴۶ ج ۱)	بدائع میں ہے کہ آزاد، عاقل، بالغ جو معذور نہیں ہے اس پر جماعت کی نماز کے لئے مسجد میں حاضر ہونا واجب ہے۔

حافظ ابن قیمؒ تو تصریح فرماتے ہیں کہ عذر شرعی کے نہ ہونے کی شکل میں جماعت کی نماز کے لئے مسجد کی حاضری فرض عین ہے البتہ جب کوئی عذر شرعی درپیش آجائے تو مسجد کی حاضری لازمی نہیں رہتی، ان کے الفاظ یہ ہیں۔

ومن تامل السنۃ حق التامل تبین لہ ان فعلھا فی المساجد فرض علی الاعیان الا لعارض یجوز معہ ترک الجمعۃ والجماعۃ فترک حضور المسجد لغیر عذر کترک اصل الجماعۃ لغیر عذر (کتاب الصلوۃ ص۱۰۶)	جن لوگوں نے سنت میں پورے طور پر غور وفکر کیا ہوگا ان پر یہ بات منکشف ہو گئی ہوگی کہ نماز باجماعت کی ادائیگی مسجد میں فرض عین ہے البتہ اگر کوئی ایسا عارض درپیش آجائے کہ جمعہ اور جماعت کا ترک جائز ہوجائے تو دوسری بات ہے ورنہ بغیر عذر شرعی مسجد کی حاضری کا ترک ایسا ہی ہے کہ کوئی بغیر عذر شرعی اصل جماعت چھوڑ دے۔

ان کی یہ رائے متعدد حدیثوں کے اسلوب بیان کے پیش نظر ہے، اگر ان کے حنبلی ہونے کی وجہ سے فرض عین ہونے کو نہ بھی مانئے تو اس کے وجوب اور اہم ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے کیونکہ یہ وہ چیز ہے جس کو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی بھر نباہا اور مسجد حاضر نہ ہونیوالوں پر شدید ترین غصہ کا اظہار فرمایا۔ آپ کے صحابہ کرام کا عمل بھی یہی رہا جس کی تفصیل ابھی آرہی ہے

افضل الرسل کا دستور | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حافظ ابن قیمؒ جیسے ذمہ دار کا بیان ہے

ان هدیہ صلعم کان فعل الفرائض فی المسجد الا لعارض من سفر او مرض او غیرہ مما یمنعه من المسجد (زاد المعاد ج ۱ ص ۱۴)	رحمت عالم صلعم کا دستور یہ تھا کہ آپ فرض نماز یں مسجد میں ادا کرتے مگر کوئی مجبوری پیش آجاتی جو مسجد سے رکدیتی، جیسے سفر اور بیماری وغیرہ جس میں بالکل طاقت نہیں رہتی)

قیامت کے دن " دیدار الٰہی " جو سب سے بڑی نعمت ہے اس کے لئے جب اجتماع ہوگا تو ان میں ان لوگوں کو جو بہ پابندی مسجد جاکر امام کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں ممتاز جگہ حاصل ہوگی (زاد المعاد ۲۱۱)

ایک صحابی کا وعظ | جیسا کہ عرض کیا گیا صحابۂ کرام کا جوش عملی جماعت کے باب میں جو تھا وہ اپنی جگہ تفصیل سے انشاء اللہ آئیگا مگر یہاں صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے جس سے عہد نبوی میں حاضری مسجد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ اس کو کس قدر اہمیت حاصل تھی، حضرت عتاب بن اسیدؓ مکہ کے گورنر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر جب مکہ پہنچی، تو یہ پہلے مارے خوف کے چھپ گئے اس وقت حضرت سہیل بن عمرو نے خطبہ دیا ان کو جب یہ معلوم ہوگیا کہ اہل مکہ اسلام پر علی حالہ قایم ہیں تو حضرت عتابؓ کو نکالا اور انھوں نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا

یا اهل مكة واللہ لا يبلغني ان احدا منکم متخلف عن الصلاة فی المسجد	اے اہل مکہ! خدا کی قسم اگر مجھے یہ خبر پہنچی کہ تم میں کا کوئی قصداً جماعت کی نماز کے لئے مسجد نہیں آیا

فی الجماعۃ الاضربت عنقہ	تو میں اس کی گردن مار دوں گا۔

(کتاب الصلوٰۃ لابن القیم ص۱۱۲)

یہ سن کر اہل مکہ ان کے بہت ممنون ہوتے اور ان کی اس تقریر کو بہت سراہا ــــــ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی دوربین نگاہ میں مسجد کی حاضری کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔

نماز مسجد میں ادا کرنا شعار دین ہے | اس سلسلہ میں اب زیادہ طول دینا مناسب نہ ہوگا مگر یہ ذکر فائدے سے خالی نہیں کہ علماء نے انہی وجوہ کی بناء پر مسجد کے اندر جماعت کی نماز کو شعار دین قرار دیا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ کے الفاظ ہیں

فان الصلاۃ فی المسجد من اکبر شعائر	بلاشبہ مسجد میں جمع ہو کر نماز ادا کرنا دین کا ایک بڑا
الدین وعلاماتہ (کتاب الصلوٰۃ ص۱۱۳)	شعار اور اس کی علامت ہے۔

نظم جماعت اور اس کی اہمیت | مسجد کے اندر نماز باجماعت کی جو حیثیت ہے اور مسجد کو نماز سے جو گہرا تعلق ہے اس کے ثابت ہو جانے کے بعد بتلانا ہے کہ جماعت کی نماز کو شریعت میں کیا خصوصیت و مرکزیت حاصل ہے اور اس کی تاکید قرآن و حدیث میں کس اہمیت کے ساتھ آئی ہے۔

قرآن میں حکم | اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۱) وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (بقرہ)	اور نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے ساتھ

اس آیت سے مفسرین نے جماعت کی نماز ثابت کی ہے، بیضاوی شریف میں ہے

وارکعوا مع الراکعین ای فی جماعتھم	اور نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے ساتھ یعنی ان
فان صلوٰۃ الجماعۃ تفضل صلوٰۃ الفذ	کی جماعت کے ساتھ، کیونکہ جماعت کی نماز منفرد
بسبع وعشرین درجۃ لما فیھا من	کی نماز پر ستائیس درجہ فضیلت رکھتی ہے اس لئے

تطاھر النفوس (ج ۱ ص) کہ اس میں باہمی تعاون ہے ۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں ۔

وثانیھا ان المراد صلوا مع المصلین	دوسرا مطلب یہ ہے کہ نماز، نماز پڑھنے والوں کے
وعلی ھذا الیزول التکرار فی الاول	ساتھ پڑھو، اس مطلب کے لینے میں تکرار بھی ختم
امر تعالی باقامتھا وامر فی الثانی بفعلھا	ہو جائیگا گویا پہلی آیت میں اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا اور
فی الجماعۃ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۳۲)	دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز با جماعت کا حکم

فرمایا ۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ رکوع سے مراد یہاں نماز کا لینا جائز ہے جس طرح سجود کا استعمال نماز کے لئے ہوتا ہے اور معنی یہ ہونگے کہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھا کرو ۔ پھر ما حصل لکھتے ہیں

کانہ قیل واقیموا الصلوۃ وصلوھا مع	گویا یہ حکم دیا گیا کہ نماز برپا کرو اور اسے با جماعت ادا
المصلین لا منفردین (کشاف ج ۱ ص ۵۳)	کرو ۔ اکیلا اکیلا نہ پڑھو ۔

اس آیت سے جماعت ہی کی نماز اس لئے مراد ہے کہ اس سے پہلے بالکل متصل اقیموا الصلوٰۃ کی آیت آچکی ہے جس میں اقامتِ نماز کا حکم ہے جس کی طرف امام رازی نے اشارہ بھی کیا ہے اگر رکوع کے کئی معنی نہ ہوتے تو جماعت کی فرضیت کا ثبوت ہوتا، مگر چونکہ متعدد معنی ہیں اس لئے وجوب یا کم از کم سنت موکدہ کا ثبوت تو بہر حال ہوگا ۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

"خلاصہ یہ ہے کہ پنجوقتہ جماعت ہر ہر فرد پر سنت موکدہ ہے جو بغیر عذر شرعی جیسے بیماری سفر، بارش، آندھی اور طوفان کے ترک نہیں کی جا سکتی ہے اور تمام مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے اگر کل کے کل جماعت کے ترک پر اصرار کریں گے تو سب گنہگار ہوں گے کیونکہ یہ سنت شعار دین ہے۔"
(تفسیر عزیزی فارسی سورۃ بقرہ ص ۱۳۱)

(۲) وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ (نساء - ۱۵)

اور آپ جب ان میں تشریف رکھتے ہوں پھر آپ ان کو نماز پڑھانا چاہیں تو چاہیے کہ ایک گروہ ان میں سے آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے ہتھیار وہ لوگ لے لیویں۔

اس آیت کے سلسلہ میں صاحب "التعلیق الصبیح" لکھتے ہیں۔

امرهم بالجماعة يدل على وجوبها حال الامن بالاولى (ص ۲۴ ج ۲)

اللہ تعالیٰ کا حالت خوف میں جماعت کا حکم دینا دلیل ہے کہ حالت امن میں جماعت بدرجہ اولیٰ واجب ہوگی

تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

وما احسن ما استدل به من ذهب الى وجوب الجماعة من هذه الاية الكريمة (ص ۵۴۷ ج ۱)

اس آیت کریمہ سے جو لوگ جماعت کے وجوب کی طرف گئے ہیں ان کا استدلال بہت ہی خوب ہے

(۳) وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ (یس - ۱)

اور ہم لکھتے جاتے ہیں ان اعمال کو جو وہ آگے بھیجتے ہیں اور ان کے قدم کے نشانوں کو بھی

اى آثار اقدامهم الى المساجد (التعليق الصبيح ص ۲۴ ج ۲)

یعنی ان کے قدموں کے نشان جو مسجد جانے میں ہوتے ہیں۔

علماء نے ان کے علاوہ اور آیتوں سے جماعت کا وجوب ثابت کیا ہے، مگر میں نے انہی ان آیتوں پر اکتفا کیا کہ یہ مطلب کے حصول کے لئے کافی ووافی ہے۔

احادیث میں شدید تاکید اس باب میں احادیث بکثرت آئی ہیں، جن سے جماعت کا لزوم، اس کی فضیلت اور تاکید نمایاں طور پر معلوم ہوتی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال والذی نفسی بیده لقد هممت ان آمر بحطب فیحطب ثم آمر بالصلوٰة فیوذن لها ثم آمر رجلا فیوم الناس ثم اخالف الی الرجال فاحرق علیهم بیوتهم والذی نفسی بیده لو یعلم احدهم انه یجد عرقا سمینا او مرماتین حسنتین لشهد العشاء (بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں مری جان ہے جی چاہتا ہے کہ لکڑیوں کے ڈھیر کرنے کا حکم دوں پھر نماز کے لئے اذان پکار دی جائے اس کے بعد کسی کو لوگوں کا امام بنا دوں پھر لوگوں کو جا کر دیکھوں اور جو اس وقت گھر میں مل جائیں ان کو جلا ڈالوں خدا کی قسم ان کا حال یہ ہے کہ اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ موٹی ہڈی یا دو کھر نہی مل جائیں گے تو پھر وہ ضرور عشا میں بھی حاضر ہوں گے۔

اس حدیث میں الرجال سے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو بے نمازی ہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو مسجد چھوڑ کر بغیر عذر شرعی اپنے گھروں میں نماز پڑھتے ہیں جیسا کہ مسلم شریف کی مندرجہ ذیل حدیث میں وضاحت ہے۔

لقد هممت ان آمر فتیتی فیجمعوا الی حزما من حطب ثم اٰتی قوما یصلون فی بیوتهم لیست بهم علة فاحرقها علیهم (مسلم)

بلاشبہ جی چاہتا ہے کہ جوانوں کو حکم دوں کہ وہ مرے پاس لکڑیاں ڈھیر لگا دیں پھر میں ان میں جاؤں جو اپنے گھروں میں بلا عذر نماز پڑھتے ہیں اور ان کو گھر سمیت پھونک ڈالوں۔

ان حدیثوں کے ضمن میں امام احمد بن حنبل رح لکھتے ہیں۔

فلولا ان تخلفهم عن الصلوٰة فی المسجد معصیة کبیرة عظیمة لما هددهم النبی صلی الله علیه وسلم بحرق منازلهم (کتاب الصلوٰة ص۱۱ امام احمد)

اگر مسجد میں جماعت کی نماز سے غیر حاضری گناہ کبیرہ نہ ہوتی تو آنحضرت صلعم انکے گھروں کے جلانے کی تہدید (دھمکی) نہ فرماتے۔

یہی حدیث میں "لشہدن العشاء" کا جملہ بتا رہا ہے کہ یہ تاکید اور ساتھ ہی تہدید وقتی نمازوں کے لئے بھی ہے۔ صرف یہ جمعہ کی نماز کی تاکید کے لئے نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے۔ مسلم شریف میں ایک لمبی حدیث ہے جس سے مسئلہ کی اہمیت خوب ذہن نشین ہو جاتی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں

لقد رأیتنا ما یتخلف عن الصلوٰۃ الا المنافق قد علم نفاقہ او مریض ان کان المریض لیمشی بین رجلین حتی یاتی الصلوٰۃ وقال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علمنا سنن الھدی وان من سنن الھدی الصلوٰۃ فی المسجد الذی یؤذن فیہ وفی روایۃ قال من سرہ ان یلقی اللہ تعالی غدا مسلما فلیحافظ علی ھؤلاء الصلوات حیث ینادی بھن فان اللہ شرع لنبیکم سنن الھدی وانھن سنن من الھدی وان کنتم صلیتم فی بیوتکم کما یصلی ھذا المتخلف فی بیتہ لترکتم سنۃ نبیکم ولو ترکتم سنۃ نبیکم لضللتم وما من رجل یتطہر فیحسن الطہور ثم یعمد الی المسجد من ھذہ المساجد الا کتب اللہ لہ بکل خطوۃ یخطوھا حسنۃ.....

بلاشبہ ہمیں معلوم ہے کہ بجز کھلے ہوئے منافق یا بالکل نڈھال بیمار کے اور کوئی جماعت کی نماز سے نہیں پیچھے رہتا ہے مگر جو بیمار بھی ہے وہ بھی دو شخصوں کے سہارے چل کر نماز کے لئے مسجد میں آتے ہیں اور انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "سنن ہدیٰ" کی ہمیں تعلیم فرمائی اور بیشک اس مسجد میں نماز پڑھنا جس میں اذان دی جائے سنن ہدیٰ ہی سے ہے ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا جس کو یہ بات خوش لگتی ہے کہ وہ کل (بعد موت) اللہ تعالیٰ سے حالت اسلام ہی ملے تو اس کو چاہئے کہ تمام نمازوں کے لئے جونہی اذان پکاری جائے مسجد میں حاضری دے بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لئے سنن ہدیٰ کو مشروع فرمایا ہے اور انھیں سے نمازیں ہیں اور اگر کہیں، تم نے بھی منافق کی طرح گھروں ہی میں نماز پڑھ لی تو بالیقین تم نے اپنے نبی صلعم کی سنت ترک

(باقی آئندہ)

ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل

(۳)

(از جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف دہلی)

اس خاندان سے مرزا غالب کے جو روابط اور محبت و مودت کے تعلقات تھے وہ مرزا کے کلام اور خطوط سے واضح طور پر معلوم ہو جاتے ہیں اور مرزا سے رشتہ کے لحاظ سے بھی کئی وابستگیاں تھیں۔

سائل مرحوم کے جد امجد نواب ضیاء الدین احمد خاں کی چچازاد بہن امراؤ بیگم غالب کی رفیقۂ زندگی تھیں۔ سائل مرحوم کے پر دادا نواب احمد بخش خاں کی بہن مرزا غالب کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ کو منسوب تھیں سائل کی پھوپھی معظم زمانی (عرف بگا بیگم) باقر علی خاں کامل بن عارف کو منسوب تھیں۔

امراؤ بیگم کی بہن بنیادی بیگم کے صاحبزادے عارف غالب کے متبنّیٰ کو سائل مرحوم کے والد کی پھوپھی نواب بیگم منسوب تھیں مرزا زین العابدین خاں عارف اپنے والد اور اپنی والدہ دونوں سلسلوں کے لحاظ سے سائل صاحب کے چچا ہوتے ہیں اس طرح مرزا غالب سائل صاحب کے دادا ہوتے ہیں ؎

"غالب میرے دادا تھے غالب کا میں پوتا ہوں"　　(سائل مرحوم)

فرماتے تھے کہ جب میری عمر پانچ سال کی تھی اپنے دادا کے ساتھ مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مرزا صاحب نے مجھے کھانے کی کوئی چیز دی اور خود کسی کام کے لئے

اُٹھ گئے اس وقت مرزا کے سامنے کوئی قلمی کتاب تھی جس کا وہ مطالعہ کر رہے تھے اُٹھتے وقت کتاب کھلی چھوڑ دی میں نے کھانے کی چیز کو اسی کتاب پر رکھکر شوق فرمایا۔ اتنے میں دادا آ گئے اور ناراض ہونے لگے مرزا غالب نے یہ دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ اور نواب صاحب سے کہا کہ میاں میرا بچہ تو امتحان کی تیاری کر رہا ہے اور تم اس کو ڈانٹ رہے ہو۔ ورق خراب ہو چکا تھا کچھ جھاڑ پونچھ کر کتاب کو رکھدیا گیا۔ پھر مرزا نے مجھ سے کہا کہ تم اپنے دادا سے فارسی پڑھتے ہو تو ایک شعر کا مطلب تو بتاؤ وہ شعر مجھے یاد نہیں رہا۔ بہر حال کوئی آسان اور سہل شعر تھا۔ میں اس کا مطلب واضح نہ کر سکا تو پھر خود مجھے سمجھانے کی کوشش فرمائی۔

سائل صاحب کا خاندان بلحاظ تہذیب و متانت، وسعت اخلاق اور علم و ادب کے ہندوستان کے ممتاز ترین خاندانوں میں سے تھا۔

سائل کو تم نہ چشم حقارت سے دیکھنا نواب پانچ پشت سے اس کا خطاب ہے

اس خاندان کی روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے۔

ایں سلسلہ طلائے ناب است ایں خانہ تمام آفتاب است

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں

نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب

شجاع الدین احمد خاں تاباں (۲ ولد) شوہر [illegible] بیگم بنت باقر علی خاں

بہاء الدین احمد خاں طالب شوہر زبیدہ بیگم

سراج الدین احمد خاں سائل شوہر ممو بیگم و بعد ازاں لاڈلی بیگم

ممتاز الدین احمد خاں مائل شوہر اول لاڈلی بیگم

اختری بیگم زوجہ نواب میر امیر الدین احمد عرف [illegible] مرزا

محمود سلطان بیگم بیگم ذوالفقار علی خاں

معظم مرزا ملتجی خورد سال از بطن زوجہ اول

قدسیہ بیگم ولادت [illegible] وفات [illegible]

مرزا قطب الدین محمد میاں [illegible] ولادت [illegible]

غلام نظام الدین محبوب میاں ولادت ۱۹۱۴ء وفات ۱۹۲۳ء

غلام فرید الدین ولادت ۱۹۲۱ء ۶ ماہ کی عمر پائی

ناصر الدین احمد خاں

نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے چار بیٹے تھے۔ اول مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ دوم مرزا بہاء الدین احمد خاں طلبؔ، سوم مرزا سراج الدین احمد خاں سائلؔ چہارم مرزا ممتاز الدین احمد خاں مائلؔ اور ایک بیٹی تھیں اختری بیگم۔

مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں | بروز سہ شنبہ ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مادۂ تاریخ "نور چشم نور چشیم" کہا۔[1] علوم مشرقی میں معقول دستگاہ رکھتے تھے شعر و سخن میں نواب حسین علی خاں شاداںؔ مرحوم اور اپنے دادا سے مستفید ہوکر بہت زود گو تھے کلام میں مرزا غالبؔ کا رنگ غالب تھا۔ داغؔ کے رنگ کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ نہایت مغلوب الغضب تھے اور گالیاں عجیب و غریب قسم کی ایجاد کرتے تھے۔ جملہ اصناف سخن میں دخل رکھتے تھے اپنا کلام سنانے کے لئے کسی نہ کسی کو پکڑ لیتے تھے اور گھنٹوں سناتے رہتے تھے۔ اور داد چاہتے تھے۔ اگر کوئی شخص داد نہ دے یا ان کو استاد کے لفظ سے خطاب نہ کرے تو وہ اس کو نااہل سمجھتے تھے۔

حضرت نوحؔ ناروی فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ جبکہ میں حضرت سائلؔ کے دولت خانے پر بطور مہمان مقیم تھا تاباںؔ صاحب بھی سائلؔ صاحب کے مکان پر موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنے گھر جانے لگے اور مجھ کو پکڑ لیا کہ میرے گھر چلو میں نے عرض کیا کہ ابھی کھانا نہیں کھایا ہے اور آپ کے ہاں جا کر معلوم نہیں کس وقت واپسی ہو فرمایا میرے ساتھ کھا لینا جب میں ان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا تو سائلؔ صاحب نے چپکے سے مجھ کو خدا حافظ کہا۔ میں نے تعجب کے ساتھ سائلؔ صاحب کے چہرے کو دیکھا۔ سائلؔ صاحب نے زیر لب مسکرا کر فرمایا کہ زندگی ہے تو بچ کر آجاؤ گے۔ چنانچہ میں طوعاً و کرہاً تاباںؔ صاحب کے ہاں گیا۔ دوپہر کا وقت تھا بھوک

---

[1] صحیفۂ زریں

لگ رہی تھی گھر جاکر تاباں صاحب نے نوکروں کو کچھ ہدایات دیں اور مجھ کو غزل سنانے لگے جب دس بارہ غزلیں سنا چکے تو نوکر کھانا لے کر آیا۔ فرمایا رکھ دے۔ وہ غزلیں سناتے چلے جاتے تھے اور میرا بھوک کے مارے برا حال تھا میں نے عرض کیا اب کھانا کھا لیجئے۔ مگر وہاں تو استغراق کی کیفیت تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر میں نے تقاضا کیا فرمایا تم کھا لو چنانچہ مجبور ہو کر میں نے تنہا کھانا کھایا۔ اور وہ غزلوں پر غزلیں سناتے رہے اس طرح انھوں نے غالباً ۳۰، ۳۵ غزلیں سنائیں = خدا کی پناہ شطرنج بھی بہت عمدہ کھیلتے تھے اور اس میں بھی انہماک کا یہی حال تھا۔

نہایت وجیہ اور خوبصورت، وسیع الاخلاق اور مشرقی تہذیب اور بالخصوص دہلی کی روایتی اور خاندانی شرافت کے نمونہ تھے۔ سائل صاحب ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

۷ راپریل ۱۹۱۶ء کو ہاپوڑ کے مقام پر ابن علی صاحب رفیق نے جو مشاعرہ منعقد کیا تھا اس میں نواب احمد سعید خاں طالب اور نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں بھی تشریف لے گئے تھے مگر اسٹیشن پر ان کے لئے سواری کا کوئی خاطر خواہ انتظام منتظمین مشاعرہ نے نہیں کیا جس سے ان کو تکلیف پہنچی بہرحال اسٹیشن سے ایک بگھی میں سوار ہو کر مقام مشاعرہ کی طرف چلے۔ راستے میں گھوڑا بھڑک گیا اسٹیشن واپس آ گئے اور دہلی روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن پر حضرت نوح ناروی موجود تھے تاباں صاحب نے دیکھ کر لپٹا لیا اور فرمایا ایک مطلع ہوا ہے اُسنایا۔ نوح صاحب نے داد دی فرمایا کہ اگر مشاعرہ میں پڑھتا تو چھتیں اُڑ جاتیں نوح صاحب نے فرمایا حضرت آپ کیا فرماتے ہیں بلکہ آسمان پھٹ جاتا اس کے بعد عرض کیا کہ چچا جان تو ناراض ہو کر واپس جا رہے ہیں آپ کیوں ——— تشریف لے جا رہے ہیں۔ فرمایا چچا جان کو چھوڑ کر میں مشاعرے میں کس طرح شریک ہو جاؤں؟ چنانچہ دونوں چچا بھتیجے دہلی واپس آ گئے۔

---

[1] یہ واقعات حضرت نوح ناروی سے معلوم ہوئے۔

تاباںؔ اور سائلؔ سے حکیم اجمل خاں کے بالکل برادرانہ تعلقات تھے۔ حکیم صاحب کے دیوان خانے میں عام طور پر رات کے وقت مجلسِ احباب ہوتی تھی اس میں ہر دو حضرات اکثر شریک ہوتے تھے اور دیگر مشاغل و تبادلہ خیالات کے ساتھ شعر و سخن کا شغل بھی ہوتا تھا۔ تاباں صاحب سے حکیم صاحب نے کچھ فارسی کلام میں اصلاح بھی لی تھی۔ تاباں داغ کے کلام کو بازاری کلام کہتے تھے اور ان کے کلام کی تعریف سے چڑ جاتے تھے حکیم صاحب گاہ گاہ اپنی مجلس میں یہ لطیف مذاق اس طرح کیا کرتے تھے کہ خود تو نہیں مگر کسی دوسرے شخص کو اشارہ کر دیتے تھے جو مجلس میں اسوقت تک داغ کے کلام کی تعریف کرتا جب تک تاباں مشتعل نہ ہو جاتے۔ بالعموم آدابِ مجلس کے پابند تھے مگر جب مشتعل ہو جاتے تھے تو پھر کسی کا احترام ملحوظ نہ رہتا تھا جو موقعہ میں آتا تھا برملا کہتے تھے۔ جس وقت یہ جنگ تاباں اور سائل دونوں بوڑھے بھائیوں میں واقع ہوتی تھی تو انسانی طاقت کا کام نہ تھا کہ ہنسی کو ضبط کر سکے۔ ۱۹۱۳ء میں جبکہ حکیم صاحب تبدیل آب و ہوا کی غرض سے اوکھلے میں قیام پذیر تھے یہ دونوں بھائی اور دیگر اراکین مجلس وہاں جمع ہو گئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر مجلس مشاعرہ گرم رہی، احباب کی جانب سے ان کے بہترین طرز ادا اور معنوی خوبیوں پر داد سخن ہو رہی تھی اس دوران میں حکیم صاحب نے سائلؔ صاحب کو اشارہ کیا، وہ حکیم صاحب کا منشاء سمجھ گئے اور دوزانو ہو کر داغ کا کچھ کلام پڑھا اور مافوق العادت الفاظ میں تعریف کرنی شروع کی۔ تاباںؔ صاحب کا پارہ چڑھنا شروع ہوا۔ پھر سائلؔ صاحب نے بھائی کی طرف رخ کر کے عرض کیا بھائی صاحب گستاخی معاف ہو داغ کی طرح شعر کہنا کوئی خالہ جی کا گھر تو نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت داغؔ نازک خیالی اور جذبات آفرینی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے اور قادر الکلام بھی ایسے تھے کہ ایک گھنٹے میں پچاس شعر بلا تکلف لکھ دیتے تھے بھلا تاباںؔ میں اتنی تاب کہاں تھی کہنے لگے ابے تجھ کو شعر سمجھنے کی اور اس کو شعر کہنے کی لیاقت ہی کیا ہے۔ کیا قلم برداشتہ شعر لکھنا ہی معیارِ سخندانی ہے۔ اگر یہی ہے تو مصرع

کہہ - جناب سائلؔ نے ادب کے ساتھ مصرع دیا۔ سنتے ہی ادنی تامل کے ساتھ تاباں نے یہ شعر پڑھا

عدو میرا نہ تو میرا نہ چرخ فتنہ جو میرا　　　شفق بن کر چڑھا ہے چرخ کے سر پہ لہو میرا

شعر سنتے ہی مجلس پھڑک اٹھی حکیم صاحب نے کھڑے ہو کر تاباںؔ کو گلے لگالیا تاباںؔ کا یہ حال تھا کہ فرطِ غضب سے آنکھیں سُرخ تھیں منہ سے کف جاری تھا ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے پنکھا جھلا گیا - پانی کے چھینٹے دیتے گئے جب ذرا حواس بجا ہوئے تو بے تحاشا گالیاں دینی شروع کیں - سائلؔ صاحب ہاتھ باندھے سر جھکائے ہوئے سب کچھ سُنتے رہے جب تھک گئے تو کہنے لگے کہ اب زیادہ گالیاں دینے کی طاقت نہیں رہی لہٰذا چوٹی کی ایک گالی اور دیتا ہوں کہ شہاب الدین کے نطفے سے یا میں نہیں یا تو نہیں[۱]۔

حکیم صاحب چونکہ خود بھی نہایت سخن فہم اور سخن سنج ادیب اور شاعر تھے اس لئے ان دونوں حضرات کی بہت قدر کرتے تھے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ حکیم صاحب ہر اہلِ علم کے سچے قدرداں اور محب تھے۔

حضرت تاباںؔ کی شادی مرزا باقر علی خاں کاملؔ بن عارفؔ کی بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم (عرف جندو بیگم) سے ہوئی تھی۔

کچھ عرصے حیدرآباد میں بھی وظیفہ خوار رہے اور آخر میں مستقل طور پر دہلی میں رہنے لگے تھے پھر دلی میں اپنے دادا کے پائنتی اور چچا کے پہلو میں دفن ہوئے۔

آپ کی اہلیہ محترمہ بقید حیات ہیں اور محلہ بلیماراں میں سکونت پذیر ہیں - اولاد کوئی نہیں ہوئی - تاباںؔ کے انتقال کے بعد ان کی بیگم صاحبہ سے سائلؔ مرحوم کے کچھ خاندانی منافشات اور قانونی کشمکش بھی چلتی رہی اور یہ اختلاف آخر تک رہا مگر سائلؔ صاحب کے انتقال کے وقت جب

---

[۱] حیات اجمل مصنفہ شفاء الملک ص ۱۹۲ مصنف حیات اجمل نے شہاب الدین کے بجائے ریاض الدین لکھا ہے یہ غلط ہے

بیگم تاباں سے سائل صاحب کو مہر دلی میں دفن کرنے کی اجازت لی گئی تو انھوں نے نہایت فراخدلی سے اجازت دے دی اور فرمایا میرا اس کا اختلاف زندگی تک تھا اب کوئی اختلاف نہیں[1]۔

مرزا بہاء الدین احمد خاں طلبؔ | نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے منجھلے صاحبزادے مرزا بہاء الدین احمد خاں طلب تھے بروز شنبہ ۳ رشعبان ۱۲۷۹ھ مطابق ۲۴ رجنوری ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مادہ تاریخ کہا ابوالاعیان نور الدین علی خاں ۱۲۷۹ھ، ابتداء میں مرزا علی حسین خاں شاداں اور میرزا عبدالغنی ارشد سے استفادہ کرتے رہے دہلی میں پولیس انسپکٹر تھے ان کی شادی زبیدہ بیگم سے ہوئی تھی صرف ایک صاحبزادی محمود سلطان بیگم چھوڑیں جو سرذوالفقار علی خاں کو منسوب ہیں۔ محمود سلطان بیگم کے دو صاحبزادے رشید علی خاں خورشید علی خاں اور دو صاحبزادیاں قدسیہ سلطان قیصر سلطان مجھے معلوم ہیں۔ مرزا طلب کا انتقال ریاست اوجین میں ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔

حضرت سائل مرزا بہاء الدین سے چھوٹے اور ان سے چھوٹے مرزا امتیاز الدین احمد خاں مائل تھے۔ مرزا عبدالغنی ارشد سے اصلاح لیتے رہے۔ انکا نکاح داغ کی سالی کی نواسی (لاڈلی بیگم) سے ہوا جو داغ کی منھبولی بیٹی ہیں۔ ان کے صاحبزادے مرزا ناصر الدین عرف ناصر مرزا ہیں مائل صاحب کے انتقال کے وقت ناصر مرزا کی عمر تقریباً ۵ سال تھی۔ مائل صاحب قدم شریف میں مدفون ہیں۔

لاڈلی بیگم کے بیوہ ہو جانے کے بعد سائل صاحب کی والدہ نے یہ مناسب سمجھا کہ گھر کے گھر میں ہی یہ رشتہ ہو جائے تو بہتر ہے چنانچہ سلسلہ جنبانی کی گئی۔ ریاست نظام کا قانون یہ تھا کہ بیوہ کا نکاح ثانی ہو جانے پر اس کا منصب جو ریاست سے ملتا تھا، بند ہو جاتا تھا مگر عین عالم شباب میں بیوہ ہو جانے کے معاملے کی نزاکت کو زیادہ اہمیت دی گئی حضرت سائل صاحب اپنی پہلی بیوی امیر بیگم کو طلاق دے چکے تھے بنا بریں ان کے ساتھ نکاح کر دیا گیا۔ ادھر حضور نظام کو داغ صاحب نے

---

[1] اس واقعہ کے راوی محمد یعقوب خاں صاحب ہیں جو کٹرہ بجاریاں (متصل یونانی دواخانہ) میں رہتے ہیں [2] صیغہ راز

لکھا کہ خادم زادی جو ممتاز الدین احمد خاں کی بیوہ ہے چونکہ عالمِ جوانی میں بیوہ ہوگئی ہے اس لئے معاملے کی نزاکت کو محسوس کرکے اس کے جیٹھ سراج الدین احمد خاں سائلؔ سے اس کا نکاح کردیا گیا ہے اس کے منصب کے بارے میں جو کچھ بندگانِ عالی کا حکم ہو وہ تسلیم ہے۔"

حضور نظام نے تمام ممالک محروسہ میں حکم جاری کردیا کہ بیوائیں اپنا نکاح ثانی کرسکتی ہیں ان کا منصب جاری رہے گا یہ امر حضور نظام کی غربا پروری اور خاص کر استاد نوازی کی ادنیٰ مثال ہے۔ حضرت داغؔ کے معاملے میں حضور نظام جس خراخدلی اور عزت افزائی کا ثبوت دیتے تھے اس کو شیفتگی اور عشق کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

یہ نکاحِ ثانی ۱۹۰۱ء میں ہوا۔ اس وقت سائلؔ صاحب کی عمر تقریباً ۴۲ سال اور بیگم صاحب کی عمر تقریباً ۱۹ سال تھی۔ مرزا ناصر الدین نے سائلؔ صاحب کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت حاصل کرنی شروع کی جب حضرت داغؔ کا ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا تو کچھ عرصے کے بعد سائلؔ صاحب مع اہل و عیال کے دہلی چلے آئے۔

نواب شہاب الدین احمد خاں کی صاحبزادی جو اپنے چاروں بھائیوں سے چھوٹی تھیں جن کا نام اختری بیگم تھا یہ نواب سراج الدین احمد خاں (عرف فرخ مرزا) بن نواب علاء الدین احمد خاں کو منسوب تھیں[۱]۔

ان کے چار صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں مجھے معلوم ہیں۔ نواب معز الدین[۱] اکبر مرزا (جن کی ولادت ۱۸۶۵ء اور وفات ۱۹۱۰ء میں ہوئی) نواب اعز الدین[۲] اعظم مرزا (جن کی ولادت ۱۸۸۹ء کی ہے اور وفات ۱۹۴۳ء قدم شریف میں مدفون ہیں) نواب اعزاز الدین[۳] شاہرخ مرزا (جن کی ولادت ۱۸۹۳ء کی ہے) نواب اعتزاز الدین[۴] ہمایوں مرزا موجودہ فرمانروائے ریاست لوہارو نواب امین الدین احمد خاں

---

[۱] یہ حالات میں نے کچھ اپنی سابقہ معلومات سے اور کچھ محترمہ استانی صاحبہ سے دریافت کرکے لکھے ہیں۔

ثانی نواب اعز الدین اعظم مرزا کے خلف رشید ہیں۔

فخری بیگم زوجہ نواب مانگرول ملقیس بیگم زوجہ نواب احمد نواز خاں ڈیرہ اسمٰعیل خاں شہر بانو بیگم زوجہ نواب ابراہیم علی خاں نواب پاٹودی مہر بانو بیگم زوجہ نواب قطب الدین خاں محمد نواب افتخار علی خاں موجودہ والی پاٹودی ابن نواب ابراہیم علی خاں ہیں۔

یہ جناب سائلؔ صاحب کی بھانجی شہر بانو بیگم کے صاحبزادے ہونے کے لحاظ سے سائلؔ صاحب کے نواسے ہوتے ہیں اختری بیگم زوجہ نواب سراامیر الدین کا انتقال محرم ۱۳۲۹ھ میں ہوا قدم شریف دروازے کے دائیں جانب اونچے چبوترے پر مدفون ہیں۔

نواب ابوالمعظم مرزا سراج الدین احمد خاں سائلؔ کی ولادت | کس کو معلوم تھا کہ اس دودمانِ عالی کی روایات کو زندہ رکھنے کے لئے ایک ایسا گوہر نایاب ظاہر ہونے والا ہے جس کی آب وتاب سے ایوان مجد شرافت اور قصر شعر وسخن جگمگا اٹھیگا اور کس کو معلوم تھا کہ اجڑی ہوئی دلی میں ایک ایسا ماہتاب طلوع ہوگا جو دہلی کی تاریخی تہذیب وتمدن متانت وشائستگی کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تمام ہندوستان کو روشن کردیگا اور جو صحیح طور سے نیر رخشاں کا جانشین اور نمونہ ہوگا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دس سال کے بعد مورخہ ۲۰ رشوال ۱۲۸۳ھ م ۱۸۶۷ء کو نواب ضیاء الدین احمد خاں کے گھر پوتا پیدا ہوا اور اس شہسوار میدانِ سخن نے مغل تاجدار کی ہمنامی کا شرف حاصل کیا۔ یعنی مرزا سراج الدین احمد خاں نام پایا۔

کلیات غالب فارسی میں ایک قطعہ ہے۔

درخشید از سپہر جاہ ما ہے | بفرخ طالع وفرخندہ ہنگام
زہے چشم وچراغ دودۂ حسن | کہ افزاید فروغ دین اسلام
سراج الدین احمد خاں بہادر | نہادند اختر رخشندہ را نام

ہمیں نام ست تاریخ ولادت | خوشا نام آور شائستہ فرجام
خدایا اندریں گیتی کہ آنرا | نداند جز تو کس آغاز و انجام
رسد تا قطرہ زن ابر از پئے باد | شود تا جلوہ گر صبح از پس شام
نگہدار ایں ہمایوں نامور را | نشاں مند نشاط و عیش و آرام

مرزا غالب کے قطعے سے معلوم ہوتا ہے کہ "سراج الدین احمد خاں بہادر" مادۂ تاریخ ہے مرزا غالب کے مصرعے سے اعداد ۱۲۷۵ نکلتے ہیں۔ بقول حضرت سائل صاحب ان کا مادۂ تاریخ ولادت "مرزا سراج الدین احمد خاں" ہے جس سے تاریخ ولادت ۱۲۸۰ھ نکلتی ہے لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قطعہ جناب سائل مرحوم کی ولادت کے موقع پر کہا گیا ہے یہی وہ ہونہار لوند کریم بن الکریم تھا جو نشو و نما پاکر سائل بنا اور دہلی کی شرافت و تہذیب اور شعر و سخن کی دولت تقسیم کی۔ ابھی پانچ سال کی عمر تھی کہ والد محترم نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کا ۱۲۸۶ھ میں انتقال ہو گیا اور جب ۲۲ سال کی عمر ہوئی شفیق دادا نے بھی منہ موڑا۔

سلسلۂ نسب یوں ہے:- نواب سراج الدین احمد خاں سائل بن نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب بن نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں بن نواب احمد بخش خاں جاگیردار ریاست لوہارو بن عارف جان بن خواجہ ضیاء جان بن خواجہ نعمت اللہ بن خواجہ عبدالرحمٰن یہ سلسلہ نسب خواجہ احمد یسوی سے جاملتا ہے جو مشائخ کبار میں سے تھے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں کی نگرانی میں تعلیم و تربیت شروع ہوئی اور فارسی کی درسیات نواب مرحوم سے سبقاً پڑھیں[1] مولوی قاسم علی اتالیق مقرر ہوئے ان سے بھی درسیات پڑھیں[2] اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا ڈپٹی نذیر احمد سے پڑھیں[3] فنی کتب علم عروض و گر بیر وغیرہ مرزا عبدالغنی ارشد

---

[1] از یادداشت قلمی مرزا بشیر الدین احمد خاں بتوسط نواب خسرو مرزا [2] خمخانۂ جاوید [3] اوراق گل [4] واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم ص۶۱۹

گورگانی سے پڑھیں اور کلام کی اصلاح لی اور حکیم عبدالمجید خاں سے حکیم اجمل خاں کے ساتھ طب کی کچھ ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں۔

مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی (جو ابتداءً پنجابی کٹرے کی مسجد اورنگ آبادی میں درس حدیث دیتے تھے اور ۵۷ء میں پنجابی کٹرے کے برباد ہو جانے پر پھاٹک حبش خاں میں ان کا فیض جاری رہا مولانا کی وفات رجب ۱۳۲۰ھ میں ہوئی) سائل صاحب نے ان کے حلقہ درس میں شریک ہو کر حدیث کی سماعت بھی کی ہے۔ خوشنویسی کی مشق نواب مولوی رضی الدین احمد خاں دہلوی شاگرد میر پنجہ کش دہلوی سے کی اور ایسا کمال پیدا کر لیا کہ اس شان کا خط کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔

تخلص کے بارے میں نواب احمد سعید خاں طالب (عم محترم حضرت سائل صاحب) اور دیگر حاضرین مجلس ایک روز سرگرم فکر تھے اس اثناء میں ایک شریف اور سوالی صورت انسان نے آکر سلام کیا۔ تشریف آوری کا سبب معلوم کرنے پر آنے والے صاحب نے عرض کیا کہ "سائل ہوں"، چنانچہ اسی لفظ سائل کی طرف توجہ منعطف ہوئی قرعہ ڈالا گیا اور جواب حسب مراد حاصل ہوا

تاج ارشد جام غالب ماہ داغ سائل اندر کاسہ دارد سہ چراغ

ایک عجیب و غریب واقعہ اپنے بچپن کا راقم الحروف کو سنایا کہ جب میری عمر چار پانچ برس کی تھی دادا مرحوم کے پاس ایک ماہر جوتشی کسی غرض سے آیا تھا اس نے مجھے کئی مرتبہ غور سے دیکھا۔ دادا نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے اس بچہ کو آپ حیرت آمیز نگاہوں سے کیوں دیکھ رہے ہیں اس نے کہا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر جوٹ پر فخر کرے گا تمام حاضرین کو تعجب ہوا اور جوتشی کی بات کو لغو سمجھا گیا۔ دس بارہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا اور جتنی شعر و سخن سے دلچسپی بڑھتی گئی لوگوں کو جوتشی کی بات کا یقین ہوتا گیا۔

لے حیاۃ النذیر۔ دغالب از مہر۔ لے تخلص کا واقعہ محب محترم نہال سیوہاردی کے ایک مضمون سے لیا گیا ہے۔

سائل صاحب دہلی میں مرزا عبد الغنی ارشد گورگانی سے اصلاح لیتے رہے ارشد فیروزپور میں ملازم تھے اور آخر عمر میں کچھ ملالت اور ضعف کی وجہ سے ترک ملازمت کرکے ملتان میں اپنے بڑے صاحبزادے مرزا عبد اختر رشید کے پاس چلے گئے تھے اور وہیں ۱۹۰۶ء میں انتقال کیا ادھر یہ صورت پیش آئی کہ سائل صاحب حیدرآباد چلے گئے اور تقریباً ۱۹۰۰ء میں داغ مرحوم کے شاگرد ہوگئے۔

اس سلسلے میں مناسب ہوگا کہ حضرت سائل کے اساتذہ کے کچھ مختصر حالات بھی پیش کردوں۔ اساتذہ میں سے وہ اساتذہ جن سے زیادہ استفادہ کیا ہے چار ہیں۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں[1]، مولوی قاسم علی۔ مرزا عبد الغنی ارشد اور داغ مرحوم کے مختصر حالات پیش کرتا ہوں:۔

مرزا عبد الغنی ارشد گورگانی

بارہ دری خواجہ میر درد کوچہ چیلان میں ارشد مرحوم کی سکونت تھی اب ان کی اولاد یہیں سکونت پذیر ہے ان کے پوتے مسٹر رضی الدین راقم کے خاص محب اور مخلص دوست ہیں۔

ارشد مرحوم نواب کاشف سلطان بیگم بنت ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے نواسے تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے صاحب عالم مرزا عبد الغنی ارشد گورگانی بن مرزا علی بہادر بن شاہزادہ دلاور شاہ بن حضرت احمد شاہ بادشاہ ابن حضرت محمد شاہ بادشاہ آپ کی پیدائش قلعہ معلیٰ میں ہوئی چھ سات برس کی عمر میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء پیش آیا اور پھر آپ ہر دلی میں رہے وہیں درسی کتابیں پڑھیں اور سررشتہ تعلیم پنجاب میں ملازم ہوگئے۔ کچھ عرصے لاہور میں قیام رہا پھر زیادہ عرصہ فیروزپور میں جہاں آپ فارسی کے ہیڈ مولوی تھے بسر ہوا۔ شاعری کی ابتدا بچپن سے ہوگئی تھی۔ مرزا قادر بخش صابر مرحوم رشتے میں آپ کے ماموں ہوتے تھے۔ انھیں علاوہ زبردست استعداد عربی و فارسی علم عروض پر ایسا عبور تھا کہ اس فن میں مستند سمجھے جاتے تھے اور فن شعر میں بھی مسلم الثبوت استاد

---

[1] بقول حضرت نوح ناروی مدظلہم العالی

تھے صابر مرحوم کے بڑے صاحبزادے مرزا عمر سلطان معروف بہ مرزا قیصر بخت فروغ بنارس میں شادی ہو جانے کے باعث (نیز وہاں کے انسپکٹر مدارس بھی تھے) بنارس میں رہتے تھے اگرچہ مرزا صابر کبھی وہاں آتے جاتے تھے مگر ان کا زیادہ تر قیام دہلی میں رہتا تھا مرزا ارشد سے انھیں خاص انس تھا ان کی ذکاوت تیزی اور رسائی فکر کو دیکھ کر جان گئے کہ خدا نے اسے غیر معمولی دماغ دیا ہے اور قابل تربیت پاکر ان کی تربیت اور اصلاح میں کوشاں ہوئے پھر کیا تھا ابتداء میں ہی ایسے شعر نکلنے لگے کہ استاد پھڑک گئے۔ ابتدائی زمانے میں بھی یہ حال تھا کہ ایک غزل سوڈیڑھ سو شعر کی کہہ دیتے تھے۔ اور ایک قافیے کو بیس بیس طرح باندھتے تھے۔ یہ طالب علمی کے زمانے کی کیفیت ہے کہ مدرسے میں اور لڑکے جس سبق کو گھنٹوں رٹتے یہ چند منٹ کی توجہ میں یاد کر لیتے اور ہمیشہ جماعت میں اعلیٰ رہتے اس اثنا میں مرزا صابر بنارس تشریف لے گئے۔ اور چند ہی روز اصلاح کا سلسلہ جاری رہا وہاں سے لکھ بھیجا کہ اب تم بجائے خود استاد ہو تمہیں اصلاح کی احتیاج نہیں مرزا صابر مرحوم ان پر ناز کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ساری عمر کی کمائی دو شاگرد ہیں ارشد اور فروغ۔

مرزا صابر کے بعد چند سبق مولوی احسان الرحمن خاں معروف بہ منجھلے آغا سے لئے پھر انھیں کی تحریک سے امراؤ مرزا انور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تکمیل فارسی کے بعد پہلا قصیدہ عرفی کے قصیدے (دہان علم زبان علم) پر لکھا اور خواجہ حالی کے ہمراہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے سن کر بہت داد دی۔ جب تک دہلی میں رہے سیف الحق ادیب مرزا حسین علی خاں شاداں (شاگرد غالب مرحوم) مرزا انور مرزا فروغ مرزا داغ کے ساتھ مشاعروں میں غزلیں پڑھتے رہے اور کسی سے کم نہیں رہے ایک خصوصیت یہ تھی کہ جیسا اچھا کہتے تھے ویسا ہی اچھا پڑھتے بھی تھے جملہ اصناف سخن پر قادر ہونے کے علاوہ طبیعت

ہر وقت حاضر رہتی تھی۔ تاریخ میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ کوئی خاص وقت فکر سخن کے لئے متعین نہ تھا جس وقت چاہتے تھے اور جس مضمون پر لکھنا ہوتا قلم برداشتہ تھوڑی سی دیر میں بہت کچھ لکھ ڈالتے تھے اکثر جلسوں کے لئے طویل نظمیں ریل کے سفر میں لکھ لیتے تھے۔ ایک اور قابل حیرت بات یہ ہے کہ جس طرح قدیم ذوقِ شاعری رکھتے تھے اسی طرح جدید نیچرل شاعری میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ ہمیشہ خوش رہتے اور دوستوں کو خوش رکھتے۔ زندہ دلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سرکار بھاولپور سے بصلہ مدح گستری دوسو روپئے سالانہ آپ کو ملا کرتا تھا۔ انجمن اسلامیہ لاہور کے سالانہ جلسوں میں پندرہ سال تک برابر شریک ہوکر سامعین کو محظوظ فرماتے رہے۔ جن بزرگوں کی کوشش سے پنجاب میں اردو کی اشاعت ہوئی ان میں آپ درجہ اختصاص رکھتے ہیں۔

مرزا صاحب سال بھر سے زیادہ علیل رہنے لگے تھے چنانچہ رخصت لے کر دہلی گئے مگر تھوڑے ہی دنوں بعد پھر فیروز پور جانا پڑا آخرا اپنے بڑے بیٹے مرزا بلند اختر رشید کے پاس جو ملتان میں ریل کے دفتر میں نقشہ نویس تھے چلے گئے۔ اور وہیں ۸۰ برس کی عمر میں ۱۲ فروری ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا۔

آپ کے تلامذہ تو کثیرت تھے۔ مگر ہم چند ناموں پر اکتفا کرتے ہیں:۔ نواب سراج الدین احمد خاں بہادر سائل۔ نواب ممتاز الدین احمد خاں بہادر مائل۔ منشی احمد حسین خاں احمد۔ ڈاکٹر محمد اقبال۔ بسمل۔ بزمی گورگانیؒ

فصیح الملک داغ دہلوی | فصیح الملک نواب میرزا خاں داغ احسن مارہروی کی تحقیق کے مطابق نواب شمس الدین احمد خاں رئیس لوہارو و فیروزپور جھرکہ کے فرزند ہیں اور نواب شہاب الدین احمد خاں

لہ خمخانہ جاوید جلد اول۔ کلام کا انتخاب بھی خمخانہ میں ہی ملاحظہ فرمایئے۔

ثاقبؔ کے چچا زاد بھائی ہیں اس وجہ سے حضرت سائلؔ مرحوم ان کو چچا جان کہتے تھے۔

جناب داغؔ مورخہ ۱۲؍ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵؍ مئی ۱۸۳۱ء روز چہارشنبہ محلہ بلیماران دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھ برس کی عمر تھی کہ نواب صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا پھر ان کی والدہ نے آخری مغل بادشاہ کے ولیعہد فتح الملک مرزا فخر الدین رمز عرف مرزا فخرو کے دامن عاطفت میں پناہ لی اور نواب شوکت محل کا خطاب پایا۔ اس طرح داغؔ کو قلعہ معلیٰ میں علوم و فنون کی تکمیل کا عمدہ موقع مل گیا۔ یہ غالباً ۱۸۴۴ء میں ہوا۔

ابتدائی تعلیم مولوی غیاث الدین رامپوری مؤلف غیاث اللغات سے حاصل کی اور قلعۂ معلیٰ میں مولوی سید احمد حسین بن میر غلام حسین شکیباؔ جو میر تقی کے تلمیذ تھے داغؔ کے اتالیق مقرر ہوئے خوشنویسی میر پنجہ کش اور ان کے شاگرد مرزا عبداللہ بیگ سے حاصل کی فنون سپہگری ولی عہد بہادر سے حاصل کئے ان کی طباعی اور ذہانت سے متاثر ہو کر انکو استاد ذوقؔ کے سپرد کیا گیا تاکہ دیگر فنون کی طرح شعر و سخن کا کمال بھی حاصل کریں۔ داغ کا بچپن اور عنفوان شباب کا زمانہ قلعہ معلیٰ میں ہی بسر ہوا اور وہیں کی ادبی فضا میں پرورش پائی۔ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ ولی عہد کی وجہ سے بالعموم لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔

مرزا خورشید عالم بن ولی عہد مرزا فخرو داغؔ صاحب کی والدہ کے بطن سے تھے اور حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں مرزا خورشید عالم بھی حیدرآباد میں تھے مرزا فخرو کے انتقال کے بعد داغ صاحب کی والدہ نے ایک انگریز (غالباً فریڈرک) کے ہاں پناہ لی اور ان سے شاغل صاحب پیدا ہوتے جن کے صاحبزادے امراؤ مرزا ناداںؔ یعنی داغؔ صاحب کے بھتیجے حیدرآباد میں داغؔ صاحب کے پاس ہی رہتے تھے۔ انتہا درجے کے میخوار اور فضول خرچ تھے ۱۸۵۶ء میں ولیعہد کا انتقال ہوا داغ کو اس حادثے کا سخت صدمہ ہوا۔ اس کے دس ماہ بعد ہنگامہ ۱۸۵۷ء پیش آیا۔ اور ۲۴ برس کا زمانہ

جو عافیت کے ساتھ گذرا تھا ختم ہوا۔ داغ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رامپور چلے گئے۔ نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور نے قدردانی کی اور اپنے صاحبزادے نواب کلب علی خاں کا مصاحب مقرر کیا۔ نواب کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی اپنا دہی طرز عمل رکھا اور اپنا مصاحب خاص مقرر کیا۔

دہلی میں جب نواب یوسف علی خاں مرزا فخرو دلی عہد کے مصاحب تھے تو داغ اور کلب علیخاں کا بچپن کا زمانہ ساتھ ہی گذرا تھا اس تعلق کو نواب نے آخر تک نبھا دیا۔ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد ۱۸۸۶ء میں کونسل کا تقرر ہوا۔ جنرل اعظم الدین خاں سے ان کی نہ بنی اور رامپور کو خیرباد کہہ کر دہلی چلے آئے۔ پھر ۱۳۰۵ھ م ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد چلے گئے چند روز محلہ تشیدی عنبر میں سیف الحق ادیب دہلوی کے ہاں اور پھر ان کے متصل ایک مکان میں مقیم ہوئے راجہ گردھاری پرشاد بہادر عرف مبنی راجہ باقی کی معرفت پیشگاہ سلطانی میں عرضی بھیجی پہلا قصیدہ مدحیہ جو آپ نے میر محبوب علی خاں نظام دکن کی شان میں لکھا اس کا مطلع یہ ہے:۔

میں ہوا بادیہ پیما طرفِ ملکِ دکن　　　سرمۂ چشم غزالاں ہوئی گردِ دامن

پھر دلی چلے آئے اور نواب موصوف کی طلبی پر دوسری بار حیدرآباد گئے۔ ۱۳۰۸ھ میں نظام نے اپنا استاد مقرر کیا۔ ۱۳۱۱ھ تک ساڑھے چار سو روپئے ماہوار تنخواہ ملتی رہی۔ پھر ۱۳۱۲ھ میں ایک ہزار روپئے ماہوار ہوگئی اور آخر عمر میں پندرہ سو روپئے حالی ہوگئی تھی۔

داغ مرحوم نے حیدرآباد میں ۱۸ برس نہایت عزت و احترام اور آرام و راحت سے گذار کر ۹ ر ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ م ۱۷ ر فروری ۱۹۰۵ء کو آٹھ روز مرض فالج میں مبتلا رہ کر بعمر ۷۶ سال رحلت فرمائی اور عید کے دن نماز عید کے بعد مکہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ پھر یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں دفن کئے گئے اسی درگاہ میں داغ صاحب کی اہلیہ اور حضرت امیر مینائی مرحوم بھی مدفون ہیں [۱]۔

---

[۱] جلوۂ داغ۔ داغ از نور اللہ (وغیرہ)

(باقی آئندہ)

ادبیات

سلام

(تاباں القادری)

جلوۂ صبح بہاراں السّلام — رونقِ شامِ گلستاں السّلام

السلام اے ماہِ ذیشاں السّلام — السلام اے نورِ یزداں السلام

السلام اے رہنمائے راہِ دیں — السلام اے قبلۂ اہلِ یقیں

ناخدائے کشتیٔ ایماں اسلام — ردِ کلفت، دافعِ عصیاں سلام

ساقیٔ مے خانۂ وحدت سلام — فخرِ مومن نازشِ ملت سلام

السلام اے چشمۂ جود و سخا — السلام اے منبعِ لطف و عطا

ساغرِ رندانِ الفت السّلام — جامِ صہبائے صداقت السّلام

ابرِ رحمت ظلِ سبحانی سلام — بارشِ الطافِ ربانی سلام

السلام اے پرتوِ مطلوبِ دل — السلام اے جلوۂ محبوبِ دل

السلام اے ماہِ ذیشاں السّلام — السلام اے جانِ تاباںؔ السّلام

"شاہی ویرانوں میں ایک رات"

(شمس نوید)

اُف یہ شاہانِ اودھ کے مرمریں محلوں کا حال — عظمتِ رفتہ کے دھندلائے نشاں۔ ٹوٹے کھنڈر

وہ حقیقت جو تھی زندہ سیم و زر کے درمیاں | آج اس پر رہ گئے ہیں نوحہ خواں — ٹوٹے کھنڈر

یہ کھنڈر کی رات پُر اسرار آسیبی سکوت | ہیں مرے ذوقِ تخیّل کے لئے لذت فروش
اُڑ رہا ہے چاند شاخوں پہ نئے کرنوں کا جال | کر رہی ہیں ظلمتیں دہشت میں فریاد و خروش

یہ شکستہ نصف دیواروں کی لاشیں بے کفن | یہ خمیدہ بام و در کی پشت پر برسوں کا بار
سرد و گرمِ زندگی کی کشمکش دیکھے ہوئے | یہ عناصر کی سراب آسا بلندی کا مزار

وہ دریچے گرد سے بوجھل پڑے ہیں منہدم | جن میں نازک ریشمی پردے تھے آویزاں کبھی
اونچی اونچی منزلیں گر کر بنیں انبارِ خاک | جن میں روشن تھا چراغِ سطوتِ انساں کبھی!

جس میں نسوانی ہنسی کی نغمگی بیدار تھی | اس کے سناٹے میں جھینگر بولتے ہیں بیقرار
جس فضا میں تھے سہانے خواب آوارہ کبھی | اُڑ رہی ہیں اب وہاں چمگادڑیں دیوانہ وار

اس کھنڈر کو لیکن اے انساں ابھی "ویراں" نہ کہہ | کیا تجھے اس کے پسِ پردہ کشش چھوتی نہیں؟
موت پر محمول مت کر اس سمندر کا سکوت | چھپ گیا جس کا تلاطم بن کے موجِ تہ نشیں
زینتِ ایواں کبھی جو تھے بقیدِ آب و گِل | بہہ گئے سیلابِ فنا میں وہ حسیں منظر گئے
چھوڑ کر روحوں کا لافانی سکوتِ رازدار | مرنے والے مادّی اجسام آخر مر گئے

دیکھتا ہوں آج بھی ہنگامۂ ہستی یہاں! | اب بجائے جسم روحوں کا تسلط ہے مگر
بن گئی ہے زندگی ایسا سکونِ جاوداں | جس میں اُمیدوں کی شورش اور نہ مایوسی کا ڈر

سچ بتا اے وقت ان گزرے ہوئے لمحوں کا حال | جب یہ ویرانہ تھا قصرِ مرمریں شہریار
کیا وہ عشرت گاہ میں پروان چڑھتی زندگی
تھی کبھی ایسے سکونِ جاوداں سے ہمکنار؟

تبصرے

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات از چودھری شیر جنگ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۱۴۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد درج نہیں پتہ :۔ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور۔

کارل مارکس کے فلسفۂ معاشیات سے جس کو مارکسزم کے پیرو سماجی حرکیات (Social Dynamics) کا نام رکھتے ہیں اور اس کی بنیاد پر قایم شدہ سماجی نظام سے خواہ کسی شخص کو کیسا ہی اختلاف ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کارل مارکس کیرکٹر کی مضبوطی ۔ ہمت بلند اور اخلاقی عظمت کے علاوہ ذہن ودماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کے اعتبار سے اُنیسویں صدی کی دنیا کا ایک نہایت غیر معمولی انسان تھا آج علوم وفنون کی حیرت انگیز گرم بازاری کے دور میں بھی اس کی تصنیف "سرمایہ" یورپ اور ایشیا کے کروروں انسانوں کے لئے صحیفۂ سماوی کی اور اس کے فکر کی بنیاد پر جس نئے سماج نے جنم لیا ہے وہ نصف سے زائد دنیا کے لئے ایک شریعت کا حکم رکھتی ہے پھر اس سماج کی سیاسی طاقت وقوت کا یہ عالم ہے کہ برطانیہ ۔ اور مغربی یورپ کی حکومتوں کے علاوہ عہد حاضر کی سب سے بڑی حکومت امریکہ اس کی طرف سے ایک لمحہ کے لئے غافل نہیں ہو سکتی اردو زبان میں اگرچہ کارل مارکس اور اس کی تحریک پر چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں لیکن درحقیقت ان سے اس تحریک کو سائنٹفک طریقہ پر سمجھنے میں بہت کم مدد ملتی ہے۔ کیونکہ اول توکم وبیش یہ کتابیں مخالفانہ یا موافقانہ پروپیگنڈہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور دوسرے یہ کہ اس تحریک کے پس منظر کو سمجھنے یا اس پر تنقید کرنے کے لئے

بین مختلف علوم و فنون ۔ مثلاً فلسفہ ۔ اقتصادیات ۔ اجتماعیات ۔ طبعیات ۔ تاریخ اور جماعتی نفسیات وغیرہ میں درک و بصیرت کی ضرورت ہے ان کتابوں کے مصنف عام طور پر ان سے بے بہرہ ہیں ۔ خوشی کی بات ہے کہ چودھری شیر جنگ جن کا مختلف علوم و فنون کا مطالعہ نہایت وسیع اور ٹھوس ہے اور جو انگریزی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں کے نامور ادیب اور شاعر ہیں اور جو اپنی انقلابی سرگرمیوں کے باعث عمر کا ایک تہائی حصہ قید و بند کے شدید ترین مصائب و آفات میں بسر کر چکے ہیں انھوں نے اس کتاب کو لکھ کر اس خلا کو بڑی حد تک پر کر دیا ہے ۔

کتاب دو حصوں پر تقسیم ہے پہلے حصہ میں جو ۷۰ صفحات پر ختم ہوا ہے کارل مارکس کے خاندانی اور اس کے اپنے نجی حالات و واقعات ہیں ۔ مصنف کا اندازِ بیان خطیبانہ ہونے کے ساتھ اس درجہ دلچسپ اور شیریں ہے کہ اس حصہ کو پڑھتے وقت ایک بہترین ناول کا سا لطف آتا ہے اور واقعات و سوانح اس قدر عبرت آموز و بصیرت افروز ہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد صاحبِ سوانح کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ۔

کتاب کا دوسرا حصہ جو "تعلیمات" کے نام سے موسوم ہے کافی طویل ہے اور در اصل کتاب کی روح یہی ہے اس میں لائق مصنف نے کارل مارکس کی فکر کے مختلف پہلوؤں اور اس فکر کے پس منظر کے متعدد گوشوں مثلاً "اضدادی مادیت" "مارکس کا فلسفہ مادیت" "تاریخ کا اقتصادی نظریہ، طبقاتی جنگ، سرمایہ دارانہ استحصال کی حقیقت، سرمایہ داروں کے درمیان قدرِ زائد کا بٹوارہ، تجارتی سرمایہ اور اس کی آمدنی، تجارت کی شکلیں، زراعت میں سرمایہ داری، مکرر پیداوار اور بحران وغیرہ ۔ ایسے اہم مباحث پر گفتگو کی ہے ۔ یہ مباحث اگرچہ اقتصادیات کے مباحث ہیں اور کافی خشک ہیں لیکن مصنف کے عام فہم اور سلیس اندازِ بیان نے ان کو اتنا آسان کر دیا ہے کہ ایک متوسط استعداد کا اردو خواں بھی سمجھ سکتا ہے ۔ شروع میں ایک مقدمہ

ہے جس میں اس کتاب کے لکھنے کی تقریب بیان کی گئی ہے اور آخر میں موضوع کتاب سے متعلق انگریزی زبان کی اصطلاحات ان کا اردو ترجمہ اور پھر ہر اصطلاح کی تشریح بیان کی گئی ہے جو بجائے خود مفید ہے اس کے بعد ان کتابوں کی مکمل فہرست ہے جن سے اس کتاب کی تالیف و تدوین میں مدد لی گئی ہے کسی چیز کی سچی حمایت اور موثر مخالفت دونوں اسی وقت ہو سکتی ہیں جبکہ اس کو علمی طریقہ پر سنجیدگی اور غور کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہو ورنہ محض پروپگنڈہ سے متاثر ہو کر کسی تحریک کو اچھا کہنا یا برا سمجھنا نہ تحریک کے حق میں مفید ہو سکتا ہے اور نہ اس سے تنقید کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس کتاب کا مطالعہ دونوں فریق کو کرنا چاہئے!!

منصب امامت کا اردو ترجمہ | از حکیم محمد حسین صاحب علوی تقطیع متوسط حجم ۱۵۲ صفحات کتابت و طباعت اچھی قیمت مجلد دو روپیہ۔ پتہ :۔ حکیم محمد حسین علوی مومن پورہ راوی روڈ لاہور۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی زبان میں منصبِ امامت کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اپنے خاص حکیمانہ اور متکلمانہ انداز میں یہ بتایا تھا کہ امامت کی تعریف اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے شرائط اور انواع کتنے ہیں اور ان انواع و اقسام میں سے ہر قسم کے علامات و خصائص اور اس کے اثرات و نتائج کیا ہوتے ہیں۔ حکیم صاحب نے اس کا عام فہم اردو میں ترجمہ کر کے اس کی افادیت کو عام کرنے کی کوشش کی ہے اگرچہ حضرت شاہ صاحب کی مراد صاحبِ عہدت امام ہے جو دراصل نبی کا پرتو یا ظل ہوتا ہے اور جس کا وجود اس زمانہ میں نایاب ہے تاہم کتاب کی دوسری فصل میں سلطنت کی جو مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں اُن سے موجودہ زمانہ میں بھی اگر کوئی مسلمان حکومت چاہے تو بہت کچھ سبق حاصل کر سکتی ہے مترجم نے جس نیک ارادہ سے اس اہم اور بیش بہا کتاب کا ترجمہ کرنے کی زحمت گوارا کی ہے اس کا پورا ہونا

تو مشکل کیا ناممکن ہی ہے۔ کیونکہ ؎

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

تاہم اس کا فائدہ یہ ضرور ہے کہ اردو زبان میں ایک اچھی کتاب منتقل ہوگئی اور اردو خوان طبقہ بھی حضرت شاہ صاحب کے تبحر علمی اور دقت و وسعت نظر سے واقف ہو سکے گا۔

ارمغان آلام | از ڈاکٹر سید محمود صاحب تقطیع خورد ضخامت ۱۹۲ طباعت وکتابت بہتر قیمت مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ۔ پتہ:۔ نظامی بک ایجنسی بدایوں۔

ڈاکٹر صاحب تعلیم جدید کے ان اصحاب میں سے ہیں جو اعلیٰ مغربی تعلیم کے ساتھ مشرقی علوم و فنون اور زبان و ادب کا پاکیزہ و شستہ مذاق رکھتے ہیں اور اپنے طور طریق میں مشرقی روایات و کلچر کے حقیقی علمبردار بھی ہیں اب یہ بساط فرسودہ و کہنہ ہو چکی ہے اس کے مہرے ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں ڈاکٹر صاحب اور ان جیسے دو چار ہی رہ گئے ہیں خدا ان لوگوں کو دیر تک بٹھائے رکھے کہ ان کے دم سے پرانی بہار کے کچھ نقوش اب تک تازہ ہیں ورنہ اب جو دور آرہا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں ان مشرقی علوم و فنون کا حشر کیا ہوگا۔ سیاسی سرگرمیوں کے باعث اگرچہ ڈاکٹر صاحب کو کسی مستقل تصنیف کا موقع نہیں ملا۔ تاہم زیر تبصرہ کتاب جو دراصل اردو فارسی اور کچھ عربی کے ان اشعار کا ایک حسین و دلکش مرقع ہے جنھیں موصوف نے احمد نگر کی قید فرنگ کے زمانہ میں اپنے ذوق کے مطابق انتخاب کیا تھا ان کے شستہ ادبی ذوق اور وسعت مطالعہ کی دلیل ہے یہ اشعار مختلف دور کے شعرائے قدیم و جدید کے ہیں اور ان میں فلسفہ و تصوف بھی ہے۔ اور رموز حسن و عشق بھی۔ اخلاق و موعظت بھی ہے اور منظر نگاری و جذبات آفرینی بھی زبان و بیان کی خوبیاں بھی ہیں اور حسن و تخیل و معنیٰ آرائی بھی۔ امید ہے عنوانات کی گوناگونی کی وجہ سے ہر صاحب ذوق اس کی قدر کرے گا۔ شروع میں عبدالمالک صاحب آروی

کے قلم سے ایک مقدمہ ہے جس میں انھوں نے اس انتخاب کی خصوصیات اور صاحب انتخاب کے ذوقِ علم و ادب پر روشنی ڈالی ہے۔

رسول کی تعلیم | از قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی تقطیع خورد ضخامت ۴۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ:۔ لاہور اور اُردو بازار دہلی کے ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے

یہ کتاب اگرچہ بچوں کے لئے لکھی گئی ہے لیکن بڑے مرد اور عورتیں بھی یکساں طور پر اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں مختلف قسم کے ۴۶ عنوانات پر جو تقریباً بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے تمام مشاغلِ حیات پر مشتمل ہیں۔ نہایت آسان اور دلنشین زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ بچوں اور بچیوں کے نصاب دینیات میں شامل کی جائے۔

سِلسِلۂ تاریخ مِلّت

نبیِّ عربی صلعم

تاریخ ملت کا حصہ اوّل جس میں متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لئے سیرتِ سرورِ کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق، جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جدید ایڈیشن جس میں اخلاق سرورِ کائنات کے اہم باب کا اضافہ کیا گیا ہے اور آخر میں ملک کے مشہور شاعر جناب ماہر القادری کا سلام بہ درگاہ خیر الانام بھی شامل کر دیا گیا ہے کورس میں داخل ہونے کے لائق کتاب ہے۔ قیمت عہ مجلد ۱۲ بقیہ حصص خلافت راشدہ ہے، خلافت بنی اُمیّہ ہے۔

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ **محسن خاص**۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہینگی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہینگے۔

۲۔ **محسنین**:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہونگے، ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ **معاونین**:۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائینگے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ "برہان" (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائیگا۔

۴۔ **احباء**:۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احباء میں ہوگا ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لیے ہے۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہوجاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے ۲ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہو

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰؍

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مُرتّبہ

سعید احمد اکبر آبادی

بُرہان

جلد بست وسوم   شمارہ (۳)

ستمبر ۱۹۴۹ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۶۸ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخر کار وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا۔ یعنی کانگرس نے بھی یہ تسلیم کر لیا کہ ملک کی ریاستی زبان ہندوستانی دونوں رسم الخطوں میں نہیں بلکہ ہندی صرف دیوناگری رسم الخط میں ہونی چاہیئے پچھلے دنوں پنڈت جواہر لال نہرو۔ صدر کانگرس اور بعض اور لیڈروں اور انصاف پسند قومی کارکنوں کے اعلانات اور اُن کے مضامین و مقالات سے ایک ہلکی سی امید اس امر کی پیدا ہو گئی تھی کہ اگرچہ یو.پی کی حکومت نے اُردو زبان کو اس کے اپنے دیس سے شہر بدر کر دیا ہے لیکن مرکز میں کم از کم عدل و انصاف کے مطالبات اور سب سے بڑھ کر گاندھی جی کے ارشادات و خواہشات کا لحاظ رکھا جائیگا لیکن اب معلوم ہوا کہ جس پارٹی کو صرف اپنی لیڈر شپ کی خیر منانے سے واسطہ ہو اس سے یہ امید باندھنا ہی فضول ہے کہ وہ اس راستہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ سکیگی جس کو اس نے عرصہ دراز کے غور و فکر کے بعد اختیار کیا ہے اور جس پر جمے رہنے کا وہ بلند آہنگی کے ساتھ بار بار دعویٰ کرتی رہی ہے۔

ایک ایسی پارٹی جو متعصب۔ تنگ نظر۔ اور کوتاہ بیں عوام میں اعتماد کو بحال رکھنے کی غرض سے اپنے اہم اصول سیاست و نظریات حیات سے کھلا انحراف کرنے کی جرأت رکھتی ہو اور جس کو اس کی بھی شرم نہ ہو کہ اس پارٹی کے سب سے بڑے رہنما اور مربی کی عین تمنا اور دلی خواہش کیا تھی ایسی پارٹی کتنے دنوں تک اپنی ہستی اور اپنے وقار کو ملک میں قائم اور برقرار رکھ سکتی اور کب تک انتہائی مظلومیت کے ساتھ قتل ہونے والے اپنے روحانی باپ کی استخواں فروشی پر گذارا کر سکتی ہے؟ اس کا فیصلہ تو عنقریب مستقبل کریگا لیکن ہم کو یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ کانگرس کا یہ

فیصلہ اُردو زبان کی کمر پر وہ سب سے بڑی ضرب کاری ہے جو آئین اور جمہوریت کے نام پر اُس کو فنا کرنے کے لیے لگائی جا سکتی تھی اس کے بعد صرف یہ منزل باقی رہ جاتی ہے کہ اُردو بولنے والی زبانوں پر قفل لگا دیا جائے اور اس زبان میں گفتگو کرنے کو ہی قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے۔

کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ یہ بھی تو کر دیکھ!!

قول و فعل کی عدم مطابقت اور ساتھ ہی فریب خوردگی نفس کی کوئی مثال دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ افسوسناک اور حیرت انگیز نہیں ہو سکتی کہ کسی ملک کی ریاستی زبان ایک ایسی زبان کو قرار دیا جائے جس کو اس ملک کی نیشنل گورنمنٹ کا وزیر اعظم نہ بول سکتا ہو اور جس کے لغت اور رسم الخط سے اس کا وزیر تعلیم تک ناآشنا ہو کیا اب بھی کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار صرف وہ پست ہمت اور کم حوصلہ مسلمان ہے جو اپنے ساتھی کی تنگ نظری کا جائزہ لینے کے بعد اس درجہ سراسیمہ و حواس باختہ ہو گیا کہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار بیٹھا اور اپنے اخلاق فاضلہ، عمدہ کیرکٹر اور بلند کردار کے ذریعہ اس کی اصلاح کی کوشش کرنے کے بجائے خود اُن اوچھے ہتیاروں پر اُتر آیا جن کی شکایت وہ اپنے ساتھی سے کرتا تھا۔

بہر حال اب جبکہ اردو زبان کے لیے آئین ہند کی بارگاہ سے عملاً جلاوطنی کا حکم صادر ہو چکا ہے ان لوگوں سے کچھ کہنا سُننا فضول ہے جن کے ہاتھوں میں اس وقت عنانِ حکومت ہے ہم صرف اُردو کے قدر دانوں سے یہ کہیں گے کہ آپ لوگ اس ناگوار صورت حال سے مایوس و دم گرفتہ نہ ہوں یہ تو تاریخ کے انقلابات ہیں جو سدا ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے زبانیں حکومت کے سہارے سے ہی زندہ نہیں رہتی ہیں بلکہ کسی زبان کا بقا اور اس کا قیام اس کے بولنے والوں اور قدر دانوں کے عزم و

ہمت۔اور ان کی قابلیت ولیاقت پر موقوف ہوتا ہے۔جس زبان کی فطرت میں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا جوہر ودیعت ہوا اور جس کے بولنے والے خود زندہ رہنے کا عزم راسخ کر چکے ہوں اس کو دنیا کا کوئی ہتھیار فنا نہیں کر سکتا ہندی یا کوئی اور زبان کتنی ہی طاقتور ہو بہر حال انگریزی سے زیادہ وسیع ہمہ گیر۔جاذب اور قوی نہیں ہو سکتی۔پس جب انگریزی کے دور عروج وارتقا میں اردو کو زوال نہیں بلکہ عروج ہوا اور انگریزوں کی تمام کوششوں کے باوجود وہ دیکھتے دیکھتے مہذب دنیا کی ایک ایسی زبان بن گئی کہ آج اس کی تعلیم کا انتظام روس، یورپ اور امریکہ تک کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں ہے تو پھر ہندی سے جو کہ اُردو کی غیر نہیں بلکہ اس کے ساتھ کی کھیلی ہوئی ہجولی اور رشتہ دار ہے۔کس طرح یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ اس کی ریاستی اور آئینی اہمیت اُردو کو فنا کر سکیگی۔

زبان کہیں کی اور کسی ملک کی ہو اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔چنانچہ اردو کا بھی کوئی مذہب نہیں ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت ملک میں اس زبان کے ساتھ بغض وعناد کا جو معاملہ کیا جا رہا ہے اسکی بنیاد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ مسلمانوں کو بہ نسبت دوسرے فرقوں کے اس زبان سے زیادہ تعلق ہے اس بناء پر جہاں تک اُردو کی حفاظت وبقا اور اس کی ترقی واشاعت کا تعلق ہے مسلمانوں کی ذمہ داری بھی بہ نسبت دوسروں کے زیادہ ہے اُن کو یہ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں اسلامی کلچر، اسلامی علوم وفنون کا اردو کے ساتھ بڑا گہرا رابطہ ہے۔اگر خدانخواستہ اس زبان پر زوال آیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی کلچر کے اُبھرے ہوئے اور روشن حروف بھی مدھم پڑ جائیں گے اور مسلمانوں کی ملی انفرادیت ختم ہو جائیگی اس بناء پر ہند کے چار کروڑ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہندی میں کمال ومہارت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کی حفاظت کا بھی بندوبست کریں اور جس طرح بھی ممکن ہو وہ اس کو باقی رکھنے کی جدوجہد کریں۔مرعوبیت اور خوفزدگی مسلمانوں کی شان سے بعید ہے جو قوم انقلابات عالم کی آندھیوں میں بھی اپنے چراغ کو روشن رکھنے کا فن جانتی ہو اس کو نرم وسبک گام بادِ شب گاہی سے کیا اندیشہ ہو سکتا ہے!!!۔

قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر

از جناب مولوی غلام ربانی صاحب ایم - اے (عثمانیہ)

(۴)

ایک بڑے فتنہ کا سدباب | بنی اُمیہ نے اسلامی حکومت پر قبضہ کرکے جب خلافت کو سلطنت کی شکل میں بدل دیا اور روم و ایران کے حکمرانوں کو نمونہ بنا کر حکومت کرنے لگے تو مسلمانوں میں قدرتاً جیسا کہ چاہیئے تھا بے چینی پیدا ہوئی اور اس نے ایک عام کشمکش کی شکل حکومت اور عوام کے درمیان پیدا کر دی اس کشمکش کے دبانے کے سلسلے میں جو بے پناہ مظالم بنی اُمیہ کے حکمرانوں کی طرف سے مسلمانوں پر توڑے گئے ان کے لئے صرف ایک حجاج ہی کا نام کافی ہو سکتا ہے جس نے ایک لاکھ سے اوپر مسلمانوں کو صبر (سامنے باندھ کر) قتل کروایا۔ اسی کشمکش کے سلسلہ میں لعنت و ملامت کا قصہ جب دراز ہوا تو بنی اُمیہ سے آگے بڑھ کر بعض خفیف العقل گرم مزاج لوگوں کی زبانیں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بھی کھلنے لگیں کیونکہ بنی اُمیہ والے آپ کے نام اور خاندانی تعلق سے ناجائز نفع اُٹھاتے تھے مسلمانوں پر احسان جتلاتے تھے کہ ہمارے خاندان ہی نے تمہارے قرآن کو محفوظ کر دیا ورنہ تمہارے مذہب کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی اور اشارہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد حکومت کی اسی قرآنی خدمت کی طرف تھا۔

عبدالملک ابن مروان برسر منبر مسلمانوں سے کہتا

علیکم بمصحف امامکم المظلوم[۱] — مسلمانو! اپنے مظلوم امام و خلیفہ (یعنی عثمانؓ) کے

---

[۱] طبقات ابن سعد ذکر عبدالملک ۱۲۔

مصحف کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو

ظاہر ہے کہ قرآن جو نہ بے چارے حضرت عثمان پر نازل ہوا تھا۔ نہ انھوں نے اس کو ابتداءً لکھوایا تھا حتیٰ کہ ایک جلد میں تمام سورتوں کو مجلد کرانے کا کام بھی ان کی حکومت کی طرف سے نہیں انجام پایا تھا البتہ آخر میں بجائے مختلف لہجوں کے کتابت کی حد تک مسلمانوں کو ایک ہی نسخہ پر جمع کرنے کا انتظام اپنی حکومت کی طرف سے کر دیا تھا محض اس لئے اس قرآن کو جس کو اللہ نے نازل کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا امام مظلوم کا مصحف اور قرآن قرار دینا۔ مسلمانوں کو برہم کر دینے کے لئے کافی تھا ردعمل آخر اس کا اس شکل میں ہوا کہ حضرت عثمان کی قرآنی خدمت کی اہمیت لوگ گھٹانے لگے اور فریق مخالفت میں جو زیادہ تند خو، گرم مزاج تھے وہ حضرت عثمان پر اُلٹ کر طرح طرح کے الزامات بھی تھوپنے لگے اور جو قرآن خالق عالم کی طرف سے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سارے جہان کے انسانوں کے لئے اُترا تھا اس کا نام ہی ان لوگوں نے "بیاض عثمانی" العیاذ باللہ رکھ دیا اور سچ پوچھئے تو بنی امیہ کے اسی طرز عمل کی مخالفت میں بعض ناعاقبت اندیش لوگوں نے مسلمانوں میں بعض جعلی بے سروپا روایتیں خود ہی گھڑ گھڑ کر پھیلا دیں اور ان میں جو چالاک تھے جانتے تھے کہ جعلی روایتوں کا پردہ چاک ہو جائے گا انھوں نے بعض صحیح اور ثابت روایتوں کو غلط مقصد کے لئے استعمال کیا ان لوگوں کی یہ دوسری تدبیر زیادہ کارگر ثابت ہوئی اچھے اچھے لوگ ان مغالطوں کے شکار ہو گئے میں چاہتا ہوں کہ ان روایتوں پر ایک اجمالی تبصرہ کر دوں۔

سہولت کے لئے روایات کے اس ذخیرہ کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا جاتا ہے ایک حصہ تو صرف خود تراشیدہ فرضی روایات کا ہے ہم ان کی تعبیر مضحکات سے کریں گے کیونکہ ان کو ہنسی کر کوئی شخص اپنی ہنسی مشکل ہی سے ضبط کر سکتا ہے اور جن صحیح روایات سے ناجائز نفع اٹھاتے ہوئے مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی۔ ان کو ہم "مغالطات" کے عنوان کے نیچے درج کریں گے۔

مثلاً (۱) کہا جاتا ہے کہ قرآنی آیت "قفوهم انهم مسئولون" کے آخر میں "عن ولایة علی" کے الفاظ تھے جنہیں عہدِ عثمانی میں قصداً قرآن سے خارج کر دیا گیا یعنی قرآن میں یہ لکھا ہوا تھا کہ میدانِ حشر میں لوگوں کو کھڑا کر کے علی کی ولایت کے متعلق پوچھا جائے گا۔

۲۔ اسی طرح کوئی صاحب محمد بن جہم الہلالی تھے امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے انھوں نے یہ مشہور کیا کہ قرآنی آیت "امۃ ھی اربیٰ من امۃ" میں تحریف کی گئی ہے اصلی الفاظ "ائمتنا ھی ازکی من ائمتکم"[۱] تھے۔

۳۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ قرآن میں قبیلۂ قریش کے ستر نام بقید نسب موجود تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کو ساقط فرما دیا۔

۴۔ اسی طرح "کفی اللہ المؤمنین القتال" کی آیت میں کہتے ہیں کہ علی ابن طالب کے الفاظ بھی تھے[۲]۔ اسی قسم کی بیسیوں خرافات اس طبقہ کی طرف سے پھیلائی گئیں اگر مسلمانوں کے پاس حدیثوں کے جانچنے کا خاص طریقہ راویوں کی تحقیق کے متعلق نہ ہوتا تو ان جھوٹی قطعاً جعلی روایتوں کے متعلق بے بنیاد اور محض گپ ہونے کا فیصلہ آسان نہ ہوتا ان لوگوں نے حد کر دی کہ الفاظ ہی نہیں بلکہ کہتے ہیں کہ سورہ ولایت کے نام سے ایک مستقل سورت ہی قرآن میں تھی جس میں اہل بیت کے اسماء اور ان کے حقوق وغیرہ کا تفصیلی ذکر تھا حضرت عثمان نے اس پوری سورت ہی کو حذف کر دیا بہرحال اس شیعی عالم نے جس کا پہلے بھی میں نے ذکر کیا ہے یعنی علامہ طبرسی نے ان ساری گپوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

---

[۱] ہمارے بنی ہاشم کے ائمہ و حکمران بنی امیہ کے حکمرانوں سے بہتر ہیں ۱۲ [۲] جس کا مطلب یہ ہوا کہ جنگ کے لئے خدا اور علی مسلمانوں کی طرف سے کافی ہو گئے۔

الزیادة فی القرآن مجمع علی بطلانها	قرآن میں غیر قرآنی عنصر کا اضافہ یہ مسئلہ تو اجماعی و اتفاقی
واما النقصان نقل رویٰ عن قوم	ہے (شیعوں اور سنیوں دونوں کا ہے) کہ ایسا نہیں
من اصحابنا وعن قوم من حشویة العامة	ہوا باقی کمی (یعنی قرآن کی کچھ آیتیں حذف ہوگئیں) سو
والصحیح خلاف ذلک	ہمارے ہاں کے بعض لوگ (یعنی بعض شیعی مسلک رکھنے
اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ	والے) اور عامہ یعنی سنیوں کے بعض حشویے اسکا دعویٰ
	منقول ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ بھی غلط ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ " ان علینا جمعہ " کی ذمہ داری جب خود خدا لے چکا ہے اور بالاتفاق شیعہ و سنی دونوں کے نزدیک یہ قرآن کی آیت ہے تو قرآن سے کسی چیز کے نکل جانے کے دعوے کے بعد آدمی مسلمان ہی کب باقی رہتا ہے بقول شیعی عالم علامہ طبرسی تواتر و توارث کی جس راہ سے قرآن مجید منتقل ہوتا ہوا چلا آرہا ہے اس کا مقابلہ بھلا یہ خود تراشیدہ افسانے کہاں تک کر سکتے ہیں۔

مغالطات | رہا روایتوں کا دوسرا حصہ جنہیں میں مغالطات کہتا ہوں دراصل انھیں کی طرف طبرسی نے اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ عامہ کے حشویہ یعنی اہل سنت کے محدثین میں بھی نقص کی بعض روایتیں پائی جاتی ہیں یعنی ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں جو پہلے قرآن میں شریک تھیں بعد کو حذف ہوگئیں لیکن ابھی آپ کو معلوم ہوگا کہ بجائے خود یہ روایتیں غلط نہیں ہیں بلکہ ان سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا وہ بدنیتی یا کم از کم غلط فہمی پر ضرور مبنی ہے بقدر ضرورت ان میں جو چیزیں قابل ذکر ہیں ان کا قصہ بھی سن لیجئے۔

اس سلسلہ میں مختلف نوعیت کی روایتیں ہیں۔ مثلاً

(۱) بعض روایتوں میں کسی غیر قرآنی حکم کا ذکر کرتے ہوئے اس قسم کے الفاظ یعنی

لے مقدمہ روح المعانی ص ۲۴ مضحکات میں جو کچھ نقل کیا گیا ہے روح المعانی کے مقدمہ سے ماخوذ ہے۔

فی ما انزل من القرآن — یہ اسی سلسلہ اور راہ کی چیز ہے جس راہ سے قرآن نازل ہوا

جیسے الفاظ راوی نے بڑھا دیے ہیں اس کی مثال رضاعت والی روایت جو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے الفاظ جس کے یہ ہیں، یعنی وہ فرماتی تھیں کہ

فیما انزل من القرآن عشر رضاعات معلومات یحرمن ثم نسخن بخمس معلومات فتوفی صلی اللہ علیہ وسلم وہی فیما یقرء من القرآن

ان ہی باتوں میں جو اسی راہ سے نازل ہوئی ہیں جس راہ سے قرآن نازل ہوا، یہ حکم بھی تھا کہ دس گھونٹ یا دس دفعہ دودھ پینا حرام کر دیتا ہے پھر منسوخ ہو گیا یہ حکم "پانچ مقررہ گھونٹ سے" اور وفات پا گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ حکم ان ہی باتوں میں شریک تھا جن میں قرآنی حکم شریک ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ بجز بخاری کے صحاح ستہ کی عام کتابوں میں یہ روایت پائی جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ فی ما انزل من القرآن یا فی ما یقرء من القرآن کے الفاظ سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ یہ قرآن کے اجزاء تھے

تفصیل کا موقع نہیں مگر اجمالاً اتنی بات سے تو ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو احکام و قوانین امت کو عطا کیے جاتے تھے ان میں ایک سلسلہ تو ان احکام کا تھا جن کی تعلیم حق تعالیٰ کی طرف سے جبریل علیہ السلام آنحضرت صلعم کو دیا کرتے تھے اور دوسرا سلسلہ احکام ہی کا ایسا بھی تھا جن میں پیغمبر خود اپنے اجتہاد سے کام لیتے تھے اگرچہ "اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" کے لحاظ سے ہم دونوں کو وحی ہی سمجھتے ہیں، بہرحال ظاہر ہے کہ وحی کا وہ سلسلہ جو جبرئیل امین کی راہ سے جاری تھا وہ اپنی الگ نوعیت رکھتا تھا۔ پھر جبریل امین کی راہ سے جو چیزیں آ رہی تھیں ہر ایک جانتا ہے کہ ان کی بھی دو قسمیں تھیں یعنی ایک تو قرآن اور قرآنی آیات کا سلسلہ، اور دوسرا سلسلہ جبریل امین ہی کے ذریعہ سے وہ بھی جاری تھا جو قرآن کا جز نہیں بنتا تھا گویا منطقی طور پر یوں کہہ لیجئے

کہ قرآن تو وہ ہے جو جبریل کے ذریعہ نازل ہوا لیکن ہر وہ چیز جو جبریل کے ذریعہ سے نازل ہوئی تھی اس کا قرآن ہونا ضروری نہ تھا آخر ایمان اسلام و احسان کے متعلق سوال و جواب کا قصہ بخاری وغیرہ میں ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اتاکم جبرئیل یعلمکم دینکم — تمہارے پاس جبریل آئے تھے تم کو تمہارا دین سکھانے کے لئے۔

ظاہر ہے کہ جبریل نے اس وقت جو کچھ دین کے متعلق سکھلایا تھا یقیناً وہ قرآن میں شریک نہیں کیا گیا اور یہی ایک روایت کیا اکثر چیزیں اسی قسم کی بتوسط جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں لیکن وہ قرآن میں شریک ہونے کے لئے نازل نہیں ہوئی تھیں اسی لئے قرآن میں شریک نہیں کی گئیں

اسی بنیاد پر فی ما انزل فی القرآن سے راوی کا مقصد یہ ہے کہ یہ مسئلہ آنحضرت صلعم کے اجتہادی مسائل میں سے نہ تھا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ جس راہ سے قرآن نازل ہوا ہے اسی راہ سے یہ حکم بھی اللہ تعالیٰ کے رسول تک پہنچا تھا۔ اور یہ کہ قرآن تو جس راہ کی چیز سمجھ کر پڑھا جاتا ہے اسی راہ کی چیز یہ بھی ہے اور یہی معنی ہیں فیما یقرء من القرآن کے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ روایت وہ ہے جس میں اس کا ذکر ہے یعنی شادی شدہ آدمی سے زناء کا صدور جب ہو تو سنگساری کا حکم اسلام میں جو دیا گیا ہے اس کے متعلق بخاری شریف میں ایک طویل حدیث اس سلسلے میں پائی جاتی ہے حاصل جس کا یہ ہے کہ حج کے موسم میں حضرت عمر کو اس کی خبر ملی کہ بعض لوگ ان کی وفات کے بعد خلافت کے متعلق کچھ منصوبے پہلے سے تیار رہے ہیں اور حضرت ابوبکر کے انتخاب پر کچھ اعتراض بھی کرتے ہیں، حضرت عمر نے پہلے تو چاہا کہ حج ہی کے موقعہ پر ایک تقریر کریں لیکن بعد کو رائے بدل گئی اور مدینہ پہنچ کر آپ نے جمعہ کے خطبہ میں ان ہی باتوں کا ذکر فرمایا جن

کا تذکرہ حج کے موقعہ پر کرنا چاہتے تھے، یہ بڑی طویل تقریر ہے جس میں بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں اسی میں ابوبکر صدیق کی خلافت کا بھی ذکر آپ نے فرمایا اور مسلمانوں کو اس کی وصیت کرتے ہوئے کہ میرا کیا ٹھکانہ ہے آج ہوں کل نہ ہوں اس لئے چند ضروری باتوں کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں۔ اسی سلسلہ میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ رجم کا قانون اگرچہ قرآن میں نہیں پایا جاتا مگر میں گواہی دیتا ہوں کہ

کان مما انزل اللہ — یہ قانون بھی ان ہی باتوں میں سے ہے جنھیں اللہ نے نازل فرمایا۔

پھر یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قانون کو ہم نے سیکھا پڑھا اور یاد کیا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل بھی کیا اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ اسی کے بعد آپ نے زور دے کر کہا کہ قرآن میں نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ یہ خدا کے نازل فرمودہ قوانین میں نہیں ہے بلکہ یہ خدا ہی کا برحق کیا ہوا واجب قانون ہے آخر میں فرمایا کہ بس چاہئے کہ مرد ہوں یا عورت شادی شدہ ہونے کے بعد جو بھی زنا کا ارتکاب کرے اور ثابت ہو جائے تو اس کو رجم (سنگسار) کیا جائے یہ عجیب بات ہے کہ اسی کے بعد آپ نے یہ بھی فرمایا کہ

انا کنا نقرء فیما نقرء من کتاب اللہ ان لا ترغبوا عن اٰبائکم فانہ کفر بکم ان ترغبوا عن اٰبائکم — جس راہ کی چیز سمجھ کر کتاب اللہ (قرآن) کو ہم پڑھتے ہیں اسی سلسلے کی چیزوں میں ہم یہ بھی پڑھتے تھے کہ اپنے باپوں سے اعراض نہ کرو، کیونکہ اپنے باپوں سے اعراض تمہارے لئے کفر ہے۔

پھر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ جیسے عیسائی حضرت عیسیٰ کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تم بھی میری تعریف میں اس قسم کے اطراء اور غلو سے کام نہ لینا یہیں سے اس دوسری بات کو عجیب بات اس لئے کہا کہ مذہب کے متعلق تو

صرف "ما انزل اللہ" حضرت عمرؓ نے کہا تھا اگر یہ بات لوگوں سے اعراض کرنے کے متعلق جو الفاظ آپ نے فرمائے
اس میں کنا نقرء فیما نقراء من کتاب اللہ" کے الفاظ ہیں لیکن ان الفاظ کے متعلق مسلمانوں میں اس کا
کسی نے کبھی چرچا نہ کیا جیسا کہ رجم والے الفاظ کے متعلق پھیلا دیا گیا کہ پہلے وہ قرآن میں موجود تھے اور طرفہ
تماشا یہ ہے کہ قرآن سے الفاظ تو خارج کر دیے گئے لیکن قانون کو جیسا کہ سب جانتے ہیں قیامت تک کے
لئے باقی رکھا گیا اور بس کرنے والوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ الفاظ کا ایک مجموعہ بھی بنایا گیا مدرسوں میں
آج تک مشہور ہے کہا جاتا ہے کہ قرآن میں قانون رجم کے متعلق یہی الفاظ تھے الفاظ کا وہ مجموعہ یہ ہے۔

الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما — کوئی بڈھا اور بڈھی جب زنا کریں تو دونوں کو سنگسار
کردو۔

بعضوں میں "البتۃ" کے لفظ کا اضافہ بھی پایا جاتا ہے خدا کا شکر ہے کہ صحیحین (بخاری و مسلم) میں یہ الشیخ
والشیخۃ والی روایت نہیں پائی جاتی بلکہ ابو داؤد۔ ترمذی وغیرہ میں بھی نہیں ہے اس روایت کے راویوں
کی حالت کیا ہے اس سے اگر قطع نظر بھی کر لیا جائے پھر بھی میں تو اس کو قرآن مجید کا گویا معجزہ ہی خیال کرتا
ہوں کہ روایت کے الفاظ ہی سے اس قانون کی تردید ہو جاتی ہے جس کے لئے بتلانے والوں نے ان عجیب
وغریب الفاظ کے مجموعہ کو بنایا ہے آپ سن چکے اور دنیا جانتی ہے حضرت عمرؓ کے الفاظ ابھی گذر رہے ہیں
کہ "رجم کا قانون شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے لئے ہی ہے مگر اب ذرا روایت کے ان الفاظ پر
غور کیجئے الشیخ (بڈھا) الشیخۃ (بڈھی) ایسے الفاظ ہیں جن کے لئے ضروری نہیں کہ وہ شادی شدہ ہوں
پھر نتیجہ کیا ہوا ایسے بڈھے اور بڈھی عورت جن کی شادی نہیں ہوئی ہو ان الفاظ کی بنیاد پر چاہئے کہ ارتکاب
زنا کے جرم میں سنگسار کر دیے جائیں اور جوان مرد اور جوان عورت شادی شدہ ہی کیوں نہ ہوں چونکہ
الشیخ اور الشیخۃ کے الفاظ ان پر صادق نہیں آتے اس لئے رجم کا قانون ان کے لئے باقی نہ رہا اور یہی کیا رجم
اس روایت کی بنا پر صرف اسی زنا سے متعلق ہوگا، جب طرفین بڈھے اور بڈھی ہوں لیکن ایک طرف

بڈھا اور دوسری طرف جوان یا بالعکس ہو تو اس پر بھی یہ قانون عائد نہ ہوگا اور سچی بات تو یہ ہے کہ شیخوخت عربی زبان میں عمر کے جس حصہ کی تعبیر ہے، یہ عمر کا وہ زمانہ ہے جس میں عموماً جنسی خواہش کا زور کم کیا بلکہ بسا اوقات مفقود بلکہ حد نفرت کو بھی پہنچ جاتا ہے جوان عورت کے ساتھ تو ممکن ہے کوئی بڈھا مشغول ہو جائے یا بالعکس میں بھی امکان ہے مگر جب دونوں پھوس بوڑھے ہوں یعنی الشیخ والشیخہ بن چکے ہوں تو زناء کے صدور کا امکان ہی کیا باقی رہتا ہے پس مطلب یہ ہوا کہ سرے سے رجم کا قانون ہی غیر عملی بن کر ان الفاظ کی بنیاد پر رہ جاتا ہے، رجم کے قانون کو ثابت کرنے کے لئے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا گیا جس سے اس قانون کی بنیاد ہی منہدم ہو کر رہ گئی، میں لوگوں کو کیا کہوں، بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی قانون رجم کا ذکر فرماتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں فرماتے تھے کہ

ان ازید فی کتاب اللہ   میں اللہ کی کتاب میں اضافہ کرنے کا فعل کردوں گا۔

یہ بھی فرماتے کہ اس کا خطرہ اگر نہ ہوتا تو قانون کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ قرآن کے کم از کم حاشیے پر اس کو لکھدیا جاتا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس کے متعلق کہہ رہے ہوں کہ قرآن میں اس کے داخل کرنے سے اضافہ ہوگا یعنی جو چیز قرآن کا جز نہیں ہے وہ قرآن کا جز بن جائے گی مگر لوگ ہیں کہ یہی کہتے جاتے ہیں کہ قرآن ہی کا جز رجم کا قانون[1] تھا اور مغالطہ کس سے ہوا؟ صرف کان مما انزل اللہ کے الفاظ سے ہوا

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ جلد (تازیانہ) کی قرآنی سزا جرم زناء کے متعلق قرآن میں نازل ہو چکی تھی اور اسی بناء پر آدمی کنوارا (غیر محصن) ہی کیوں نہ ہو اگر زناء کا مجرم ہوگا جلد (تازیانے) کی سزا کا مستحق وہ ہو جاتا ہے، مگر قدرتاً یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی شدہ یعنی محصن زناء سے بچانے والی چیز یعنی بیوی رکھتے ہوئے بھی اس جرم کا اگر مجرم ہو تو اس کا جرم اس کنوارے سے یقیناً زیادہ سخت ہے جو اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے ذریعہ (بیوی) سے محروم ہے گویا شادی شدہ (محصن) صرف زناء ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ شرارت کا مرتکب ہے، اسی لئے صرف زناء کی جو سزا ہے یعنی تازیانے کی سزا سے زیادہ سخت سزا کا طالب خود اس کا جرم ہے زناء کے جرم سے زیادہ شادی شدہ آدمی کے اندر جو شرارت اور بے باکی کی کیفیت پائی جاتی ہے اسی کا اقتضاء یہ ہوا کہ اس کی سزا میں بھی سختی کا اضافہ کر دیا جائے۔ رجم اس قدرتی اقتضاء کی تکمیل

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

مگر آپ دیکھ چکے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے آخر اسی روایت میں تو رغبت عن الآباء والے حکم کو بھی تو حضرت عمرؓ نے اس سے بھی زیادہ تیز تر الفاظ یعنی "کنا نقرء فیما نقرء من کتاب اللہ" کے ذریعہ اپنے مطلب کو ادا کیا ہے لیکن اس کا چرچا لوگوں نے کیوں نہیں پھیلایا بڑے بڑے مولوی بھی شاید اس کا استحضار نہ رکھتے ہوں حالانکہ اس قسم کے الفاظ کا مطلب جو کچھ ہوتا ہے حضرت عمرؓ کے بیان کے اسی حصہ سے لوگوں کو سمجھنا چاہئے تھا میں کیا عرض کروں بیر معونہ میں حفاظ قرآن کی کافی تعداد جو کہ شہید ہوئی حدیثوں میں اس قصہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت انسؓ فرمایا کرتے تھے کہ یہ بے چارے بحالت غربت جو شہید ہوئے تو

فاخبر جبرئیل علیہ السلام النبی صلی اللہ علیہ وسلم انھم لقوا ربھم فرضی عنھم وارضاھم	جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ حفاظ قرآن کی یہ جماعت اپنے پروردگار سے جا کر مل گئی ہیں اللہ ان سے راضی ہوا اور ان لوگوں کو خدا نے بھی خوش کر دیا۔

روایت کے بعض الفاظ میں ہے کہ خود ان شہید ہونے والے حفاظ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا قتل ہونے سے پہلے کی تھی کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہے۔ اسی لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی جیسا کہ بخاری میں ہے فرمایا کرتے تھے کہ رجمتها بسنة رسول الله" (یعنی محصن کی سزا رجم جو میں نے دی تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے نہ کہ قرآن کے حکم پر۔ اس کی بنیاد کیا ہے رہا یہ کہ قرآن میں خالص زنا ہی کا حکم کیوں اترا، اور زنا کے جرم میں احصان کی وجہ سے جو سختی بڑھ جاتی ہے اس حکم کو رسول اللہ کی سنت کے سپرد کیوں کر دیا گیا قانونی نزاکتوں سے جو واقف ہیں اس کی مصلحت کو سمجھ سکتے ہیں جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے ۱۲۔

اَللّٰھُمَّ اَبلِغ عَنَّا نَبِیَّنَا اِنَّا قَد لَقِینَاکَ فَرَضِینَا عَنکَ وَرَضِیتَ عَنَّا — اے اللہ ہمارے نبی کو مطلع کر دیجئے کہ آپ سے ہم مل گئے ہیں۔ ہم آپ سے راضی اور خوش ہوتے اور آپ ہم سے راضی اور خوش ہوئے۔

اس روایت کا ذکر کرکے حضرت انس کہا کرتے تھے کہ ہم ان الفاظ کو یعنی ان شہداء کی دعاء کے ان الفاظ کو جس کی خبر جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ رسول اللہ کو ملی تھی کنا نقرء یعنی پڑھا کرتے تھے لیکن نقرء کے لفظ سے بعضوں کو مغالطہ ہوا کہ شاید یہ بھی قرآن کا جزء تھا، حالانکہ اب دیکھ رہے ہیں کہ اس کی توضیح بھی وہی "دیما انزل من القرآن" یا کنا نقرء فیما نقرء من کتاب اللہ" کی ہے یعنی جبرئیل علیہ السلام کے توسط سے رسول اللہ تک یہ پہنچا تھا۔

(۲) مغالطات کے سلسلہ میں میرے نزدیک ایسی روایتیں بھی شامل ہیں جن میں صحابی نے کسی قرآنی آیت کا مضمون اور مطلب اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے قرآن کی طرف اس مطلب کو منسوب کر دیا ہے ہم لوگ یعنی جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے اردو میں قرآنی آیتوں کا مطلب بیان کرتے ہیں لیکن صحابہ ظاہر ہے کہ مطلب ومعنی کو بھی عربی زبان ہی میں ادا کیا کرتے تھے بعضوں کو اسی سے مغالطہ ہو گیا کہ وہ ان تفسیری الفاظ کو بھی قرآن کا جز قرار دیتے تھے اس کی ایک اچھی مثال یہ روایت ہو سکتی ہے یعنی ایک صحابی نے بیان کیا کہ قرآن میں ہم نے پڑھا ہے کہ

لو کان لابن آدم وادیا من مال لابتغی الیہما ثانیا الحدیث — یعنی آدم کے بیٹے کے پاس ایک ندی برابر مال ہو تو چاہے گا دوسری ندی بھر بھی مال اس کو مل جائے آخر حدیث تک

اس میں شک نہیں کہ بجنسہ یہ الفاظ قرآن میں نہیں ہیں لیکن

اِنَّ الاِنسَانَ خُلِقَ ھَلُوعًا — قطعاً انسان بڑا بے صبرا پیدا کیا گیا۔

(۱) حقیقت یہ ہے کہ "ھلوع" کا عربی لفظ جن مطالب پر مشتمل ہے "بے صبرا" کے لفظ سے وہ صحیح طور پر ادا نہیں ہوتا (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

قرآن کی مشہور آیت ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ھلوع کا مطلب وہی ہے جسے صحابی نے مذکورۂ بالا الفاظ میں ادا کیا پھر اسی مضمون کو انھوں نے قرآن کی طرف منسوب کر کے اگر بیان کیا تو اس سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ ان کا خیال یہ تھا کہ بجنسہٖ یہی الفاظ قرآن میں پائے جاتے ہیں آخر روزمرہ کی یہ بات ہے کہ عام گفتگو میں وعظوں میں تقریروں میں لوگ مضمون بیان کر کے کہتے ہیں کہ ایسا قرآن میں آیا ہے لیکن یہ کتنی بڑی حماقت ہو گی اگر سننے والا قرآنی آیت کے حاصل مطلب کے بجنسہٖ ان ہی الفاظ کو قرآن میں تلاش کرنے لگے

(۳) مغالطہ کی اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ قرآن سناتے ہوئے بعض دفعہ صحابی بیچ میں تفسیر طلب الفاظ کی تفسیر بھی کرتے چلے جاتے تھے ہندوستانی علماء بھی بکثرت اس کام کو کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے تفسیری الفاظ اردو میں ہوتے ہیں اس لیے سب جانتے ہیں کہ درمیان کے الفاظ قرآنی الفاظ کی تفسیر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا صحابہ کی مادری زبان بھی چونکہ وہی تھی جو قرآن کی زبان ہے اس سے بعضوں نے تفسیر کے ان عربی الفاظ سے یہ غلط نتیجہ اٹھانا چاہا اور مشہور کردیا کہ فلاں صحابی قرآن کے ان الفاظ کے بعد ان چند الفاظ کا اور اضافہ بھی کرتے تھے حضرت ابی بن کعب صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ یہی صورت پیش آئی یعنی وہ سورہ "البینۃ" سنا رہے تھے، جب قرآن کے الفاظ

وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین — اور نہیں حکم دیا گیا ان کو، لیکن صرف اس کا کہ پوجے

لہ الدین حنفاء — چلے جائیں اللہ کو دین کو اسی اللہ کے لئے خالص بنا کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جب تک سطر وسطر میں ان کی تشریح نہ کی جاتے اس موقع پر ایک لطیفہ کا خیال آیا کہ مولوی [illegible] علی [illegible] مرحوم کا ایک مشہور شعر ہے کہ "خدا فرما چکا قرآن کے اندر مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر" ایک فقیر اسی شعر کو گا گا کر بھیک مانگ رہا تھا جو [illegible] بولے کہ قرآن میں یہ کہاں ہے میں نے عرض کیا کہ بھائی یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ" (اے لوگو تم سب اللہ کے محتاج ہو) اس کا مطلب یہی تو ہے مگر وہ یہی کہتے رہے "مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر" ان الفاظ کو قرآن میں بتاؤ۔ مناظر احسن ۱۲

بالکلیہ اسی کی طرف جھکتے ہوئے۔

پر پہنچے تو "مخلصین لہ الدین" یعنی دین کو اللہ کے لئے خالص بنانے کا مطلب سمجھانے لگے جس کا حاصل یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی مبارک اور اس کی خوشنودی کا حاصل کرنا ہی الدین اور مذہب کا صحیح اور خالص نشا ہے باقی بعض لوگ جیسے رنگ نسل وطن زبان وغیرہ کو فرقہ داری دھڑا بندیوں کا آلہ بنا لیتے ہیں اسی طرح ایک طریقہ تقسیم کا یہی دین اور مذہب کو بنا لیا جاتا ہے بجائے رضاء حق کے قومی تعمیر کا صرف ایک ذریعہ مذہب رہ جاتا ہے اس زمانے میں یہودیت نصرانیت مجوسیت وغیرہ مذاہب مرضی حق تک پہنچنے کا نہیں بلکہ قومی عصبیت کے ابھارنے کے ذرائع بنے ہوئے تھے اسی توضیحی وتفسیری مطلب کو عربی زبان میں حضرت ابی بن کعب نے ان الفاظ میں ادا کیا کہ

ان الدین عند اللہ الحنیفیۃ المسلمۃ لا الیھودیۃ ولا النصرانیۃ ولا المجوسیۃ	دین خدا کے نزدیک وہی معتبر ہے جس میں حنفیت (یعنی خدا کی طرف یکسوئی کی گرویدگی جو حنفاء کا مطلب ہے) اور مسلمیت (یعنی اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سپرد کر دینا ہے) یہ یہودیت نہ نصرانیت نہ مجوسیت (یعنی صرف ان مذہبی اقوام کی تقسیم کا آلہ مذہب کو بنا لینا یہ دین کا خلاصہ نہیں ہے)

مسند احمد کے حوالہ سے جمع الفوائد میں نقل کیا ہے کہ ان الفاظ کو کہنے کے بعد

ثم ختم ما بقی من السورۃ	پھر ابی نے ان الفاظ کے بعد سورہ البینۃ کو ختم کیا

بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ درمیان کے تفسیری الفاظ کو فرمانے کے بعد حضرت ابی بن کعب نے سورہ کو ختم کیا واقعہ کی صورت کل یہی ہے آپ ہی بتائیے کہ مغالطے کے سوا اس کو اور کیا کہا جا سکتا ہے اگر حضرت ابی کے ان تفسیری الفاظ کے متعلق محض اس لئے کہ وہ عربی زبان کے الفاظ ہیں یہ وسوسہ

دلوں میں کوئی ڈالے کہ ابی بن کعب کے نزدیک قرآن ہی کے اجزاء (العیاذ باللہ) یہ الفاظ تھے۔
واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان سے تھوڑا بہت بھی لگاؤ جو رکھتا ہے سننے کے ساتھ ہی سمجھ سکتا ہے۔
کہ زربفت میں یہ ٹاٹ کا پیوند بن جائے گا، اگر خدا نخواستہ حماقت سے یہ سمجھ جائے یہ قرآنی الفاظ
ہیں ان ساری روایتوں کے الفاظ کا یہی حال ہے وہ خود بے چارے پکار رہے ہیں کہ قرآنی عبارت
سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا،

(۳) اسی سلسلہ کی بعض غیر مستند تاریخی روایتوں میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ

ان ابن مسعود کان ینکر کون سورۃ الفاتحۃ والمعوذتین من القرآن (تبیان الجزائری ص۹۶)	حضرت ابن مسعود عمانی سورۃ فاتحہ یعنی الحمد اور معوذتین یعنی قل اعوذ برب الناس اور قل اعوذ برب الفلق والی سورتوں کے متعلق کہتے تھے کہ یہ قرآن کے اجزا نہیں ہیں

بالفرض ابن مسعودؓ کی طرف مان لیا جائے کہ یہ انتساب صحیح بھی ہو اور قرآن میں جو تواتر کی قوت پائی
جاتی ہے اس کا مقابلہ یہ تاریخی روایت فرض کر لیجئے کہ کر بھی سکتی ہو جب بھی کیا اس کا وہی مطلب
ہے جو ظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے واقعہ یہ ہے کہ سورہ فاتحہ جس کا قرآنی نام السبع المثانیؔ ہے
قرآن میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے

ولقد اتیناک سبعا من المثانی والقرآن العظیم	ہم نے تم کو دا ے پیغمبر) سبع مثانی (یعنی سورہ فاتحہ دی) اور قرآن عظیم دیا۔

---

[1] سبع کے معنی سات ہیں اور مثانی ایسی چیز کی تعبیر ہے جو دو دو دفعہ دہرائی جائے چونکہ سورہ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے اور اس کی خواندگی کا قانونی دستور یعنی نمازیں پڑھنے کا یہی ہے کم از کم دو دفعہ دوبارہ الٰہی میں دہرائی جائے اسی لئے بتیراء یعنی ایک رکعت کی نماز ممنوع ہے مثانی کہنے کی وجہ یہی ہے ۱۲۔

جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سورہ فاتحہ کی حقیقت "القرآن العظیم" کے مقابلہ میں جُدا رنگ رکھتی ہے جس کی وجہ ظاہر بھی ہے کہ سورۂ فاتحہ کی حیثیت درخواست کی ہے جو خدا کے دربار کی حاضری کے وقت یعنی نماز میں بندہ کی طرف سے خدا کی بارگاہ میں پیش ہوتی ہے اور الحمد سے والناس تک اسی کا جواب دیا گیا ہے[1] ابن مسعودؓ نے بھی اگر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمادیا ہو کہ سورۂ فاتحہ "القرآن العظیم" سے الگ حیثیت رکھتی ہے تو اس کا مطلب یہ لینا کیسے صحیح ہوگا کہ سورۂ فاتحہ کے الفاظ کی وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح نہیں ہوئی تھی جیسے باقی قرآن کی وحی ہوئی ہے۔

انھیں روایتوں میں ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے

انما امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ ان
ان یتعوذ بھما	دونوں سے تعوذ (پناہ گیری) کا کام لیا جائے

مطلب یہ تھا کہ ان سورتوں کا نزول تعوذ (پناہ گیری) کے لئے ہوا ہے اس لئے دوسری سورتوں کے مقابلہ میں ان کی جداگانہ حیثیت تھی میرے نزدیک تو ان الفاظ سے معوذتین کی اہمیت کو ابن مسعودؓ واضح کرنا چاہتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ کسی قسم کی مصیبت دنیا میں پیش ہو ان دونوں سورتوں کے مضامین پر غور کرنے سے تسلی مل جاتی ہے بہرحال اگر ان روایتوں کی تاریخی ضعف اور اسنادی کمزوریوں سے قطع نظر بھی کر لیا جائے جب بھی ابن مسعودؓ کے اس بیان کا یہ مطلب لینا کہ وہ ان سورتوں کو حق تعالیٰ کے فرمودہ اور نازل کردہ الفاظ نہیں سمجھتے تھے قطعاً ان پر بہتان ہیں اور بدترین قسم کی مغالطہ بازی ہے کیا کسی حیثیت سے بھی کسی کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ کوئی اور سورہ نہیں بلکہ

---

[1] سندی حالت اس روایت کی جو کچھ ہے یہ مسئلہ اور سورہ فاتحہ و معوذتین جن خصوصی حقائق و معارف پر مشتمل ہیں حضرت الاستاذ گیلانی کی کتاب اور ان کے تفسیری محاضرات میں آپ کو اس کی پوری تفصیل مل سکتی ہے ۱۲۔

سورہ فاتحہ جیسی سورہ جو نماز کی ہر رکعت میں دن کے پانچ وقتوں میں دہرائی جاتی ہے اسی کو سمجھتے تھے کہ قرآن کا جزء نہیں ہے۔ کچھ اسی قسم کا مغالطہ حضرت ابی بن کعب صحابی کی طرف اسی تعداد کے متعلق ہوا جس میں یہ ہے کہ ان کے قرآنی نسخہ میں وہ دونوں دعائیں جو قنوت میں عموماً پڑھی جاتی ہیں لکھی ہوئی تھیں اسی بناء پر یہ غلط فہمی پھیلانے کی بھی بعضوں نے کوشش کی کہ ان دعاؤں کو ابی بن کعب قرآن کے اندر داخل سمجھتے تھے یعنی جیسے دوسری قرآنی سورتیں ہیں اسی طرح دو سورتیں قرآن کی یہ دونوں دعائیں بھی ہیں۔

آج بھی تو قرآن کے آخر میں مختلف قسم کی دعائیں خصوصاً ختم قرآن کی دعاء عموماً لکھی ہوئی رہتی ہے کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ دعائیں قرآن میں شریک ہیں اگر روایت صحیح بھی ہو تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اہمیت کی وجہ سے ابی ابن کعب نے اپنے قرآن کے آخر میں ان دونوں مسنونہ دعاؤں کو لکھ لیا ہوگا اور سچ تو یہ ہے کہ روایت ہی بے سر و پا ہے میں نے بھی اس کا ذکر صرف تکمیل مضمون کے لئے کر دیا ورنہ یہ روایت تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ ایک سنجیدہ آدمی اس کا ذکر کرے

ایک ذیلی بحث اور خاتمہ:۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن تو خیر خدا کی کتاب ہے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی تصنیف کردہ کتابوں مثلاً سعدی کی گلستان ہی کو لیجئے یا اسی جیسی کوئی دوسری کتاب ان کے پڑھنے والوں کو کبھی نہیں دیکھا کہ پڑھنے سے پہلے وہ اس کی ٹوہ میں لگے ہوں کہ مصنف نے کتاب کے کس باب کو پہلے لکھا اور کس کو بعد میں یا ہر باب کی فصلوں کی عبارتوں میں کس عبارت کی یادداشت پہلے جمع ہوئی اور کس کی بعد میں بلکہ عام قاعدہ یہی ہے کہ مصنف کی طرف سے کتاب پڑھنے والوں کے سامنے جس شکل میں پیش ہوتی ہے اسی آخری شکل کو کتاب کی واقعی شکل قرار دیکر لوگ پڑھنا پڑھانا شروع کر دیتے ہیں

(باقی آئندہ)

قدرتی نظام اجتماع

(از جناب مولوی محمد ظفیر الدین صاحب پورہ نوڈیہاوی استاد دار العلوم معینیہ)

(۲)

ان حدیثوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جماعت کی نماز کی بہت سخت تاکیدیں کی ہیں اس راہ میں مشقت و دقت کی پرواہ نہ کرنا چاہئیے، تا آنکہ بیمار وغیرہ جیسے معذورین کے لئے مسجد پہنچنا ممکن ہو تو اس کے لئے بھی مستحب ہے کہ مسجد ہی آئے۔ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی آپ تارک جماعت کو جلا مار ڈالتے اگر آپ کو عورتوں اور چھوٹے بچوں کا خیال نہ ہوتا (مشکوٰۃ باب الجماعۃ)

جو لوگ اذان سنتے ہیں پھر بھی جماعت کی نماز کے لئے مسجد میں حاضری نہیں دیتے ان کے متعلق تہدیداً یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ان کی نماز ہی قبول نہیں ہوتی مگر یہ اس وقت جب اس کو کوئی عذر درپیش نہ ہو (ابوداؤد)

نظم جماعت میدان کارزار میں | یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام بجان و دل جماعت کی نماز پر فدا تھے جان سے بڑھ کر پیاری اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟ گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے، میدانِ کارزار گرم ہے اور گردنیں کٹ کٹ کر گر رہی ہیں مگر اس وقت بھی اس دینی شیرازہ بندی کے توڑنے کی اجازت نہیں ملتی ہے بلکہ وہاں بھی سب حتی الوسع ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں اور ممکن حد تک نباہنے کی سعی کرتے ہیں

حضرت سالم بن عبداللہؓ اپنے باپ عبداللہ بن عمرؓ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میرے باپ نے کہا کہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ (جہاد) میں شریک کار تھا اس میں دشمنوں کی ہم سے مڈبھیڑ ہو گئی، چنانچہ ہم میدان میں نکل پڑے، نماز کا وقت آیا تو ہم دو حصوں میں بٹ گئے، ایک گروہ آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہو گیا اور دوسرا دشمنوں کے مقابل ڈٹا رہا، پہلا گروہ جب آپ کے ساتھ ایک رکعت نماز پوری کر چکا تو یہ دشمنوں کے مقابلہ میں آ گیا اور دوسرے گروہ نے آپ کے ساتھ آ کر ایک رکعت نماز پڑھی، آپ نے اپنی نماز پوری کر کے سلام پھیر لیا اور اس کے بعد ہر ایک نے اپنی اپنی بقیہ ایک رکعت پوری کی
مشرکین عرب کو یقین تھا کہ ان جاں نثاران اسلام کو نماز اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان سے زیادہ پیاری ہے اس لئے وہ قصداً اوقات نماز میں سخت سے سخت حملہ کرنے کی کوشش کرتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضجنان وعسفان کے درمیان نزول اجلال فرمایا یہ دیکھ کر مشرکین کہنے لگے ان لوگوں کو ایک ایسی نماز درپیش ہے جو ان کو ساری دنیا اور بال بچوں سے بھی زیادہ محبوب ہے جس کا نام عصر ہے لہذا تم متفق ہو کر یکبارگی پوری قوت سے ان پر ٹوٹ پڑو، ادھر مشرکین میں یہ مشورہ ہو رہا تھا ادھر جبریل امین نے آکر آں حضرت صلعم کو بتایا کہ اپنے ساتھیوں کو دو حصوں میں بانٹ دیجئے اور ہر ایک کو ایک ایک نماز اس طرح پڑھا دیجئے کہ دوسرا حصہ مسلح ہو کر دشمنوں کے مقابلہ میں ڈٹا رہے، اس طرح ان کی ایک ایک رکعت ہو گی اور آپ کی دو رکعتیں۔ (مشکوۃ باب صلوۃ الخوف)

میدان جہاد و قتال میں بھی شریعت نے جماعت ٹوٹنے نہیں دی اور اس نازک موقع پر خود اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کے ذریعہ آپ کی رہنمائی فرمائی اور حکمت عملی بتا کر شکستِ

ب ب۔ پالیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ پروردگار عالم کو جماعت کی نماز محبوب ہے۔

نظم جماعت پر اجماع صحابہ | جماعت کی نماز کی اسی عظمتِ شان کے پیش نظر حضرت ابوہریرہؓ فرماتے تھے کہ آدم کے بیٹوں کے کان کا پگھلاتے ہوئے سیسہ سے بھر جانا بہتر ہے کہ وہ اذان سنیں اور اور جماعت کی نماز کے لئے مسجد میں نہ آئیں اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ جو لوگ مؤذن کی آواز سنتے ہیں اور عذر شرعی نہ ہوتے ہوئے بھی جماعت کے لئے نہیں نکلتے، ان کی نماز، نماز ہی نہیں ہے، حضرت علیؓ کا بھی یہی کہنا ہے۔

حضرت مجاہد کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک شخص نے پوچھا، اس شخص کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو دن کو روزے رکھتا ہے اور رات کو تہجد و نوافل پڑھتا ہے مگر جمعہ اور جماعت میں حاضر نہیں ہوتا، آپ نے جواب دیا "ھو فی النار" وہ دوزخی ہے پھر دوسرے دن اس نے آکر یہی سوال کیا، راوی کا بیان ہے تقریباً ایک مہینہ برابر اس نے ایسا ہی کیا مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہمیشہ یہی فرماتے رہے کہ وہ دوزخی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں جس نے اذان سنی اور پھر بھی اس کو قبول نہیں کیا حالانکہ اس کو کوئی عذرِ شرعی بھی نہ تھا تو ایسے شخص کو خیر نصیب نہیں اور نہ اس کا اس میں کوئی جذبہ معلوم ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک قول پہلے گذر چکا ہے کہ جماعت کی نماز میں وہی شخص نہیں آتا جو کھلا ہوا منافق ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے اقوال جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے آئے ہیں وہ درجہ صحت و شہرت کی حد تک پہنچے ہوتے ہیں اور ان کی مخالفت میں کسی صحابی سے کوئی بات بھی نہیں آئی ہے کہ تذبذب کی گنجائش نکل سکے پس ان تمام امور کے مدنظر ماننا پڑتا ہے کہ جماعت کی نماز پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے (کتاب الصلوٰۃ لابن القیم فصل سادس ص۹۹)

نظم جماعت فقہاء امت کی نظر میں | اصولیین نقہاء اپنی کتابوں میں جماعت کی نماز کو "ادائے کامل" اور منفرد کی نماز کو "ادائے قاصر" سے تعبیر فرماتے ہیں "کامل" سے ان کی مراد یہ ہے کہ جس طریقہ پر نماز مشروع ہوئی ہو اسی طریقہ سے ادا کی جائے اور "قاصر" وہ ہے جو طریقہ مشروعہ کے خلاف طریقہ پر ادا کی جانے ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت جبریل امین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے پہل عملی تعلیم با جماعت دی تھی جیسا کہ ترمذی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں یہ واقعہ مصرح ہے۔

(نور الانوار مع قمر الاقمار بحث کامل و قاصر ص۳۳)

فقہاء امت میں محققین جماعت کی نماز کو واجب کہتے ہیں چنانچہ ابن الہمام نے بدائع سے وجوب کا قول اپنی تائید کے ساتھ نقل کیا ہے اور جن لوگوں نے اس کو لفظ "سنت" سے تعبیر کیا ہے اس کی وجہ بیان کی ہے، تحریر فرماتے ہیں۔

یجب علی العقلاء البالغین الاحرار	جو عاقل، بالغ، آزاد اور بغیر عذر شرعی جماعت
القادرین علی الجماعۃ من غیر	کی نماز پر قادر ہو اس پر جماعت واجب ہے اور
حرج واذا فاتتہ لا یجب علیہ الطلب	اگر سعی کے باوجود کسی کی جماعت چھوٹ جائے
فی المساجد بلا خلاف بین اصحابنا	تو باتفاق ہمارے یہاں ایسے شخص پر واجب
بل ان اتی مسجدا اٰخر للجماعۃ یحسن	نہیں ہے کہ وہ مسجدوں میں جماعت تلاش کرتا
وان صلی فی مسجد حیہ منفردا	پھرے، ہاں اگر ایسا کرے تو مستحسن ضرور ہے
نحسن (فتح القدیر ص۱۲۹ ج۱)	اور اگر اپنے محلہ کی مسجد ہی میں اکیلا نماز ادا کرے

تو ایسی حالت میں یہ بھی درست ہے۔

اس سے بھی جماعت کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے بلاشبہ اگر اپنی مسجد میں غیر ارادی طور پر جماعت نہ مل سکے تو دوسری مسجدوں میں جماعت کی تلاش واجب نہیں ہے، مگر مستحسن

ضرور ہے، یوں تو اس کو اختیار ہے کہ اپنی ہی مسجد میں تنہا نماز پڑھ لے یا گھر میں یا مسجد سے باہر کسی اور جگہ میں اپنے گھر والوں کو جمع کر کے جماعت کے ثواب کے حصول کی کوشش کرے چنانچہ ابن الہمام لکھتے ہیں۔

وکذا لک فی القدوری یجمع باھلہ ویصلی بھم یعنی ینال ثواب الجماعۃ وقال شمس الائمۃ الاولی فی زماننا تتبعھا۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۱۳۹)	اسی طرح قدوری میں ہے کہ اپنے گھر والوں کو جمع کر کے جماعت سے پڑھ لیا تو بھی جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ شمس الائمہ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں جماعت تلاش کرنا اولیٰ ہے۔

جماعت جب واجب ہے تو پھر فقہا اور محدثین نے اسے "سنت" کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا؟ اس کے متعلق ابن الہمام لکھتے ہیں

انھا واجبۃ وتسمیتھا سنۃ لوجوبھا بالسنۃ (فتح القدیر ج ۱ ص ۱۳۹)	بلاشبہ ہے تو جماعت واجب مگر "سنت" اس لئے کہا گیا ہے کہ جماعت کا وجوب سنت (حدیث) سے ہے۔

حدیث میں جماعت کے متعلق جہاں سنت کا لفظ آیا ہے اس کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں

مگر اینجا طریقہ مسلوک کہ در دین مراد دارند یا آنکہ ثبوت وجوب از سنت است (اشعۃ اللمعات قلمی ج ۱ ص ۲۴۹)	"سنن ھدی" کی مراد یہاں دین کا چلا ہوا راستہ ہے یا یہ مراد ہے کہ جماعت کا وجوب سنت سے ثابت ہے۔

ابن الہمام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی بغیر عذر شرعی بجائے مسجد گھر میں با جماعت نماز ادا کرے تو اس شخص کا ایسا کرنا بدعت ہے خواہ یہ فعل اس کا گاہے گاہے ہی کیوں نہ ہو۔[1]

---

[1] فتح القدیر ج ۱ ص ۱۳۹

بشرطیکہ اس کے قصد وارادہ کو دخل ہو

شکست جماعت کی سزا | اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جماعت کی نماز محققین کے یہاں کم ازکم وجوب کا درجہ رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ جو شخص بغیر عذر شرعی جماعت کی نماز کا تارک ہو اور وہ اس کا تقریباً عادی ہو چکا ہو تو شرعاً اس کی گواہی مردود قرار دیدی جائے گی اور اس کو پیٹا جائے گا پھر قید میں ڈال دیا جائے گا اور اس کے پڑوسیوں پر حق ہے کہ ایسے شخص کو سمجھائیں بجھائیں اور جماعت سے غیر حاضر ہونے پر سکوت نہ کریں ورنہ وہ شریعت کی نظر میں گنہگار ہونگے

یہ سزا تو اس وقت ہے جب کوئی ایک دو شخص کریں اور اگر خدانخواستہ پوری آبادی جماعت کی نماز چھوڑ دے تو ان سے قتال کیا جائیگا کیونکہ یہ ایک بڑے شعار دین کو ترک کر رہے ہیں، صاحب "التحریر المختار" کے الفاظ یہ ہیں۔

فلوان اھل مصر ترکوھا قوتلوا واذا	اگر تمام اہل شہر جماعت کی نماز ترک کر دیں تو ان
ترك واحد ضرب وحبس کما	سے قتال کیا جائے اور جب کوئی ایک فرد تارک
فی الخلاصۃ (ص ۶۹ ج ۱)	جماعت ہو تو اس کو پیٹا جائے اور قید کر دیا جائے

ایسے ہی خلاصہ میں ہے

نظم جماعت کا اہتمام عہد نبوی میں | فقہاء اُمت کا تارکین جماعت کے متعلق یہ حکم بے وجہ نہیں، عرض کیا جا چکا ہے کہ ترکِ جماعت نفاق کی علامت سمجھی گئی ہے اذان سن کر بھی جو مسجد میں نہ آئے اس کی نماز، نماز نہیں کہی جاتی تھی، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ بڑی سے بڑی مجبوری ہے پھر بھی ترکِ جماعت کی ہمت نہ فرماتے تھے کسی نے اپنے معقول عذر سے مجبور ہو کر پوچھا بھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نفی میں جواب دیا، حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے۔

---

[1] فتح القدیر ج ۱ ص ۱۴۴

اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجل	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک نابینا
اعمی فقال یا رسول اللہ انہ لیس لی	شخص حاضر ہوا اور اس نے آپ سے درخواست
قائد یقودنی الی المسجد فسأل رسول	کی کہ مجھے کوئی راہ بر نہیں ملتا جو لیجایا کرے، لہذا
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یرخص	مجھے گھر میں نماز پڑھ لینے کی اجازت فرمادیں، آپ
لہ فیصلی فی بیتہ فرخص لہ فلما	نے اس کو رخصت (اجازت) دیدی جب واپس
ولی دعاہ فقال ھل تسمع النداء	ہوا تو پھر بلایا اور پوچھا تم اذان سنتے ہو یا نہیں؟
بالصلوٰۃ قال نعم قال فاجب	اس نے کہا جی ہاں سنتا تو ہوں آپ نے فرمایا تو
(مسلم باب صلوٰۃ الجماعۃ ج ۱ ص ۲۳۲)	پھر قبول کرو اور مسجد آؤ۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت ابن ام کلثومؓ کا ہے کہ انھوں نے دربارِ رسالت میں درخواست کی کہ میں ایک نابینا آدمی ہوں میرا گھر مسجد سے دور ہے، اور مجھے مسجد تک لے جانے والا کوئی نہیں ہے مزید برآں یہ کہ شہر میں موذی جانور اور درندے عموماً پھرا کرتے ہیں کیا ان عذروں کے ہوتے ہوئے جماعت سے غیر حاضری کی میرے لیے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے جو کہ حضرت کے حکم سے میں گھر میں نماز پڑھ لیا کروں یہ سن کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم اذان سنتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا، ہاں حضرت سنتا ہوں، آپ نے فرمایا تو پھر رخصت کیسے مل سکتی ہے جماعت کے لئے مسجد ہی آیا کروؓ۔

اس قدر مجبوریوں کا سامنا ہے، پھر بھی خود سے ان کو اپنے لئے حیلہ بہانہ نہ بنایا، بلکہ خدمت رسالت میں عذر پیش کرکے اجازت چاہی اور پھر بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عذروں کے رہتے ہوئے جو جواب دیا وہ جماعت کی اہمیت کے اندازہ کے لئے کافی ہے

لہ ابوداؤد باب التشدید فی ترک الجماعۃ

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ عتبان بن مالکؓ کا واقعہ حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے جس میں اس کی صراحت ہے کہ بظاہر اسی طرح کے عذر کی وجہ سے آپ نے ان کو رخصت دے دی تھی اور اب بھی فقہاء اس واقعہ کے پیش نظر رخصت کے حق میں ہیں اور جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت مذکور نہیں ہے اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ کا مقصد وہاں یہ تھا کہ رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل افضل اور محبوب تر ہے اور دوسرے یہ کہ جماعت کی مخصوص فضیلت مسجد ہی سے وابستہ ہے اور ان فیوض و برکات سے پورے طور پر وہی متمتع ہوسکتا ہے جو عزیمت پر عمل پیرا ہو۔[1]

مگر صاحب "التحریر المختار" نے سندی کے حوالہ سے جو جواب نقل کیا ہے وہ نظم جماعت کے زیادہ مطابق ہے فرماتے ہیں "عتبان بن مالکؓ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی تھی کہ ان کے گھر کی ایک جگہ میں نماز پڑھیں جس کو انھوں نے مسجد بنایا تھا تو ہوسکتا ہے کہ مسجد بنانے کے بعد وہ اپنے قبیلے کی اس میں امامت کرتے ہوں، پس ان کو تارک جماعت نہیں کہا جائیگا اور نہ یہ کہا جائیگا کہ انھوں نے مسجد کی حاضری ترک کر دی بلکہ بات یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنی معذوری کی وجہ سے ابعد مسجد (دور والی مسجد) کو چھوڑ دیا اور قریب کی مسجد کو اختیار کیا، اور اس میں کوئی کراہیت نہیں ہے جس طرح محلّوں میں مسجد بنالی جاتی ہے اور جامع مسجد چھوڑ دی جاتی ہے اور یہ معلوم ہے کہ انصار کے ہر قبیلہ کے لئے مسجدیں تھیں، چنانچہ جب وہ لوگ کسی وجہ سے آپ کے ساتھ نماز میں نہ حاضر ہو پاتے تو اسی میں نماز پڑھتے تھے۔[2]

خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت کا واقعہ بصیرت کا مرقع ہے، آپ بیماری کی شدت سے بالکل نڈھال ہو گئے ہیں، لاغری اور ضعف کا پورا اثر ہے اور غشی پر غشی

---

[1] بخاری [2] مشکوٰۃ باب الجماعۃ عن البخاری۔

طاری ہو رہی ہے مگر جب بھی معمولی افاقہ محسوس فرماتے ہیں تو رہ رہ کر یہی سوال کرتے ہیں کہ "جماعت ہو گئی؟" کہا جاتا ہے نہیں یا رسول اللہ۔ یہ سُن کر جماعت کی نماز کے لئے اٹھنا چاہتے ہیں کہ پھر غشی کا دورہ پڑجاتا ہے یوں ہی چار مرتبہ آپ نے دریافت فرمایا " اصلی الناس" (کیا لوگ نماز پڑھ چکے؟) اور ہر مرتبہ غشی کا حملہ ہوتا رہا اب جاکر آپ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اطلاع کرائی کہ آپ امامت کریں[1]

اسی مرض الموت میں ایسا بھی ہوا کہ صدیق اکبرؓ نماز پڑھا رہے ہیں، آپ نے کچھ افاقہ محسوس فرمایا اور دو شخصوں کے سہارے اس طرح مسجد جماعت کے لئے تشریف لاتے کہ دونوں بازوئے مبارک دو شخصوں کے کندھوں پر ہیں اور پائے مبارک اپنی ناطاقتی کی وجہ سے زمین پر گھسٹتے ہوئے آرہے ہیں[2]

یہ تھی اہمیت مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کی، اس ذاتِ مقدس کی نگاہ میں جو معصوم تھی اور اللہ تعالیٰ کے بعد اسی کا درجہ ہے صرف قول ہی سے نہیں، بلکہ عمل سے اپنی اُمت کو تعلیم فرما گئے اور بتا گئے کہ ایک گھر میں ایک مقصد کے لئے سب کا مجتمع ہو کر اللہ تعالیٰ کے آگے پیشانی رگڑنا کس قدر ضروری ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم۔

عہد صحابہ میں اہتمام جماعت | سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قول وفعل دونوں سے دینی شیرازہ بندی اور اجتماعی نظام کی تاکید فرمادی تو پھر آپ کے وہ جاکر جنہوں نے آپ پر اپنی جانیں نثار کیں اور اسی کو اپنی زندگی کا ماحصل اور سرمایہ جانا اور جن پر آپ کی نگاہ لطف وکرم بھی پڑ چکی تھی کیونکر آپ کی ایک ایک ادا پر جان نہ دیتے، حق یہ ہے کہ ان شیفتگانِ رسولؐ نے حق ادا کر دیا، آپ جو راہِ حق بتا گئے زندگی کی اخیر سانس تک اس پر عمل پیرا رہنے کی سعیِ پیہم جاری رکھی اور دین کے

[1] مشکوٰۃ باب ما علی الامام عن البخاری والمسلم [2] بخاری باب

ایک ایک مسئلہ پر عمل کر کے ثبت دوام حاصل کر گئے۔

مسجدوں میں جماعت کی نماز، اسی اہمیت اور حیثیت کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی، جو دین کا مطالبہ اور عاشقانِ رسول کا شیوہ تھا۔ اس وقت استقصا مقصود نہیں ہے بلکہ چند صحیح واقعات ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

حضرت ام درداء کہتی ہیں ایک دن حضرت ابو الدرداء غصہ کی حالت میں تشریف لائے میں نے پوچھا کیا بات پیش آئی کہ اس قدر رنجیدہ اور غضبناک ہیں فرمانے لگے، خدا کی قسم میں امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بجز اس کے کچھ نہیں پاتا ہوں کہ باجماعت نمازیں پڑھی جائیں اور اب دیکھتا ہوں کہ لوگ اسے بھی ترک کرنے پر اتر آئے ہیں۔

فاروق اعظمؓ جماعت کی نماز کے عاشق تھے اور آخر کار اسی عشق میں جان دی، آپ کا حال یہ تھا کہ اگر کسی کو مسجد میں جماعت کے ساتھ نہیں پاتے تو اس کے یہاں خود پہنچکر وجہ دریافت فرماتے، اور عذر معقول نہ پاتے تو اپنی خفگی کا اظہار فرماتے، ایک دن آپ نے کچھ لوگوں کو غیر حاضر پاکر فرمایا کیا بات ہے کہ وہ لوگ جماعت کے لئے مسجد نہیں آتے ان کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی ایسا کرنے لگیں گے، ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یا تو وہ پابندی سے مسجد آیا کریں یا پھر میں ان کی طرف ایسے اشخاص کو بھیجونگا جو ان کی گردنیں ماردیں گے، پھر آپ نے فرمایا جماعت کی نماز کے لئے مسجد آیا کرو۔ یہ اخیر جملہ آپ نے تین بار فرمایا (کتاب الصلوٰۃ وما یلزم فیہا للامام احمدؒ صلا)

انہی حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک دن صبح کی نماز میں سلیمان بن ابی حثمہ کو نہیں پایا (یہ جماعت میں کسی وجہ سے نہیں پہنچ پاتے تھے) کسی کام سے بازار تشریف لے جارہے تھے حضرت سلیمان کا گھر راستہ ہی میں پڑتا تھا، چنانچہ آپ ان کی ماں حضرت شفاءؓ کے پاس گئے اور

لہ مشکوٰۃ باب الجماعۃ بحوالہ البخاری

اُن کی غیر حاضری کی وجہ دریافت کی ان کی ماں نے بتایا، بات یہ ہوئی کہ سلیمان نے قیام لیل (تہجد) میں رات گذار دی اتفاق کی بات اخیر شب میں نیند کا غلبہ ہوگیا اور بلا قصد وارادہ سوگئے، یہ سن کر حضرت فاروق اعظم نے فرمایا میرے نزدیک فجر کی نماز مسجد میں باجماعت پڑھنی، اس ساری رات جاگ کر عبادت کرنے سے بہتر ہے کہ صبح کی جماعت چھوٹ جائے[1]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے بازار والوں کی ایک جماعت کو دیکھا کہ جونہی اذان پکاری گئی سب سامان اور کاروبار چھوڑ چھاڑ مسجد چل کھڑے ہوئے یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ ایسے لوگوں کے باب میں ہے رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ (کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو تجارت وغیرہ جیسی پیاری چیز بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے نہیں روکتی)[2]

حضرت عمر بن الخطابؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے ایک شخص کو جماعت کی نماز میں نہ دیکھا اس کے یہاں تشریف لے گئے اور آواز دی آپ کی آواز سن کر وہ شخص گھر سے نکلے، امیر المومنین نے دریافت کیا، نماز میں غیر حاضر کیوں رہے؟ جواب میں کہا، حضرت! میں بیمار ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا یا امیر المومنین اگر حضرت کی آواز کان میں نہ پڑتی تو گھر سے نہیں نکلتا، یا یہ کہا کہ مسجد تک چلنے کی طاقت نہیں ہے یہ سن کر آپ نے فرمایا، تم نے اس کی پکار پر لبیک نہیں کہا جو سب سے زیادہ ضروری تھی اور میری آواز پر نکل آئے، اللہ کے بندے! اللہ تعالیٰ کی طرف جو پکارنے والا پکارتا ہے اُس کی پکار پر جس قدر دھیان ضروری ہے مری پکار پر نہیں[3]

انھی حضرت عمرؓ کا کہنا ہے کہ مسجد میں نماز کے اندر اپنے بھائیوں کی تلاش کرو، کہ وہ

---

[1] مشکوٰۃ باب الجماعۃ ج۱ ص۹ [2] ابن کثیر ج ۳ ص۲۹۵ [3] کتاب الصلوٰۃ وما یلزم فیہا للامام احمدؒ ص۱۷

سب جماعت میں شریک ہیں یا نہیں، اگر کسی کو نہ دیکھو، تو دریافت کرو، خدا نخواستہ اگر بیماری کی وجہ سے نہ آسکے ہوں . . . . تو ان کی عیادت کو جاؤ، اور اگر وہ اپنی صحت و تندرستی کے باوجود نہیں آتے ہیں تو عتاب کرو[۱]۔

امام غزالیؒ اس واقعہ کے نیچے لکھتے ہیں، جماعت کی نماز میں تساہل مناسب نہیں پہلے لوگ اس نماز یا جماعت کا بڑا اہتمام فرماتے تھے جن لوگوں کو کوئی عذر شرعی نہ ہوتا پھر بھی وہ شریک جماعت نہ ہوتے تو ان کا جنازہ نکالا جاتا تھا جو اشارہ تھا کہ ایسا شخص مردہ ہے اس میں دینی روح نہیں ہے۔

حضرت سعید بن المسیبؓ فرماتے ہیں دس برس سے موذن نے کوئی اذان نہیں دی مگر مسجد میں موجود رہا ہوں کہنے کا مطلب یہ تھا کہ دس برس سے مری جماعت کی نماز میں کوئی فرق نہ آیا[۲]۔

مطر الوراق کہتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے شوق جماعت کا یہ حال تھا کہ وہ خرید و فروخت میں مشغول ہوتے، ترازو ہاتھ میں ہوتی مگر جونہی اذان کی آواز کان میں پڑتی، نماز کو دوڑ پڑتے[۳]۔

عمرو بن دینار الاعور کہتے ہیں کہ میں سالم بن عبداللہ کے ساتھ مسجد جا رہا تھا، مدینہ منورہ کے بازار میں پہنچا تو دیکھا وہ سب (تاجر) مسجد جا چکے ہیں، سبھوں کے سامان چھپے ہوئے ہیں، کوئی نگراں کی حیثیت سے بھی باقی نہیں ہے، یہ منظر دیکھ کر حضرت سالمؒ کی زبان پر یہ آیت تھی رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اور فرما رہے تھے یہی لوگ اس آیت کے مصداق ہیں[۴]۔

---

۱ احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۳۹، ۲ ایضاً ص ۱۰۹ ۳ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۹۵ ۴ ایضاً

(باقی آئندہ)

امیر الامراء نواب نجیب الدولہ ثابت جنگ
اور
جنگ پانی پت

(از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی)

تمہید حضرت اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۷۰۷ء میں انتقال کیا اس وقت کوہ ہمالہ سے راس کماری تک اور افغانستان کی ایرانی سرحد سے آسام و خلیج بنگال تک کا تمام بر اعظم مرحوم دودمان تیموریہ کے زیر فرمان و نگیں تھا نہ مرہٹوں کی تلوار چمکنے کے قابل رہی تھی اور نہ راجپوت کمار سنبھالنے کے اہل باقی تھے نہ کسی حصہ ملک پر کوئی مسلم و غیر مسلم خود سر رئیس و حکمران تھا نہ ان میں سے کسی فرد میں بھی بغاوت کرنے کی طاقت و قوت تھی۔

زوال کا آغاز ہندوستان کی بد قسمتی کا پہلا وہ دن تھا کہ جس دن اس کی طاقت دو حصوں میں منقسم ہو کر آپس میں ٹکرائی۔ شہزادہ معظم بہادر شاہ اور شہزادہ اعظم شاہ کی ستیز و آویز نے صوبہ آگرہ کے حدود اور جون ۱۷۰۷ء کے موسم گرما میں بہادروں کے خون کا سیلاب بہایا اس میں شہزادہ اعظم شاہ بہہ گئے اسد خاں ان کا وزیر تھا اور ذوالفقار خاں سپہ سالار یہی اس واقعہ کے باعث ہوئے۔ فروری ۱۷۰۹ء میں ناکام شہزادہ کام بخش کو بہادر شاہی سورماؤں نے تلوار کے گھاٹ اتارا۔ اور بہادر شاہ پانچ سال کے قریب اورنگ زیب کے بلند پایہ تخت پر تاج شاہی کے ساتھ جلوہ فرما رہا آخر ش فروری ۱۷۱۲ء میں اپنے مردہ بھائیوں کے پاس ملک جاودانی کو کوچ کر گیا بہادر شاہ شریف دوست۔ بہادر سپہ سالار اور جید عالم تھا لیکن حضرت

عالمگیر کی مرتب و مہیا کی ہوئی شہنشاہی کو قایم و برقرار رکھنے اور اس کے سے دل و دماغ کی قایم مقامی کرنے کے قابل نہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت تیموریہ کے لئے مضرت رساں ثابت ہوا۔

قوم مرہٹہ جس کو سیواجی نے نمایاں اور قابل توجہ بنایا تھا گو عالمگیر نے ان کی بڑھتی ہوئی قوت کو اس قابل نہ رکھا تھا کہ تاریخ میں کوئی درجہ مل سکے ۱۶۸۰ء میں سیواجی فوت ہوا شاہانہ و شجاعانہ حملوں کے صدمات سے یہ قوم ریزہ ریزہ ہوکر غبار بن چکی تھی" پر بہادر شاہ کی کوتاہ نظری اور غفلت شعاری نے نئے سرے سے ان میں زندگی کے آثار پیدا کر دئے دوبارہ قوت عود کر آئی سکھ جو درویشوں کے برگ سے زیادہ نمایاں حیثیت نہ رکھتے تھے ان کو یہاں تک طاقت حاصل کرنے کا موقعہ دیا کہ سکھ جتھے شاہی سرداروں اور مشہور شاہی سپہ سالاروں کی ٹکریں سنبھالنے کے لیئے میدان میں نکل آئے یہ سب باتیں بہادر شاہ کی غفلت شعاری کی بدولت یکے بعد دیگرے ظہور میں آئیں بہادر شاہ کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے چاروں بیٹے باہم دست بگریباں ہوگئے معزالدین - جہان شاہ - رفیع الشان نے مل کر زیر نگرانی ذوالفقار خاں اپنے بھائی عظیم الشان کو لاہور میں دریائے راوی کے ذریعہ بحر فنا کے گھاٹ اتارا اس کا بیٹا محمد کریم جو زندہ بچ رہا تھا گرفتار ہو کر معزالدین کے ہاتھوں قید ہستی سے آزاد ہوا۔ اس معرکہ میں جو مال ہاتھ آیا تھا تینوں میں تقسیم ہوا پھر جھگڑا کھڑا ہو گیا معزالدین اور جہان شاہ میں بات کی بات میں معرکہ کارزار گرم ہوا رفیع الشان تماشا دیکھ رہا تھا جہان شاہ کام آیا تو رفیع الشان سے دو دو ہاتھ ہوئے معزالدین اس کو ٹھکانے لگا کر جہاندار شاہ کے لقب سے ہندوستان کا تاجدار بنا" ۴ر فروری ۱۷۱۲ء کو معزالدین جہاندار شاہ اپنے برادر زادہ فرخ سیر" جو بنگالہ کا صوبہ دار تھا" کے ہاتوں مغلوب ہو کر قتل ہوا الہ آباد کے صوبہ دار سید حسن علی خاں و عبداللہ خاں کی کارفرمائی کو اس میں زیادہ

دخل رہا۔

فرخ سیر نے ذوالفقار خاں کو قتل اور اسد خاں کو قید کیا۔ سید عبداللہ خاں کو قطب الملک اور سید حسن علی خاں کو امیر الامراء بنایا۔ فرخ سیر چند سال تک بادشاہ رہے تلون مزاجی۔ بدعہدی اور نامردی کے ہاتھوں دولت مغلیہ اور سلطنت اسلامیہ کے تباہی و بربادی کے باعث ہوئے حسن علی و حسین علی سادات بارہ کے ہاتھوں کھیلتا رہا۔ انھیں نے فروری ۱۷۱۹ء میں قتل کرادیا امراء و اعیان سلطنت کے دلوں سے رعب شاہی رخصت ہو چکا تھا بادشاہ شاہِ شطرنج سے زیادہ وقیع نہ تھے فرخ سیر کے بعد شمس الدین رفیع الدرجات بادشاہ ہوا تین چار ماہ بعد وہ فوت ہوا اس کے بعد رفیع الدولہ تخت نشین ہوئے۔ تین ماہ سلطنت کرکے راہی ملک بقا ہوئے پھر جہان شاہ کا بیٹا روشن اختر ستمبر ۱۷۱۹ء میں محمد شاہ کے لقب سے اورنگ نشین تخت ہوئے یہ سب سے بازی لے گئے ان کی عشرت نوازی نے رہا سہا بھرم کھو دیا ایک طرف مرہٹے[1] اور دوسری طرف سکھ ہنگامہ بپا کر رہے تھے بعض اُمرائے سلطنت کی شہ سے مرہٹوں کی اُمیدیں کچھ سے کچھ ہو گئی تھیں سید حسن علی امیر الامراء اور نظام الملک اُمراء شاہی سے کچھ عرصہ تک نیاز مندانہ تعلقات رکھتے[1] رہے حتیٰ کہ محمد شاہ سے ان کو فرمان صوبہ داری بھی عطا کرایا مگر ان کی سرشت بے وفائی موقعہ پاکر مرہٹوں نے دلی پر حملہ کر دیا مگر ان کو عزت سے پسپا ہونا پڑا ایکا یک انھیں دنوں میں نادر شاہ نے ہندستان پر حملہ کی ٹھانی نادر شاہ نے اشرف شاہ کے عہد میں عروج پاکر پہلے خراسان سے ابدالیوں کو نکال دیا اشرف ۱۷۲۹ء میں کرمان اور قندھار کے درمیان مارا گیا ترکوں نے ایرانیوں کے حدود پر قبضہ کر لیا یہ اُن سے لڑنے چلا تھا کہ خراسان میں پھر شورش ہو گئی واپس آکر خراسان فتح کیا پھر ہرات لیا یہاں سے شاہ طہماسپ کی جانب اصفہان پر بڑھا وہاں شاہ طہماسپ

[1] مرہٹوں کے راجہ ساہو اور اس کے ذی ہوش مدار المہام بالاجی بشوناتھ سید حسن علی اور نظام الملک سے نیاز مندانہ مراسم رکھتے تھے (تاریخ ہندوستان)

کو معزول کرکے اس کے نابالغ لڑکے کو برائے نام تخت پر بٹھایا۔ پھر قندھار کو فتح کرلیا تب اُس کی نظریں ہندوستان پر اُٹھنے لگیں نادر شاہ نے ایک قاصد محمد شاہ کے پاس بھیجا یہاں مے نوشی سے فرصت کہاں تھی کہ قاصد باریاب دربار کیا جاتا آخرش نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا انڈس عبور کرکے پنجاب کی طرف بڑھا لاہور پہنچتے ہی گورنر صوبہ سے مقابلہ ہوا وہ تاب مقابلہ نہ لاسکا۔ نادر شاہ دہلی سے سو میل قریب پہنچ گیا سامنے محمد شاہی فوج بھی آ گئی خان دوران خاں کمانڈر انچیف سخت مقابلہ کے بعد زخمی ہوگیا جانبری کی امید نہ رہی میدان سے ڈیرہ پر لائے گئے آصف جاہ عیادت کو پہنچے تھوڑی دیر میں خان دوراں نے آنکھ کھولی اور آہستہ سے اتنا کہا کہ خیر ہم تو اپنا کام کرچکے اب تم لوگ جانو اور تمہارا کام جانے مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ بادشاہ کو نادر کے پاس اور نادر کو شہر میں نہ لے جانا جس طرح ہوسکے اس بلا کو وہیں سے ٹال دینا محمد امین خاں برہان الملک اودھ سے آگئے تھے اور میدان جنگ میں داد شجاعت دے رہے تھے ہاتھی پر بیٹھ کر قزلباشوں کی فوج پر تیر برسا رہے تھے کہ قزلباش چاروں طرف سے گھر آئے ایک جوان نیشاپوری ان کا ہم وطن اور یار تھا گھوڑا اڑا کر ان کے قریب پہنچا اور آواز دی کہ

"محمد امین دیوانہ شدہ کہ جنگ می کنی دبچہ اعتماد جنگ می کنی"

برہان الملک نے بادشاہ کی نمک خواری کا بھی خیال نہ کیا قزلباشوں کے ساتھ نادر شاہ کے پاس حاضر ہوئے نادر شاہ نے جرم بخشی کرکے عنایت فرمائی برہان الملک کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھایا چنانچہ اس نے مصلحت آمیز باتیں کرکے نادر شاہ کو اس بات پر راضی کرلیا کہ حضور ایک معقول نذرانہ لیں اور یہیں سے وطن واپس تشریف لے جائیں نادر شاہ اس بات پر راضی ہوگیا۔ برہان الملک نے ایک عریضہ میں یہ سب حال بادشاہ کو لکھ بھیجا

محمد شاہ نے آصف جاہ بہادر کو روانہ کیا اس نے برہان الملک کے ذریعہ شاہ نادر سے ملاقات کی بعد گفتگو کے ٹھہرایا کہ دو کروڑ روپیہ نقل بے بہا لیجئے اور یہاں سے اپنے وطن بخیر و خوبی مراجعت کر جائیے شاہ نادر نے آصف جاہ اور برہان الملک کی بات منظور کر لی آصف جاہ عہد و پیمان کر کے وہاں سے رخصت ہو کر محمد شاہ کے حضور میں آیا اس کارگذاری کو اس عنوان سے بیان کیا محمد شاہ آصف جاہ کی دولت خواہی سمجھے برہان الملک کی حسن خدمت کا کوئی ذکر ہی درمیان میں نہ آیا محمد شاہ نے خان دوران اور امیر الامرائی کا خطاب اور خلعت بیش بہا آصف جاہ کو عنایت کیا۔ برہان الملک وہاں امیر الامرائی کے منصب کو اپنا حق سمجھے بیٹھا تھا اس نے جب آصف جاہ کے خطاب و خلعت کا حال سنا تو بہت بگڑا اور پیچ و تاب کھایا اور نادر شاہ سے کہا حضور نے کیا غضب کیا جو ہندوستان کے قارونی خزانے کو چھوڑ کر دو کروڑ روپیہ پر رضامند ہو گئے یہ رقم تو فقط غلام ادا کر سکتا ہے۔ بادشاہی خزانے اور امراء و مہاجنوں کے گھرانوں کے کیا ٹھکانے ہیں۔ شہر یہاں سے صرف چالیس کوس ہے حضور وہاں تکلیف فرمائیں۔" نادر شاہ نے اپنے ارادے کو بدل دیا اور دلی چل کھڑا ہوا۔ آخر ش ہر دو بادشاہ نے ملاقات کی مارچ ۱۷۳۹ء کو دونوں بادشاہ لال قلعہ کی طرف بڑھے۔

میل ملاپ کی باتیں ہو رہی تھیں۔ دہلویوں اور مغلوں سے چل گئی نادر نے قتل عام کا حکم دیا کوئی تیس ہزار مقتول کہتا ہے کوئی چالیس ہزار آصف جاہ کے عرض معروض پر نادر نے تلوار میان میں کی۔ تخت طاؤس لیا بقول "مسٹر اسکاٹ" نوے لاکھ پونڈ نادر نے وصول کئے نادر نامہ میں لکھا ہے کہ پندرہ کروڑ روپیہ دہلی سے نادر کے ہاتھ لگا ساٹھ لاکھ پونڈ کی لاگت کا تخت طاؤس تھا مگر چہل نصائح شاہجہانی نے سات کروڑ قیمت تخت کی لکھی ہے اور نادر جو جواہر شاہجہانی خزانہ سے لے گیا بیس پچیس کروڑ سے کم نہ تھا۔ غرضکہ نادر شاہ صدہا ہاتھی

اور شاہی سواری کے گھوڑے بیسیوں ہر قسم کے کاریگر اور علوی خان طبیب کو لے کر اپنے ملک واپس پھرا حکومت مغلیہ کی اس واقعہ سے رہی سہی آبرو جاتی رہی لشکر تباہ ہوا خزانہ خالی ہوگیا نادر شاہ کا آنا اور مغلیہ سلطنت کے ڈھانچے کو توڑ مروڑ کر چلے جانا سرداران مرہٹہ کے حق میں مفید ثابت ہوا اور اس کو اپنی حوصلہ آزمائی کا پورا موقع ہاتھ لگا۔

نادر کی تباہ کاری کے بعد ایرانی تورانی امرائے سلطنت کی غداری مرہٹوں کی ہمت کو دوبالا کرنے کا اور سبب ہی پھر تو وہ دلی کے تخت پر بیٹھنے کے خواب دیکھنے لگے مگر نو آمدہ مٹھی بھر روہیلے افغان حکومت مغلیہ پر جان فدا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اس جماعت کا سرگروہ نجیب خاں تھا۔ جو نواب دوندے خاں کی رسالداری سے ترقی کرتے ہوئے وزیر اعظم شاہ دہلی کے عہدہ پر فائز ہوا اور مرہٹوں کے اقتدار اور ان کی بڑھتی ہوئی قوت کا خاتمہ اپنے حسن تدبیر سے احمد شاہ درانی کے ہاتھوں ایسا کہ ایک خواب کی تعبیر کا پورا ہونا تو کجا قوم کے بقا کے لالے پڑ گئے۔

ہندوستان کے مشہور مورخین کی کوتاہ نظری قابل داد ہے غداروں کے احوال میں صفحے کے صفحے سیاہ کئے ملک وملت کے جانباز اور فداکاروں کو گمنامی میں رکھنے کی سعی کی جس سے ان کے کارناموں پر عرصہ تک پردہ پڑا رہا اس سے زیادہ ظلم یہ کیا گیا کہ صحیح واقعات کو پنہاں رکھا اور من گھڑت قصے لکھ مارے طبا طبائی سے مورخ تو اپنے بھائی روہیلوں کو مرہٹوں کے پہلو بہ پہلو کردار کے اعتبار سے لاکھڑا کرتے ہیں دوسروں سے کیا شکوہ۔ روہیلہ سردار حافظ الملک حافظ رحمت خاں نواب دوندے خاں نواب نجیب الدولہ وغیرہ کے حالات بھی مجبوری درجہ لکھے مگر بٹے ضرور لگا دے گئے مولوی سید الطاف علی صاحب بریلوی نے حافظ رحمت خاں صاحب اور نواب دوندے خاں کی سوانح عمریاں محققانہ لکھ دیں مگر ضرورت تھی کہ سب

سے بڑے کارگذار روہیلہ سردار نجیب الدولہ کی سوانح عمری بھی مرتب ہوجاتے۔ چنانچہ "نواب نجیب الدولہ بہادر" راقم سطور نے اپنی بساط بھر کاوش اور تحقیق سے ترتیب دے دی ہے کوشش یہ کی ہے کہ اس مجاہد اعظم کی سیاسی سرگرمی اور ملکی کارنامہ اور اس نے مغلیہ حکومت کے بقاء کے لئے جو جانبازی اور سرفروشی دکھائی ان واقعات کو اس کی سوانح زندگی میں اصلی صورت میں پیش کر دئے جائیں کہا جاتا ہے "تاریخ اپنا ورق الٹتی ہے" چنانچہ آج کی سیاسی کشمکش میں نواب نجیب الدولہ کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہے۔

اُمرائے ہند

نواب اسد خاں | عمدۃ الملک نواب اسد خاں اور اس کے خلف رشید نواب ذوالفقار خاں مردو عہد عالمگیری میں بلند پایہ کے سردار تھے مرہٹوں کی سرکوبی اور بڑے بڑے زبردست قلعوں کی تسخیر میں باپ بیٹوں نے وہ کارہائے نمایاں کئے کہ عالمگیر ان پر اعتماد کرنے لگے۔

۱۶۹۶ء میں شہزادہ مرزا کام بخش قلعہ جھنجی کی فتح پر مامور ہوئے مگر ان کو محاصرہ کرنا پڑا اورنگ زیب عالمگیر نے اس مہم کے لئے ذوالفقار خاں کو بھیجا وہ کامیاب ہوا بادشاہ نے ان کو دکن کا صوبہ دار بنا دیا۔ عالمگیر جب خود بنفس نفیس دکن کو مرہٹوں سے پاک و صاف کرنے کے لئے دکن میں داخل ہوا تو فوج کے نصف حصہ کی کمان ذوالفقار خاں کے سپرد تھی اور نصف حصہ کی سپہ سالاری خود بادشاہ نے اپنے ہاتھ میں لی شاہزادہ اعظم و معظم کی جنگ میں شریک رہے آگے دیکھتے ہوتے عالمگیر کے کنبہ کو کٹوا ڈالا آخر شن اپنی سزا کو پہنچے۔

امیر الامراء سید حسن علی خاں و قطب الملک سید عبد اللہ خاں | سید حسن علی سید عبد اللہ۔ اعظم و معظم کی لڑائی میں سردو بھائی معظم کی فوج میں تھے لڑائی میں ایسی بہادری دکھائی کہ بہادر شاہ نے سید عبد اللہ کو الہ آباد اور سید حسن علی کو بہار کا صوبہ دار بنا دیا بہادر شاہ نوت ہوا۔ جہاندار شاہ

بھائیوں کو قتل کر کے خود بادشاہ بنا تو بنگالہ میں عظیم الشان کا بیٹا فرخ سیر صوبہ دار تھا اس نے
اپنی ماں کے مشورہ سے سید حسن علی صوبہ دار بہار کو اپنا ہوا خواہ بنا لیا اور حسن علی نے اپنے بھائی سید
عبداللہ کو بھی شریک کر لیا جب جہاندار کو اس کی خبر لگی تو اس نے سید عبد الغفار خاں کو الہ آباد
کی صوبہ داری کے لئے روانہ کیا کہ سید عبداللہ کو بیدخل کر دے سید عبد الغفار دس ہزار فوج لے
کر الہ آباد کی طرف چلا۔ الہ آباد سے سید عبداللہ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی سراج الدین علی خاں
کو صرف ساڑھے تین ہزار فوج دے کر سید عبد الغفار خاں کے مقابلہ پر بھیجا۔ کڑہ مانک پور پر مقابلہ
ہوا عبد الغفار خاں کو شکست ہوئی اور سراج الدین میدان مصاف میں مارا گیا۔ پھر جہاندار شاہ
نے اپنے بیٹے اعز الدین کو پچاس ہزار لشکر کے ساتھ سید عبداللہ خاں سے لڑنے کے لئے روانہ
کیا اور عین قلیج خاں کو ہمراہ کیا۔ ادھر بنگال و بہار سے چل کر فرخ سیر آ گیا۔ شہزادہ اعز الدین ایسا
خوف زدہ ہوا کھجوہ سے بھاگ آیا۔ ۳۰ نومبر کو جہاندار شاہ خود ذو الفقار خاں نصرت جنگ
کو ساتھ لے کر دلی سے چلا یکم جنوری کو آگرہ کے متصل فرخ سیر اور جہاندار شاہ کی زور آزمائی
ہوئی جہاندار شاہ کی طرف ذو الفقار خاں، فرخ سیر کی طرف سید برادران تھے جہاندار شاہ اور اس
بیٹے اعز الدین نے راہ فرار اختیار کی مگر ذو الفقار خاں دیر تک مقابلہ پر جما رہا ادھر سید حسن علی خاں
زخموں سے چور چور ہو گیا انجام کار ذو الفقار خاں کو میدان چھوڑنا پڑا۔ فرخ سیر نے بادشاہ
ہوتے ہی سید عبداللہ خاں کو قطب الملک کا خطاب اور وزارت کا عہدہ عطا کیا اور سید حسین علیخاں کو
کو امیر الامراء کا منصب ملا ان دونوں نے کچھ عرصہ ایسی ہی بادشاہ کو مفلوج بنا دیا خود حکمرانی کرنے
لگے میر جملہ، عین قلیج خاں۔ محمد امین خاں۔ محمد امین سعادت خاں۔ ارکین سلطنت تھے وہ
اس عروج پر چیں بہ جبیں ہوتے ادھر فرخ سیر کو بھی یہ حرکتیں ناگوار ہونے لگیں۔
امیر الامراء سید حسن علی خاں کو دکن کی حکومت سپرد کی تاکہ اس طرح دربار سے دور

ہو جائے چنانچہ دکن روانہ ہوا بادشاہ نے نائب صوبہ دار داؤد خاں کو خفیہ لکھ بھیجا حسن علی کو ٹھکانہ لگادیا جائے چنانچہ حسن علی اور داؤد خاں میں مقابلہ خوب رہا آخر ش داؤد خاں گولی کھاکر راہی ملک بقا ہوا

اس طرح میر صاحب کو خانصاحب پر فتح حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد فرخ سیر نے سردار ساہو کو شہ دی کہ سید حسن علی کا مقابلہ کرے اس طرح مرہٹوں کے حوصلے بڑھے مگر بالاجی پیشوا حسن علی سے ملا ہوا تھا کیونکہ اس نے ترچناپلی، تنجور، میسور وغیرہ سے چوتھ اور سردیس مکھی وصول کرنے کی خدمت کے لیے بادشاہ سے مرہٹوں کے حق میں احکام صادر کرادئے تھے اور کہا جاسکتا ہے کہ مرہٹوں کے اس پہلے پیشواء کے علوِ مرتبت کی بنیاد رکھنے والا سید حسن علی تھا اس بناء پر مرہٹے کاہے کو اپنے محسن سے بگاڑتے یہ تدبیر بادشاہ کی نہ چلی ان بھائیوں نے موقع پاکر فرخ سیر کے خسر راجہ اجیت سنگھ کی معاونت سے فرخ سیر کا گلا تسمہ سے گھٹوا دیا۔

محمد شاہ بادشاہ ہے چین قلیچ خاں نظام الملک محمد امین خاں اعتمادالملک محمد امین المخاطب بہ سعادت خاں نے سید برادران کی قوت توڑنا چاہی اکتوبر ۱۷۲۰ء کو سید حسن علی بادشاہ کو ہمراہ لیے ہوئے دکن کی صوبہ داری پر جارہے تھے اعتمادالملک اور سعادت خاں نے راستہ میں حسن علی خاں کو میر حیدر کے ہاتھوں ٹھکانے لگوادیا۔ سید عبداللہ دلی میں تھا وہ لڑا مگر گرفتار ہوکر قید ہوا وہیں قید ہستی سے آزاد ہوا۔

عمادالملک محمد امین خاں | فرخ سیر نے سید عبداللہ کے کہنے سے اس امیر کا درجہ بڑھایا اعتمادالملک خطاب دیا یہ صوم وصلوٰۃ کا پابند اور متشرع امیر تھا سکھوں کا زور توڑنے میں خصوصیت سے حصہ لیا یہی وہ فرد ہے جس نے سکھوں کے گرد

ہُندا کو اس کے ظلم و ستم کی بناء پر گرفتار کر لیا تھا فرخ سیر سے ناراض ہو کر گوشہ نشین کچھ عرصہ رہا۔ محمد شاہ کے عہد میں عروج حاصل ہوا اور اول درجہ کے امراء میں شمار ہونے لگا سید حسن علیخاں کے استیصال میں بڑا حصہ محمد امین خاں کا ہے۔ سید عبداللہ خاں کے قید کئے جانے کے بعد اس کو وزارت عطا ہوئی تین ماہ سے زیادہ کام وزارت انجام نہ دے سکے درد قولنج کے بہانہ اس جہان فانی سے گذر گئے ان کے ہی صاحبزادہ وزیر قمر الدین خاں تھے۔

برہان الملک | محمد امین المخاطب بہ سعادت خاں برہان الملک نیشاپور وطن تھا بسلسلہ سوداگری بہادر شاہ کے عہد میں وارد ہندوستان ہوا۔ پھر چھوٹے چھوٹے سرکاری عہدوں پر ملازم رہا سید عبداللہ کی ہم مسلکی و توجہ سے فرخ سیر کے عہد میں ہنڈون اور بیانہ کی صوبہ داری ملی۔ محمد شاہ نے سعادت خاں خطاب دیا سید حسن علی خاں کے قتل میں میر حیدر کے برابر کے شریک تھے اس صلہ میں برہان الملک خطاب پایا اور آگرہ کی صوبہ داری پر فائز ہوئے کچھ عرصہ بعد صوبہ اودھ کا اور اضافہ ہو گیا تو یہ اودھ کے انتظام کو گیا اکبر آباد میں راجہ نیلکنٹھ کو اپنا نائب کر گئے جو ایک جاٹ کی گولی کا نشانہ بنے۔ آگرہ کی صوبہ داری جے سنگھ سوائی کو مل گئی برہان الملک صرف اودھ کے صوبہ دار رہ گئے۔ مرہٹوں کی فوج نے جس کا سیلاب نظام الملک کی تحریک سے شمالی ہند کی طرف اُمنڈ آیا تھا دوآبہ گنگ و جمن میں بڑی لوٹ مار مچا رکھی تھی تو سعادت خاں نے سب کو مار کر دکن کی طرف نکال باہر کیا شاہ نادر سے دہلی کے تباہ کرانے کا باعث مورخین سعادت خاں کو قرار دیتے ہیں[1]۔ ان

---

[1] تاریخ مظفری میں ہے۔

"روز دیگر فردوس آرام گاہ خلعت میر بخشی گری بہ نظام الملک فتح جنگ مرحمت فرمودند سعادت خاں برہان الملک کہ امیدوار ایں خدمت بود ازحد کبیدہ خاطر گشت نادر شاہ را بر فتن دار الخلافہ شاہجہاں آباد ترغیب نمود حق نمک حرامی ادا کرد و خزائن و دفائن آنجا گوش زد کرد۔"

کی اس حرکت نے نادر کو بیزار کر دیا اور منہ پر تھوکا آخر ش زہر کھاکر دنیا سے منہ چھپا گئے
یہ ۱۷۳۹ء کا واقعہ ہے یہ سعادت نمک حرام بمرد ۱۱۵۲ھ

نظام الملک آصف جاہ بہادر | چین قلیچ خاں نظام الملک آصف جاہ یہ عالیجاہ تورانی سردار اورنگ زیب عالمگیر کا دربار دیکھے ہوئے تھا اس کے والد بزرگوار شہاب الدین خاں اعلیٰ درجہ کے سرداروں میں شمار تھا۔ جس وقت شہزادہ اعظم بیجاپور کا محاصرہ کئے ہوئے تھا اور سکندر عادل شاہ سے برسر پیکار تھا اس وقت شہاب الدین خاں اگر رسد کا اہتمام نہ کرتا تو شہزادہ کی کل فوج ضائع ہو جاتی اس خدمت کے صلہ میں عالمگیر نے غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کا خطاب عطا کیا، عالمگیر کے عہد میں قلیچ خاں نے بھی ناموری حاصل کی عہد بہادر شاہی میں دکن کی نظامت اور دوسرے صوبوں کی صوبہ داری پر فائز رہا۔ جہاں دار شاہ کے عہد میں ایک ناگوار واقعہ کے پیش آنے سے گوشہ نشین ہو گئے۔

فرخ سیر کے زمانہ میں سید عبداللہ نے مالوہ کی حکومت دلوادی یہ ہر دو سید برادران نظام الملک کا بڑا احترام کرتے تھے نظام الملک نے صوبہ مالوہ کا نہایت عمدہ انتظام کیا، فرخ سیر جب سیدوں سے ناراض ہوا تو اس نے محمد امین خاں کے مشورہ سے نظام الملک کی فوج میں بہت سا اضافہ کر دیا اور سیدوں کے مقابلہ اور استیصال پر آمادہ کیا ادھر سیدوں نے نظام الملک کو لکھا کہ آگرہ۔ الہ آباد۔ برہان پور۔ ملتان ان چار صوبوں میں سے جس صوبہ کی حکومت چاہو لے لو۔ دکن کے صوبوں کا انتظام ہم خود کریں گے اور مالوہ کو اپنا قرارگاہ بنائیں گے۔ تو نظام الملک برافروختہ ہو گئے اور سخت لب ولہجہ میں انکار لکھ بھیجا۔ سید برادران آپے سے باہر ہو گئے۔ نظام الملک غافل نہ تھا۔

(باقی آئندہ)

ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل

(۴)

(از جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف دہلی)

داغ بلند قامت تھے اور جثہ قد کے مناسب تھا۔ پیشانی بلند۔ آنکھیں بڑی بڑی، ناک اونچی اور انگلیاں موٹی موٹی تھیں۔ رنگ قدرے سیاہ تھا۔ چہرے پر چیچک کے نشان تھے۔ مزاج میں شوخی، طبیعت میں روانی و بذلہ سنجی تھی۔ آداب شاہی سے تمام و کمال واقف بلکہ بعض امور میں تو انتہا درجے کے نکتہ شناس تھے اور کیوں نہ ہوتے قلعہ معلیٰ کے تربیت یافتہ تھے دربارداری کی مہارت اور نواب کی مزاج شناسی کا یہ نتیجہ تھا کہ نواب نے بیحد قدر افزائی کی ایک مرتبہ نواب نے رقعہ بھیجا جس میں یہ دریافت کیا کہ آپ کے تمام شاگردوں میں بہتر کون سا شاگرد ہے اس کے جواب میں انھوں نے کچھ لکھ کر بھیج دیا حاضرین میں سے کسی کو دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوئی بعد میں کسی ذریعہ سے دریافت ہوا کہ آپ نے اس کا جواب یہ دیا کہ میرے تمام شاگردوں میں آپ سے بہتر کوئی شاگرد نہیں۔ معاذ اللہ غضب کی ذہانت حاضر جوابی اور حاضر دماغی تھی۔

نواب کی غزل کی اصلاح میں بھی ایک خاص روش تھی جس سے ان کی آداب شناسی کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے یعنی نواب کے الفاظ کو قلمزد نہ کرتے تھے بلکہ اپنا لفظ نیچے لکھ دیتے تھے۔ شعر اتنی جلدی کہتے تھے کہ حیرت ہوئی تھی۔ رامپور میں جبکہ مشاعروں کا اہتمام

انھیں کے سپرد ہوتا تھا انتظامی مصروفیت کے باعث غزل کہنے کا وقت نہ ملتا تھا۔ جب مشاعرے کا وقت قریب آجاتا اور تمام انتظامات مکمل ہو جاتے تھے تو الگ کسی کمرے میں کسی شاگرد کو لے کر بیٹھتے شعر لکھواتے جاتے غزل مکمل ہو جاتی۔

کلکتے کے سفر میں عظیم آباد میں بھی کچھ دنوں میر باقر حسین کے مکان پر قیام کیا تھا عظیم آباد کے احباب نے گیارہ مصرعے مختلف زمینوں کے تجویز کر کے دیئے گیارہ اشخاص کو ایک قطار میں بٹھا دیا گیا۔ ہر شخص کو باری باری سے ایک ایک شعر لکھواتے جاتے تھے اس طرح ایک مجلس میں گیارہ غزلیں تیار ہوگئیں[1]۔

داغ کے چار دیوان گلزارِ داغ آفتابِ داغ مہتابِ داغ یادگارِ داغ اور ایک مثنوی فریادِ داغ ہے۔ گلزارِ داغ پر آپ کے عم محترم نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کی تقریظ بھی ہے۔ جو نواب ضیاء الدین احمد خاں کے حالات میں نقل کر چکا ہوں۔

مشہور شاگرد یہ ہیں۔ سائل دہلوی بیخود دہلوی۔ نوح ناروی۔ سیماب اکبر آبادی احسن مارہروی۔ آغا شاعر دہلوی۔ حسن بریلوی۔ بیباک شاہجہاں پوری۔ فیروز رامپوری اختر نگینوی۔ عزیز حیدر آبادی ڈاکٹر محمد اقبال۔ دلیر مارہروی۔ جوش ملسیانی۔ بیخود بدایونی ہجیر شاہجہانپوری۔ مبارک عظیم آبادی۔ مولٰنا محمد علی جوہر۔

ہندوستان میں ایسا کوئی استاد شاید ہی گذرا ہو جس کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی ہو۔ سُنا ہے کہ تقریباً ڈھائی ہزار شاگرد تھے۔

جناب نوح ناروی نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضور میدانِ حشر میں تو آپ کی ایک مستقل اُمت آپ کے پیچھے چلے گی۔ اُستاد نے فرمایا کہ جس امت میں نوح جیسے

[1] یہ حالات مجھ کو حضرت نوح ناروی سے معلوم ہوئے۔

پیغمبر تھی بلوں اُس اُمت کے کیا کہنے ہیں۔

نوح ناروی کا نمبر ایک ہزار پانچ تھا۔ آپ ۱۸۹۶ء میں داغ کے شاگرد ہوئے تھے۔ داغ نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی ان کی اہلیہ بھی انتقال کر چکی تھیں۔

حضرت اُستاد کا قیام حیدر آباد | اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت سائل تقریباً ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے اور حضرت داغ کے شاگرد ہو گئے ان کے خاندان کے بعض افراد ان کی اس شاگردی سے متنفر تھے۔ سائل صاحب نواب ضیاء الدین احمد خاں کے پوتے تھے جو مرزا غالب کے خاص شاگرد اور خلیفۂ اول تھے ان کی شاعری کا رنگ غالب سے ملتا جلتا تھا یعنی تخئیل کی بلندی، معنی آفرینی، اختراعِ تراکیب اور دیگر خصوصیاتِ غالب ان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ یہی رنگ بعد کے آنے والے افراد خاندان یعنی چچا، نواب احمد سعید خاں طالب اور بڑے بھائی نواب شجاع الدین خاں تاباں وغیرہم کا بھی تھا۔ سائل صاحب کے پہلے اُستاد مرزا عبدالغنی ارشد کے ہاں بھی تقریباً یہی رنگ تھا مگر داغ کے ہاں محاکات و محاورات اور زبان تھی یہاں رنگ ہی کچھ اور تھا یہ وجہ تھی کہ سائل کے تلمذِ داغ کو ان کے خاندان میں پسند نہ کیا گیا تاباں صاحب تو صاف طور پر داغ مرحوم کے کلام کو بازاری کلام کہا کرتے تھے۔

اس شاگردی کے بعد سائل کے رنگ میں تغیر واقع ہوا اختراعِ تراکیب کی جگہ محاورہ و زبان اور معنی آفرینی کی جگہ محض زود گوئی کی طرف رجحان ہوا، یہ حقیقت ہے کہ اگر مرزا عبدالغنی ارشد کے بعد دوسرا اُستاد بھی ارشد ہی جیسا مل جاتا تو آج دنیائے ادب کو مرزا غالب کا نظیر تلاش کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی مگر باوجود اس کے۔

سائل کی فکر رسا نے اپنے خاندانی رنگ اور داغ کے رنگ کو سمو کر ایک ایسا

رنگ تغزل ایجاد کرلیا جو مومن کے قریب قریب تھا۔ ان کے کلام میں شوخی بھی ہے، تصوف بھی ہے، معنوی بلند پردازی بھی ہے شوکتِ الفاظ بھی ہے، محاورہ بھی ہے زبان بھی ہے غرضکہ اعتدال کے ساتھ وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مومن کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

داغ نے آخر عمر میں بہت سے نو مشق شاگردوں کو سائل کے سپرد کر دیا تھا۔ بعض لوگوں نے یہ بات اُڑائی کہ سائل کو داغ غزل کہہ کے دیتے ہیں۔ جب یہ خبر سائل صاحب تک پہنچی تو انھوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا۔ آخر ایک مرتبہ کسی بڑے مشاعرے میں جس میں داغ بھی شریک تھے ان کو زبردستی کھینچا گیا۔ انھوں نے اس شرط پر شرکت قبول کی کہ کوئی مصرع سرِ مشاعرہ دیا جائے اور مشاعرے میں ہی سب کے سامنے غزل لکھ کر پڑھوں چنانچہ داغ نے مصرع دیا سائل نے غزل کہہ کر پڑھی۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے:-

کرتے ہیں بات بات میں وہ دل لگی کی بات مطلب اُڑائے دیتی ہے سارا ہنسی کی بات[1]

اس میں شک نہیں کہ سائل زود گوئی میں داغ سے کم نہ تھے۔ چنانچہ حکیم اجمل خاں کی محفلوں میں بھی اکثر سائل کے اس کمال کا اظہار ہوا ہے مگر جو کلام محض زود گوئی کی مہارت کے اظہار کے لئے کہا گیا ہو اس میں زبان و محاورہ کے علاوہ کسی اور چیز کی آمد مشکل ہوتی ہے۔ فرمائشیں اور وقتی ضرورتیں شاعری کی مٹی پلید کر دیتی ہیں۔ یہ سائل کی خصوصیت ہے کہ ایسی فرمائشی اور وقتی غزلوں میں بھی زبان کی چاشنی اور بندش کی چستی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

اسی زمانے میں سائل نے حیدرآباد سے رسالہ "معیارالانشاد" جاری کیا جو تقریباً ۱۹۰۸ء تک جاری رہا اس رسالے میں ایک مصرع طرح آیندہ نمبر کے لئے شائع کر دیا جاتا تھا اس پر داغ کے شاگرد طبع آزمائی کر کے سائل کے پاس اپنی غزلیں بھیج دیتے تھے۔

---

[1] یہ واقعہ محب محترم مولوی محمد حسن صاحب اختر تلمیذ حضرت سائل نے مجھ سے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے خود اُستاد مرحوم نے بیان کیا تھا۔

سائل صاحب مختلف اوقات میں استاد کو دکھا کر تمام غزلیں رسالے میں شائع کر دیا کرتے تھے۔ داغ صاحب کے انتقال کے بعد یہ رسالہ کچھ عرصہ تک تو جاری رہا مگر حالات کے ناساعد ہو جانے کی وجہ سے آخر بند ہو گیا۔

حیدر آباد میں سائل مع اپنے اہل و عیال کے اسی کوٹھی میں رہتے تھے جہاں استاد داغ قیام پذیر تھے یہ کوٹھی ترپ بازار میں عابد شاپ کے متصل واقع تھی، اس کا کرایہ حضور نظام خود ادا کیا کرتے تھے سائل صاحب اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں سائل صاحب اور اُن کی بیگم صاحب اور مرزا ناصر الدین کے (جو سائل صاحب کے بھتیجے اور سوتیلے بیٹے ہیں) وظائف کی آمدنی تقریباً دس گیارہ سو روپئے ماہوار ہو جاتی تھی (اس زمانے کے دس سو روپئے بلا مبالغہ آجکل کے دس ہزار روپئے کے برابر تھے)

یہ خاندان نہایت عزت و وقار کے ساتھ حیدر آباد میں رہا ان کی اپنی ذاتی گاڑی تھی رئیس کا بھی شوق تھا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ باوجود اس فارغ البالی و تنعم اور رسوخ و وقار کے آپ کا چال چلن مضبوط رہا۔ حضرت نوح ناروی نہایت وثوق کے ساتھ فرماتے ہیں کہ حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں صرف دو ایسے شخص تھے جو ریاستی تعیش کی فضاء سے بالکل محفوظ رہے ایک تو جناب سائل اور دوسرے احسن مارہروی۔

ایک مرتبہ خود سائل صاحب نے راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ میں ایسے ایسے بلا نوشوں کی صحبتوں میں رہا ہوں جو شراب سے حوض بھروا کر غوطہ لگاتے تھے۔ مگر میں نے آج تک ایک قطرہ بھی نہ چکھا۔ بڑی صاحبزادی قدسیہ بیگم حیدر آباد میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئیں۔ جب دہلی واپس ہوئے اس وقت صاحبزادی کی عمر ۴ برس تھی۔

حیدر آباد کے متفرق واقعات | مرزا خورشید عالم جو مرزا فخرو ولی عہد کے فرزند داغ صاحب کی والدہ

کے بطن سے تھے، ان میں اور سائل صاحب میں ایک مرتبہ لفظ "چھان بین" کے متعلق اختلاف ہوا۔ مرزا خورشید عالم کا دعویٰ تھا کہ "چھان بین" غلط ہے "چھان بنان" صحیح ہے۔ اور سائل صاحب اس کے برخلاف دعویٰ رکھتے تھے دونوں نے اس اختلاف کو اُستاد داغ کے سامنے پیش کیا اُستاد نے فرمایا کہ دونوں صحیح ہیں مگر "چھان بنان" خاص قلعہ معلی کا محاورہ ہے قلعہ کے باہر مقبول نہیں ہوا اور "چھان بین" شہر کا محاورہ ہے۔

جناب نوح ناروی حیدرآباد سے ۱۴ر اکتوبر ۱۹۰۴ء کو اپنے وطن واپس آ گئے تھے ان کا اور سائل صاحب کا ساتھ تقریباً ۷ مہینے رہا سائل صاحب کی بڑی صاحبزادی قدسیہ بیگم کو نوح صاحب نے گودوں میں کھلایا ہے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ بچی میری گود سے گر پڑی تھی جس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔

ایک مرتبہ اُستاد ظہیر اور اُستاد داغ میں کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی اس کو دور کرنے اور دونوں اُستادوں کو گلے ملوا دینے کی خاص کوشش سائل صاحب نے کی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ مہاراجہ سر کشن پرشاد کے منصب یاب اُستاد ظہیر بھی تھے اور ایک فارسی شاعر معروف بہ ترکی تھی۔ ترکی صاحب نے اُستاد داغ سے کہا کہ اُستاد ظہیر کے حیدرآباد آنے کا منشاء آپ کی جگہ حاصل کرنا ہے۔ داغ صاحب ظہیر کی طرف سے بدگمان ہو گئے ظہیر کی آمد و رفت داغ کے ہاں بہت زیادہ تھی اور کافی میل جول تھا۔ اس ریشہ دوانی کے بعد ظہیر نے ان کے طرز عمل اور انداز گفتگو میں بہت بے رُخی اور روکھا پن محسوس کیا۔ تو اپنی خودداری کا خیال کرتے ہوئے آنا جانا کم کر دیا۔ مگر اصل معاملے کا علم نہ تھا۔

سائل ظہیر کے ہاں بھی آمد و رفت رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک روز دریافت کیا کہ آپ "چچا جان" کے ہاں پہلے تو اکثر تشریف لاتے تھے۔ اب بہت کمی ہو گئی۔ کیا بات ہے؟

فرمایا کہ بھئی! تمہارے چچا جان نے میرے ساتھ کچھ اپنا طرز عمل بدل دیا ہے۔ اور کئی مرتبہ مجھ سے کچھ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کیں۔ میں یہ تو نہیں سمجھ سکا کہ یہ تبدیلی کیوں ہے مگر آمد و رفت اس لئے کم کر دی ہے کہ میرا آنا ان کو زیادہ ناگوار نہ ہو۔

سائل نے ایک روز مناسب موقع دیکھ کر اُستاد سے دریافت کیا کہ چچا جان پہلے تو ظہیر صاحب سے آپ کے بہت مراسم تھے۔ مگر اب عرصے سے کچھ کم ہو گئے ہیں ظہیر صاحب بھی اب نہیں آتے کیا بات ہے؟

استاد نے فرمایا ارے بھئی وہ تو میری جگہ لینے آئے ہیں سائل نے کہا کہ آپ کو کیوں کر معلوم ہوا فرمایا کہ ترکی کہہ گیا ہے۔ سائل نے تاڑ لیا کہ یہ محض ریشہ دوانی اور بہتان ہے چنانچہ ظہیر سے یہ ماجرا بیان کیا انھوں نے حلف اُٹھایا اور کہا کہ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی یہ محض بہتان ہے۔ اور پھر سائل اور ظہیر داغ کے ہاں گئے۔ وہاں بھی ظہیر نے حلف اُٹھایا دونوں اُستاد گلے مل کر خوب روئے اور ایک طویل عرصے کی کدورت دور ہو گئی اس طرح سائل کی بدولت ترکی کی ترکی تمام ہوئی۔[۱]

اُستاد ظہیر کے نواسے سید اشتیاق حسین صاحب المتخلص بہ شوق جو آج کل ہمدرد دواخانے میں کام کرتے ہیں یہ بھی اس زمانے میں وہیں تھے۔ ۱۲-۱۳ برس کی عمر تھی شعر بھی کہتے تھے۔ داغ نے ظہیر سے کہا کہ اس لڑکے کو میرے سپرد کر دیجئے۔ استاد ظہیر نے فرمایا کہ میں تو اس سے خود ہی کہتا ہوں کہ اُستاد داغ کے پاس جایا کرو۔ داغ صاحب نے کہا کہ آپ اس کو اصلاح نہ دیا کیجئے پھر یہ خود میرے پاس آیا کریگا۔ چنانچہ شوق صاحب استاد داغ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت سائل بھی موجود تھے انھوں نے کہا کہ میں لغیر مٹھائی

---

[۱] بحسب روایت جناب نوح ناروی

کے ہرگز شاگرد نہ ہونے دوں گا۔ مگر شوق صاحب کے پاس رقم نہ تھی۔ سائل صاحب نے دو روپئے دے کر مٹھائی منگائی۔ اور اس طرح شاگردی کی رسم ادا ہوئی[1]۔ اسی زمانے میں جبکہ سائل صاحب حیدر آباد میں مقیم تھے "فصیح اللغات" مرتب ہو رہی تھی۔ یہ عجیب وغریب ڈکشنری احسن صاحب مارہروی مرتب کر رہے تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ لغات کے معانی ومطالب احسن لکھتے تھے اور داغ کے سامنے پیش کرتے تھے اور وہ مختلف معانی ومطالب کے لئے بطور سند اساتذہ متقدمین سے کسی کا شعر یا اپنا کوئی شعر لکھوا دیتے تھے۔ یا فوراً کوئی شعر کہہ لیتے تھے چنانچہ "یادگار داغ" جو داغ کا چوتھا دیوان احسن نے مرتب کیا ہے اس میں جو متفرق اشعار ہیں وہ تقریباً سب اسی مقصد کے پیش نظر کہے گئے ہیں۔

ایک مرتبہ سائل نے استاد کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ آپ اپنے چند معتمد شاگردوں کو چند ردیفیں تقسیم کر دیں تو اس طرح کام بہت جلد مکمل ہو جائیگا اور کتاب جلدی شائع ہو سکیگی اس تجویز کو چونکہ احسن صاحب نے منظور نہیں کیا اس لئے داغ صاحب بھی خاموش ہو گئے افسوس کہ کتاب "فصیح اللغات" نامکمل رہی یعنی ردیف جیم تک لکھی گئی اور دنیائے ادب اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہ گئی۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا ایک روز سائل احسن اور چند دیگر حضرات موجود تھے استاد داغ نے اتفاقاً احسن کی طرف مخاطب ہو کر دریافت کیا کہ تمہارے ہاں نیچہ کیسا ہوتا ہے؟ احسن صاحب نے کہا ہمارے ہاں قفلی جلیبی دار ہوتی ہے سائل صاحب نے مزاحاً کہا کہ فصیح اللغات کے مؤلف ہو کر "جلیبی دار" کہتے ہو۔ اس پر احسن صاحب کبیدہ خاطر ہوتے اور فصیح اللغات کے متعلق سائل صاحب کی تجویز کا معاملہ

---

[1] یہ واقعہ خود شوق صاحب نے بیان کیا۔

چونکہ پہلے گذر چکا تھا اس لئے یہ بات احسن صاحب کو ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتی ہی رہی مگر آپس میں اتفاق و اتحاد قایم رہا۔ اور جو لوگ اس واقعے سے ناواقف تھے وہ محسوس نہ کر سکتے تھے کہ ان دونوں میں کچھ کبیدگی بھی ہے[1]

سائل صاحب کے قیام حیدرآباد کا زمانہ تقریباً ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ ہے اس عرصے میں داغ صاحب کے چند مشہور شاگرد جو وہاں موجود تھے مندرجۂ ذیل ہیں:۔

احسن مارہروی۔ بیدل شاہجہانپوری۔ نواب حسن علیخاں امیر۔ نواب عزیز یار جنگ عزیز۔ مرزا مظفر حسین بارق۔ مستجاب خاں خلق۔ حافظ محی الدین محفوظ۔ ڈاکٹر مہدی حسن الم شہزادہ منیر الدین ضیاء۔ امراؤ مرزا نادان۔ نواب عزیز جنگ ولا۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ سائل صاحب کے متعلق جو افواہ حیدرآباد میں اُڑی تھی کہ اُستاذ داغ ان کے لئے غزل کہہ دیتے ہیں اس کی بنیاد غالباً یہ تھی کہ مشاعروں میں داغ کی غزل بھی سائل ہی پڑھا کرتے تھے اور حضور نظام کی غزل پڑھنا بھی سائل کے سپرد تھا اور اپنی غزل تو خود پڑھتے ہی تھے اور خوب پڑھتے تھے۔ آپ کا انداز غزل خوانی آج تک مشہور ہے۔ بہرحال یہ افواہ حضور نظام تک بھی پہنچی حضور نظام نے استاذ داغ سے فرمایا کہ آپ اپنے بھتیجے کو لے کر آیئے داغ ان کو لے کر دربار میں حاضر ہوئے۔ اعلیحضرت نے ان سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی سائل نے عرض کیا کہ چچا جان نے مجھے آج ہی دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے دربار کے شایان شان میں کچھ نہ لکھ سکا میری تمنا ہے کہ دربار میں کلام پیش کروں تو بندگان عالی کی مدح و ستایش سے ابتداء ہو۔ حکم ہوا کہ اچھا جاؤ ۴ بجے حاضر ہونا۔ اعلیٰ حضرت نے سائل صاحب کو رخصت کر دیا اور استاد داغ کو اپنے پاس ہی رکھا۔ دو تین گھنٹے میں ایک طویل مدحیہ لکھ کر

---

[1] بحسب روایت جناب نوح ناروی

دربار میں حاضر ہوئے اور سر دربار سنایا اعلیٰ حضرت بہت خوش ہوئے اور داغ صاحب سے فرمایا کہ میں نے آپ کو یہ اندازہ کرنے کی وجہ سے یہیں روک لیا تھا کہ آپ کا بھتیجا خود کہتا ہے یا آپ کہہ کر دیدیتے ہیں مخالفین بہت خفیف ہوئے[۱]۔

حیدرآباد میں سائل صاحب جن مشاعروں میں شرکت فرماتے تھے ان میں عام طور پر ایسی غزل پڑھتے تھے جو آٹھ نو اشعار سے متجاوز نہ ہوتی تھیں ایک بار برسبیل تذکرہ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے کہیں یہ کہہ دیا کہ سائل صاحب کی غزل تو مختصر ہوتی ہے۔ یہ بات سائل صاحب تک پہنچی خاموش ہوگئے۔ چند روز بعد ہی مہاراجہ سرکشن پرشاد نے مشاعرہ کیا انھیں بھی دعوت دی۔ طرح پر غزلیں شروع ہوئیں۔ ان کے سامنے شمع آئی تو نہایت سادگی سے اپنی غزل پڑھی جو ۲۵ اشعار پر مشتمل تھی۔ مقطع کے ساتھ ہی اجازت چاہی کہ ایک مطرحہ غزل اور عرض کی ہے اگر اجازت ہو تو عرض کردوں۔ حاضرین نے بڑے اشتیاق سے ۲۵ اشعار کی غزل بھی سنی۔ اور مقطع کے ساتھ تیسری غزل کی اجازت چاہی اس طرح ۲۵-۲۵ اشعار کی پانچ غزلیں پڑھیں۔ مہاراج بھی بہت لطف اندوزی کے ساتھ سن رہے تھے جب مقطع پڑھا تو مہاراج ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے اور کہا کہ سائل صاحب میری طرف سے اگر آپ کو کوئی بات پہنچی ہے تو وہ محض برسبیل تذکرہ کہی گئی تھی اس سے میرا مقصود آپ کی توہین یا تنقیص نہ تھا آپ کا کلام سن کر آج بڑی مسرت اور خوشی ہوئی۔

سائل صاحب نے اپنے مخصوص منکسرانہ انداز میں عرض کیا کہ مہاراج آپ کا اتنا فرمادینا ہی کافی ہے میں تو مختصر غزل اس لئے پڑھتا تھا کہ میری کوتاہیاں اور عیوب جہاں تک ہوسکے کم ہی ظاہر ہوں تو اچھا ہے۔ لیکن جب ظاہر کرنا ہی ٹھیرا تو پھر میں نے خیال کیا کہ

---

[۱] یہ واقعہ مجھ سے محب محترم مولوی محمد حسن صاحب اختر تلمیذ حضرت سائل نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے خود استاد مرحوم نے بیان فرمایا تھا۔

پورے طور پر اپنے عیوب کی نمائش کردوں۔

سائل صاحب کی یہ مسلسل غزلیں ان کی بیاض میں موجود ہیں۔[1]

کچھ خانگی زندگی کے حالات | استاد داغ نے ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ نیز ان کی اہلیہ ان کی زندگی میں ہی انتقال کر چکی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد سائل دو ڈھائی سال تک حیدرآباد میں رہے۔

اس عرصے میں ان کے ترکے کے بارے میں بیگم سائل صاحب اور مرزا خورشید عالم کے مابین بڑی چپقلش رہی اس اختلاف اور مقدمہ بازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ داغ کا ترکہ اور کلام وغیرہ بحق سرکار آصفیہ ضبط ہوگیا۔

۱۹۰۸ء میں سائل دہلی آگئے اور نگینہ محل فراشخانہ میں سکونت پذیر ہوئے۔

اس وقت بڑی صاحبزادی قدسیہ بیگم کی عمر تین، چار سال کی تھی۔ قدسیہ بیگم کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۹۰۴ء میں ہوئی تھی نگینہ محل فراشخانے میں صاحبزادہ قطب الدین محمد میاں کی پیدائش ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔

سائل کی پہلی بیوی ممو بیگم کے بطن سے صرف ایک لڑکا تھا جو خرد سال فوت ہوگیا تھا اس کا نام "معظم مرزا" تھا اسی وجہ سے سائل صاحب کی کنیت "ابوالمعظم" مشہور و معروف ہے۔

گذشتہ اوراق میں عرض کیا جا چکا ہے کہ نواب صاحب قبلہ کی پہلی شادی گوہر سلطان زمانی بیگم عرف ممو بیگم بنت نواب مختار حسین خاں آف پاٹودی کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ نواب قاسم علی خاں دیوان پاٹودی کی بھانجی اور سائل صاحب کی خالہ زاد بہن تھیں۔

---

[1] بروایت مرزا جمیل الدین صاحب عالی ابن نواب سر امیر الدین مرحوم فخر الدولہ والی لوہارو

نواب قاسم علی خاں کی ایک بہن سکندر جہاں تو سائل صاحب کی والدہ تھیں اور دوسری بہن اکبری بیگم نواب مختار حسین خاں والی پاٹودی کو منسوب تھیں۔ اور نواب قاسم علی خاں کی صاحبزادی سردار جہاں نواب ممتاز حسین خاں بن نواب مختار حسین خاں کو منسوب تھیں

ممو بیگم کا دوسرا نکاح سید منور علی خاں کے ساتھ ہوا۔ ان کا انتقال ۱۳۵۴ھ م ۱۹۳۵ء میں ہوا اور قدم شریف میں دفن کی گئیں۔

غرضکہ سائل صاحب کا دوسرا نکاح ۱۹۰۱ء میں موجودہ بیگم (لاڈلی بیگم) کے ساتھ ہوا جو چھوٹی بھاوج اور نواب ممتاز الدین احمد خاں مائل کی بیوہ تھیں مائل مرحوم کے صاحبزادے مرزا ناصر الدین احمد خاں ہیں۔ حیدر آباد میں مرزا ناصر میاں کے ایک انگریز ماسٹر تھے جن کا نام تھا "مسٹر کیری" جو ان کو پڑھانے آتے تھے۔ ناصر میاں کی پہلی شادی ان کی صاحبزادی سے چرچ میں عیسائی رسم و رواج کے مطابق ہوئی، ان کے بطن سے ان کے صاحبزادے مرزا فتح الدین ہیں جو آجکل غالباً کانپور میں ہیں۔ اس نکاح کے کچھ عرصے کے بعد سائل صاحب تو دہلی چلے آئے تھے مگر ناصر میاں مع اپنی زوجہ کے حیدر آباد ہی میں ایک کوٹھی لے کر رہے سرکار نظام سے دونوں کا منصب تھا۔ "مسٹر کیری" کا انتقال ہو چکا تھا کچھ عرصے کے بعد آپس میں کچھ ناچاقی ہوگئی اور مرزا صاحب اپنی یوروپین بیوی کو حیدر آباد میں ہی چھوڑ کر دلی آگئے یہاں آنے کے بعد دوسری شادی مرزا خورشید عالم کی نواسی (شبن بیگم) کے کے ساتھ ہوئی (یہ مرزا خورشید عالم بن مرزا فخرو ولی عہد داغ مرحوم کے ماں شریک بھائی تھے) حیدر آباد میں مسز ناصر میاں نے سرکار میں ایک درخواست دی کہ میرا شوہر مجھے تنہا چھوڑ کر دہلی چلا گیا ہے نہ مجھے خرچ بھیجتا ہے نہ آتا ہے نہ بلاتا ہے لہذا اس کے منصب میں سے مجھے میرا حصہ ملنا چاہئے اس درخواست کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے منصب

بند ہو گئے تنگ آکر مسز ناصر میاں دہلی آگئیں۔ ناصر میاں اپنی پھوپھی کے ہاں محلہ مفتی والاں میں رہتے تھے اور یہ یوروپین خاتون سے سخت ناراض تھے۔ آخر کار اس کو سائل صاحب نے اپنی حویلی میں جگہ دی۔ اور یہ یوروپین خاتون اپنی آخر عمر تک مع اپنے فرزند مرزا فتح الدین (عرف فتا میاں) کے سائل صاحب کے ہاں رہیں۔ سائل نے اپنی اولاد کی طرح ان کو رکھا اور انھوں نے بھی ان کو اپنا باپ سمجھا۔ انگریزی زبان میں (جو ان کی مادری زبان تھی) ادبی مہارت رکھتی تھیں۔ باوجود یوروپین ہونے کے پردہ کی اتنی سخت پابند رہیں کہ کسی نے آنچل تک نہ دیکھا ۱۹۴۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ عیسائی مذہب پر آخر تک نہایت سختی سے قائم رہیں اور وصیت کے مطابق تجہیز و تکفین بھی عیسائی طریقے پر ہوئی زندگی کے آخری چند سال ایسے گذرے کہ صاحبزادے سے بھی تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے اور باپ بیٹوں نے ایسا چھوڑا کہ اس غمی میں بھی شریک نہ ہوئے۔

سائل صاحب کی اولاد | سائل صاحب کی پانچ اولادیں مجھے معلوم ہیں۔ منظم مرزا[۱]۔ قدسیہ بیگم[۲] قطب الدین محمد میاں[۳]۔ غلام نظام الدین محبوب میاں[۴]۔ غلام فرید الدین فرید میاں[۵]

معظم مرزا جو خورد سال فوت ہوئے پہلی بیگم کے بطن سے تھے۔ نواب صاحب کی کنیت ابوالمعظم انھیں کی وجہ سے ہے۔

قدسیہ بیگم | موجودہ بیگم کی بڑی صاحبزادی ۱۹۰۴ء میں بمقام حیدر آباد پیدا ہوئیں مرزا عبدالرب صاحب سابق سشن جج لاہور کی پہلی زوجہ کا انتقال ہوچکا تھا پھر یہ مرزا صاحب کو منسوب ہوئیں ۱۹۴۲ء میں قدسیہ بیگم کا انتقال ہوگیا۔ استاد مرحوم کو صاحبزادی کے انتقال کا سخت صدمہ پہنچا اور اس صدمہ کی وجہ سے ان کی صحت روز بروز گرتی ہی چلی گئی۔

نواب مرزا قطب الدین محمد میاں | اب یہی میرے استاد زادے دلِ محروم کے سہارے ہیں

اور انھیں کی محبت و احترام میرے لئے سرمایہ سعادت ہے ان کو دیکھ کر استاد مرحوم کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے جذبات محبت کی قدر و منزلت استاد زادے کے دل میں ہو یا نہ ہو مگر واصف مجزوں کے دل میں جب تک استاد مرحوم کی محبت بھری نگاہوں کا تصور باقی رہے گا (اور یہ ہمیشہ رہیگا) استاد زادے کے لئے واصف کی آنکھیں فرش راہ رہیں گی

محترم استاد زادے مرزا قطب الدین محمد میاں المتخلص بہ فصیح کو سائل صاحب نے جناب بیخود دہلوی کا شاگرد کرادیا تھا فصیح تخلص بھی جناب بیخود دہلوی نے تجویز کیا تھا بہت اچھے شاعر ہیں اور سخن فہم طبیعت رکھتے ہیں۔ حسن و خوبی اور وجاہت و شوکت میں اپنے والد مرحوم کا نمونہ ہیں۔ اور بفحوائے الولد سر لابیہ ان میں اپنے خاندانی محاسن و اخلاق موجود ہیں۔ اگرچہ مخملی چوگوشیہ ٹوپی کی جگہ ہیٹ نے آڑے جیب پاجامے اور تن زیب کے انگرکھے کی جگہ کوٹ پتلون نے حاصل کر لی ہے لیکن خصائل و عادات بالکل مشرقی تہذیب کے مطابق ہیں۔ ان کی سعادت مندی سے امید کی جاتی ہے کہ اپنے والد مرحوم کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ اور اس قحط الرجال کے زمانے میں جبکہ مشرقی تہذیب و تمدن کی کشتی سخت طوفانوں میں گھری ہوئی ہے اپنی خاندانی اور وطنی روایات کی عظمت برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں گے۔

ان کی پیدائش نگینہ محل فراشخانہ دہلی میں ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ اور مرزا عبدالرب صاحب کی زوجہ اولیٰ کی صاحبزادی سے شادی ہوئی ہے۔

مرزا غلام نظام الدین محبوب میاں ۱۹۱۴ء میں بمقام لال دروازہ دہلی پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد انگریزی فوج میں ملازمت کر لی۔

۱۹۳۷ء میں نواب صاحب مرحوم ان کو حیدرآباد لے گئے اور وہاں کوشش

کر کے ریاستی فوج میں تبادلہ کرادیا۔ نیز حیدرآباد کی فوج میں ان کو میجر کا عہدہ مل گیا۔ جنگ یورپ ۱۹۳۹ء کے زمانے میں جب انگریزوں نے ایران پر فوج کشی کی تو حیدرآباد کی فوج بھی برطانوی افواج کے ساتھ بھیجی گئی اور اس کے ساتھ محبوب میاں بھی گئے۔

ایران کے ملک الشعراء بہار جو لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر رہ چکے تھے۔ ان کی صاحبزادی طاہرہ بانو سے محبوب میاں کی نسبت ہوئی۔ جنگ کے زمانے میں فوجیوں کی نقل و حرکت صیغۂ راز میں رکھی جاتی ہے ہیڈکوارٹر کی معرفت خط و کتابت ہوتی ہے خطوط میں فوجی اپنا پتہ نہیں لکھ سکتا یہاں نواب صاحب کو خط و کتابت کے ذریعہ سے اس نسبت کا علم ہوا اور ملک الشعراء نے بھی نواب صاحب کو نیازمندانہ خط اور تہنیت لکھ کر بھیجی۔ نواب صاحب نے اس کے جواب میں ایک فارسی کا قطعہ ملک الشعراء کی تعریف و تبریک کے طور پر لکھا۔

اس تقریب کے کچھ روز بعد مورخہ ۵ / فروری ۱۹۴۲ء کو حیدرآباد سے تار آیا کہ میجر غلام نظام الدین کا ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ تار میں انتقال کا سبب "گردن توڑ" ظاہر کیا گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مقام آباداں کے ہسپتال میں انتقال ہوا اور وہیں دفن کیے گئے۔

اسی سال ایک تعلیمی وفد ایران سے ہندوستان آیا تھا۔ اس کا مقصد یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے تعلیمی اداروں کا مطالعہ کرے اور نئی تحقیقات کے مطابق اپنے ملک میں تعلیمی اصلاحات پیش کرے اس وفد کے صدر آقائے رشید تھے جو طہران یونیورسٹی کے پروفیسر تھے اور طاہرہ بانو کے استاد بھی تھے

وہ طاہرہ بانو کا ایک ملفوف خط لائے جس میں اس نے اپنی تصویر بھی بھیجی تھی

اور خط میں نواب صاحب کو "ابا جان" کے لفظ سے خطاب کر کے محبوب میاں کے انتقال پر اظہار ماتم کیا تھا۔ مگر انتقال کے اسباب اور تفصیلی واقعات کا قطعاً کوئی ذکر نہ تھا مختلف قسم کی افواہیں اور خبریں آتی تھیں مگر اصل معاملہ کچھ ایسا پردۂ خفا میں تھا کہ کسی طرح کھلتا ہی نہ تھا۔

نواب صاحب قبلہ نے راقم الحروف واصف کو صدر وفد آقائے رشید کے پاس بھیجا کہ شاید ان سے کوئی صحیح واقعہ معلوم ہو جائے اتفاق سے اس روز وہ جامع مسجد دہلی کی زیارت کے لئے آئے تھے میں نے جامع مسجد میں ہی ان سے گفتگو کی اور واقعہ کی تفصیل چاہی مگر ان سے بھی کچھ تسلی بخش تفصیل نہ ملی۔

نواب صاحب مرحوم کے سب سے چھوٹے صاحبزادے غلام فریدالدین فرید میاں تھے جو ۱۹۱۸ء میں بمقام لال دروازہ پیدا ہوئے اور ایک سال سے کم عمر میں ۱۹۱۹ء میں جبکہ ہندوستان میں رولٹ ایکٹ ۱۱ مجریہ ۱۹۱۹ء کے خلاف ایجی ٹیشن ہو رہا تھا انتقال کیا۔ جس روز فرید میاں کا انتقال ہوا اس روز شہر میں بڑی زبردست ہڑتال تھی تمام دواخانے بھی بند تھے مریض کو دوا بھی نہ مل سکتی تھی۔ اس واقعہ کو نواب صاحب نے ایک نظم میں بھی ظاہر کیا ہے یہ نظم ایک طویل ترجیع بند ہے جس میں تحریک کی مخالفت کی گئی ہے۔

باقی آئندہ

ادبیات

ترانۂ حیات

(لونگ فیلو کے ایک شاہکار کا پرتو)

{از جناب شمس نوید صاحب}

امریکہ کے مشہور فلسفی اور شاعر "لونگ فیلو" نے اپنے فکر و نظر کے لئے ایک وسیع اور جدید میدان تلاش کیا تھا اور ارباب نظر کو معلوم ہے کہ یہ فلسفی شاعر اپنے انتخاب میں کتنا کامیاب رہا ہمارے نوجوان اور نیک دل شاعر "شمس نوید" نے اس فلسفی کے "ترانۂ حیات" کو اپنے مخصوص طبعی رجحان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ "برہان"

نہ کہہ نہ کہہ یہ المناک طرز میں مجھ سے — کہ زندگی تو فقط ایک خواب ہے اے دوست!
ہماری روح کی قسمت ہے اک دوامی نیند — ہر ایک چیز نظر کا سراب ہے اے دوست"

حیات موت نہیں —— جاگتی حقیقت ہے — حدود قبر سے آگے رواں دواں ہی حیات
"تو صرف خاک ہے لوٹیگا سوئے خاک آخر" — کہی گئی ہی نہیں "روح" کے لئے یہ بات!

غم و نشاط، سکون و خلش، تبسم و اشک — کوئی نہیں ہے ترا جادۂ ہو مقام نہ در

ہے زیست سعیٔ مسلسل کہ کل تجھے دیکھے ہر ایک "آج" کی منزل سے دور جادۂ نور

وسیع دہر کا میدان کارزار ہے یہ یہاں سکوت کا کیا کام "راندۂ افلاک"!
حیات جنگ ہے گھمسان جنگ اور یہاں ہے ناگزیر سپاہی کی جرأتِ بیباک

خود اپنی لاش فنا کے مہیب مرگھٹ میں خود اپنے ہاتھ سے ماضی کو دفن کرنے دے
حسین ہو لاکھ نہ کر اعتمادِ مستقبل نظامِ وقت کو جینے دے اور مرنے دے

ترا عمل ہو جواں "حال" کی حدوں میں فقط وہ حال جس کی فضائیں ہیں بوئے موت سے دور
اسی عمل سے عبارت ہے زندگی لاریب رہے خدا پہ نظر — دل میں جرأتوں کا غرور

ترے بلند ارادوں کے راستہ کا چراغ بنے ہوئے ہیں "فسانے عروجِ ماضی کے"
گزر یہاں سے — مگر چھوڑتا ہوا پیچھے جہاں کے ریت پہ گہرے نقوشِ پا اپنے

نقوشِ پا کہ مسافر کوئی تھکا ماندہ نڈھال، بیکس و آوارہ راہِ ہستی میں
جواں کو دیکھ لے ممکن ہے تازہ دم ہو جائے گرے نہ کانپ کے مایوسیوں کی بستی میں

اٹھ! اور ایسے جنوں میں کہ جس کو آتا ہو بلند خواب لیے مشکلوں کا دکھ سہنا
حصولِ پیہم و پیہم تعاقب سرگرم عمل کا فرض بجا لا کے منتظر رہنا

تبصرے

پنجاب یونیورسٹی میں فارسی اُردو اور عربی مخطوطات کی ایک مفصل فہرست

مرتبہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ۔ تقطیع کلاں ضخامت ۵۷۵ صفحات شائع کردہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کو اس بات کا امتیاز و فخر حاصل ہے کہ وہاں عربی فارسی اور اردو کی تعلیم اور ان سے متعلقہ مضامین پر ریسرچ کا اعلیٰ انتظام ہے یہ سب کچھ پروفیسر مولوی محمد شفیع۔ پروفیسر اقبال مرحوم اور پروفیسر شیرانی مرحوم کی کوششوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے ہندوستان میں ان مضامین کی تعلیم و تحقیق کا معیار یورپ کی کسی بڑی سے بڑی یونیورسٹی کے برابر کر دیا تھا اس سلسلہ میں ان تینوں حضرات نے پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں عربی فارسی اور اُردو کے مخطوطات کا بھی الیا عمدہ ذخیرہ فراہم کر دیا تھا کہ کسی دوسری جگہ مجموعی طور پر نظر نہیں آتا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ انھیں فاضل پروفیسروں کے تربیت یافتہ خصوصی اور ان کے جانشین ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان مخطوطات کی مفصل فہرست مرتب کرنے کا ذمہ اُٹھایا ہے چنانچہ زیر تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ پہلی فہرست میں تاریخ کی کتابوں کا تذکرہ تھا اس فہرست میں ان ۱۷۷ مخطوطاتِ فارسی کا تذکرہ ہے جو فارسی شاعری سے تعلق رکھتی ہیں فاضل مرتب نے جو اپنی علمی تحقیقات کے باعث کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں اس فہرست کو کیمبرج یونیورسٹی کی فہرست مخطوطات کے نمونہ پر مرتب کیا ہے جس سے ایک مخطوطہ کے متعلق مفصل معلومات یعنی یہ کہ وہ کس موضوع پر ہے۔ کب لکھا گیا ہے

کس نے لکھا ہے مصنف کا سالِ ولادت ووفات کیا ہے۔ یہ مخطوطہ کس تقطیع پر ہے اور اس کی عام حالت کیسی ہے یہ بیک وقت حاصل ہو جاتی ہیں پھر کتاب کے شروع کی پہلی سطر بھی بطور نمونہ دے دی گئی ہے

مخطوطات کی ایسی جامع اور مفصل فہرست مرتب کرنا نہایت صبر آزما اور کٹھن کام ہے پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کام کے لئے یونیورسٹی میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا بھی نہیں سکتا تھا ہم ڈاکٹر صاحب اور یونیورسٹی دونوں کو اس اہم کام پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ باقی جلدیں بھی جلد شائع ہوں گی ارباب ذوق وتحقیق کے لئے اس کی اہمیت کسی دلیل کی محتاج نہیں۔

مناجات مقبول مع شرح | تقطیع خورد ضخامت ۱۶۶ صفحات کتابت وطباعت عمدہ قیمت عہ پتہ:۔ صدق بک ایجنسی گولہ گنج۔ لکھنؤ۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن مجید اور احادیث سے منتخب کرکے دو سو دعاؤں کا ایک مجموعہ قربات عنداللہ وصلوٰۃ الرسول" کے نام سے عرصہ ہوا شائع کیا تھا اب ان کے مرید باصفا مولانا عبدالماجد دریا بادی نے انھیں دعاؤں کو اپنی آسان و رواں اُردو میں شرح و ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ دعا جس کی نسبت ارشاد مبارک ہے کہ الدعاء یرد القضا" اسلامی تعلیمات میں اس کی اہمیت وضرورت ظاہر ہے اس بناء پر اُمید ہے کہ ہر مسلمان اس مجموعہ سے استفادہ کرےگا البتہ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ متن میں اعراب کی غلطی جگہ جگہ رہ گئی ہیں جن کی وجہ سے مطلب نہ صرف خبط بلکہ بسا اوقات اُلٹا ہو جاتا ہے ضرورت تھی کہ ایک غلط نامہ بھی لگا دیا جاتا۔

شہدائے اُحد مؤلفہ مولوی عبدالجلیل صاحب رحمانی۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۱۲ صفحات کتابت وطباعت عمدہ قیمت درج نہیں پتہ:- مولوی ظفر عالم صاحب ایڈیٹر اخبار ندائے مدینہ دیوان بھون کا لسیتھانہ روڈ کانپور۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب کا اصل موضوع غزوۂ احد کے شہدائے کرام کے فضائل ومناقب ہیں لیکن اس ضمن میں بدر اور بعض اور غزوات وسریات اوران میں شریک ہونے والے صحابۂ کرام کا تذکرہ بھی آگیا ہے اس موضوع پر اگرچہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کا سلسلہ سیرالصحابہ اُردو میں اب تک سب سے زیادہ جامع اور مستند تصنیف ہے تاہم یہ تذکرے جس زبان سے بھی ہوں موجب برکت وسعادت ہیں امید ہے کہ اس مجموعہ کو بھی اسی طرح شوق سے پڑھا جائیگا۔

فہم قرآن

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنے ہیں؟ اور قرآن پاک کا صحیح منشاء معلوم کرنے کے لئے شارع علیہ السلام کے اقوال وافعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ احادیث کی تدوین کس طرح اور کب ہوئی؟ یہ کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے صفحات ۲۰۰ بڑی تقطیع طبع جدید جس میں مؤلف نے تقریباً تمام مباحث کو نئے سرے سے مرتب کیا ہے۔ اور جا بجا نہایت اہم اور مفید اضافے کئے ہیں۔ فہم قرآن ایک خاص رنگ کی علمی، تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے جو جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے رجحانات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ بڑی تقطیع ع۲، مجلد عہ

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسنین خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہینگی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہینگے۔

۲۔ محسنین۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہونگے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائینگے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائیگا۔

۴۔ احبار۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احباء میں ہوگا ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لیے ہے۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان وادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہوجاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے ۲ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - جدید اڈیشن جس میں نظرِ ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت [illegible] مجلد [illegible]

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ زیرِ طبع

سوشلزم کی بنیادی حقیقت - اشتراکیت کے متعلق جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ مع مقدمہ از مترجم — زیرِ طبع

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

سنہ ۱۹۴۰ء نبی عربی صلعم - تاریخ ملت کا حصہ اول - جس میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے - جدید اڈیشن جس میں اخلاقِ نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے قیمت [illegible] مجلد [illegible]

فہمِ قرآن - جدید اڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے قیمت [illegible] مجلد [illegible]

غلامانِ اسلام - اسی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید اڈیشن قیمت [illegible] مجلد [illegible]

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق - علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید اڈیشن جس میں حک و فک کے بعد غیر معمولی اضافے کیے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین اور سہل کیا گیا ہے - زیرِ طبع -

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - جدید اڈیشن حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات و واقعات تک - قیمت [illegible] مجلد [illegible]

وحیِ الٰہی - مسئلۂ وحی پر جدید محققانہ کتاب زیرِ طبع

بین الاقوامی سیاسی معلومات - یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے کے لائق ہے ہماری زبان میں بالکل جدید کتاب - قیمت [illegible]

تاریخِ انقلابِ روس - ٹراٹسکی کی کتاب "تاریخ انقلاب روس" کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید اڈیشن (زیرِ طبع)

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ کے حالات تک دوسرا اڈیشن [illegible] مجلد [illegible]

اسلام کا اقتصادی نظام : وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے تیسرا اڈیشن [illegible] مجلد [illegible]

مسلمانوں کا عروج و زوال - صفحات ۵۰۰ جدید اڈیشن قیمت [illegible] مجلد [illegible]

خلافتِ راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) جدید اڈیشن قیمت [illegible] مجلد [illegible] مضبوط اور عمدہ جلد قیمت [illegible]

بُرہان

جلد بست وسوم — شمارہ (نہم)

اکتوبر ۱۹۴۹ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ

فہرست مضامین

اس سال انڈین یونین کی طرف سے جو گڈول مشن حجاز مقدس گیا ہے اس میں جمعیۃ العلماء کے دوسرے ممتاز ارکان کے ساتھ برادر محترم مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی بھی شامل ہیں۔ بلدۂ حرم وامن کی زیارت جس عنوان اور تقریب سے بھی ہو سرتاسر خیر و برکت اور موجب افتخار و سعادت ہے اللہ تعالیٰ اس وفد کے ارکان کا حج مبرور و مقبول کرے اور یہ حضرات غلاف کعبہ سے لپٹ کر اور سید کونین کے آستانہ قدس پر سر رکھ کر اپنے لئے غیروں کے لئے اور انسانیت کبریٰ کے لئے جس سے بڑھ کر آج کی دنیا میں کوئی برباد و ستم رسیدہ نہیں ہے جو دعائیں مانگیں ان میں اثر پیدا کرے اور خیریت و عافیت کے ساتھ واپس لائے۔ آمین!!

راقم الحروف کی کتاب "مسلمانوں کا عروج و زوال" کی مقبولیت و پذیرائی کا حال پہلے لکھا جا چکا ہے اب اس سلسلہ میں قارئین کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ اس کتاب کا انگریزی اور بنگلہ دونوں زبانوں میں ترجمہ بھی شروع ہو گیا ہے انگریزی ترجمہ آسام گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم کے ایک افسر کر رہے ہیں اور بنگلہ زبان میں ترجمہ کا کام اس زبان کے ایک ادیب اور شاعر جو جیّد عالم بھی ہیں کلکتہ میں انجام دے رہے ہیں دور ہونے کی وجہ سے پہلے ترجمہ کی رفتار کا حال تو معلوم نہیں ہو سکا البتہ بنگالی ترجمہ جس رفتار سے ہو رہا ہے اگر یہ قائم رہی تو امید قوی ہے کہ اب سے تین ماہ کے اندر اندر یہ ختم ہو جائے گا۔

پچھلے دنوں برادر مکرم مولانا محمد حفظ الرحمن نے کانگرس اسمبلی پارٹی اور دستور ساز اسمبلی میں زبان کے مسئلہ پر جو بلند پایہ تقریر کی ہے اس کا ذکر اخبارات میں آچکا ہے آئینی حیثیت سے اگرچہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا لیکن یہ واقعہ ہے کہ حقائق کے اظہار اور دلائل کے اعتبار سے یہ تقریر انڈین یونین کی مجلس دستور ساز کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی اس کی اخلاقی فتح یہ ہی کچھ کم نہیں ہے کہ اس نے ہندی کے ایک زبردست حامی ہندو ممبر سے جو مولانا کی تقریر سن کر اس درجہ چراغ پا ہو گئے تھے کہ وزیر اعظم اور صدر اسمبلی دونوں کو انھیں متنبہ کرنا پڑا۔ صاف لفظوں میں یہ اقبال کرنا پڑا کہ بیشک اس وقت اکثریت تقسیم ہند کے زیر اثر اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے مولانا اور اُن کے ہم خیال ابھی دو تین برس ٹھہریں پھر اُردو فارسی بھی ہوگی اور اس کا رسم الخط بھی ہوگا

کوئی حق بات جب بھی کہی جائے اور جس انداز میں کہی جائے بہر حال لائق قدر اور قابل ستائش ہے اس لئے سچ یہ ہے ہمارے دل میں اس ہندو بھائی کی اس بیساختہ حق گوئی کا بڑا احترام ہے کوئی شخص اگر غصہ میں کوئی کام کر رہا ہے اور یہ جانتے ہوئے کر رہا ہے کہ غصہ کی وجہ سے وہ اپنے آپے میں نہیں ہے تو اس سے یہ توقع بیجا نہیں ہے کہ وہ غصہ فرو ہونے کے بعد ضرور اپنی غلطی پر پشیمان ہوگا اور اس وقت اگر ممکن ہوا تو تلافی مافات کی سعی کریگا۔ رہا دو تین سال کا انتظار! تو اس کی نسبت ہم اُردو کے قدر دانوں کی طرف سے اتنا ہی کہہ سکتے ہیں

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

پچھلے دنوں انگریزی اخبار اسٹیٹسمین کے مراسلات کے کالم میں ایک ہندو نامہ نگار کا خط زبان کے مسئلہ پر چھپا تھا اس نامہ نگار نے بھی اس بارہ میں ایک دلچسپ نکتہ پیدا کیا ہے وہ کہتا ہے یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے نہ کہ قومی او نیشنل زبان اس بنا پر جہاں تک سرکاری کاغذات کا تعلق ہے ان میں ہندی استعمال ہوگی لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان بیسیوں زبانوں کا ملک ہے اس لیے یہاں کی ہر زبان نیشنل زبان ہے اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ان سب زبانوں کی ترقی ترویج اور اشاعت کی کوشش کرے اور ان سب کے ساتھ یکساں معاملہ کرے۔

بہرحال اب بحث و گفتگو اور ردّ و کد کا وقت گذر گیا۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ ہندوستانی کا پردہ درمیان سے اٹھ گیا اب اردو کے حامیوں کو جو کچھ کرنا ہے وہ صاف اور کھلے طریقہ پر اردو کے نام سے کرنا چاہیے۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور اب پھر لکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں سب سے بڑی ذمہ داری مسلمانوں پر عاید ہوتی ہے۔ اس زبان کی ایجاد اگرچہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہوئی لیکن یہ عجیب و غریب حقیقت ہے کہ اس کی ترقی و اشاعت اور اس کا بناؤ سنگار، حسین و دلکش تراش خراش اور اس کی آرائش و زیبائش یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب کہ مسلمان حکومت سے محروم ہو چکے تھے اور ان پر ایک ہمہ گیر ادبار چھایا ہوا تھا پھر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس زبان نے اپنی رعنائی سے ان علاقوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا جو اس کے خاص وطن کے شمال و جنوب میں دور دراز کی مسافتوں پر واقع تھے۔ آج بلا خوف تردید اس بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی بین الصوبجاتی زبان اگر کوئی ہے تو وہ صرف اردو ہے اس زبان کو سمجھنے اور بولنے والے آپ کو یوپی کے علاوہ دوسرے صوبوں کے لوگ بھی ملیں گے۔ لیکن کوئی اور زبان ایسی نہیں ہے کہ اس کو اس کے صوبہ کے لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی سمجھتے یا بول سکتے ہوں اردو کے فلم ہر صوبہ میں چلتے ہیں اور لوگ اس سے لطف اٹھاتے ہیں لیکن کسی اور صوبائی زبان کا فلم اس کے علاوہ کسی اور صوبہ میں نہیں چل سکتا۔

بہرحال اردو زبان کی یہ جاذبیت اور اس کی فطری دلکشی اس بات کی ضامن ہے کہ حالات کے مخالفت کے باوجود اتقاءِ اصلح کے قانون کے مطابق یہ زبان قائم و برقرار رہے گی اور پھلے پھولے گی۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ اس زبان کے علمبردار ہمت، حوصلہ، ایثار اور بلند نظری سے کام لیں اور اس کو زندہ رکھنے کے لئے جن کوششوں کی ضرورت ہے ان سے پہلو تہی نہ برتیں۔

امام ابراہیم نخعی

(مولانا ابو محفوظ الکریم صاحب معصومی استاذ مدرسۂ عالیہ کلکتہ)

امام نخعی اور ان کے اقران امام شعبی، طاؤس بن کیسان، سعید بن جبیر، سعید بن المسیب حسن بصری، مکحول دمشقی وغیرہم ان اجلۂ تابعین میں ہیں جن کی سعی سے اسلامی فقہ و احکام اور صحابہ کرام کے فتاویٰ و قضایا محفوظ رہے، اسلامی تشریع کی تاسیس انھی بزرگوں نے شروع کی،

امام ابو حنیفہ کا عالمگیر مسلک جو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور اُن کے اصحاب کے فتاویٰ و روایات کا خلاصہ سمجھا جاتا ہے، دراصل امام نخعی کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے جسے انھوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کے جلیل القدر شاگردوں سے حاصل کیا سطور ذیل میں امام موصوف کی زندگی اور ان کے علمی کارنامہ پر طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔

نام ونسب ابراہیم نام، ابو عمران[1] اور ابو عمار[2] کنیت، ابن یزید بن[3] الاسود بن عمرو بن ربیعہ بن حارثہ ابن سعد بن مالک بن النخع (وہو جسر[4]) بن عمرو بن علۃ بن خالد بن مالک بن ادد۔

ابن خلکان کے نزدیک مذکورہ بالا نسب نامہ صحیح ہے اور کلبی کی جمہرہ النسب سے منقول ہے حافظ ابن حجر ذیل کا نسب نامہ نقل کرتے ہیں۔

---

[1] ابن سعد: ج ۶ ص ۲۸۸، وفیات ج ۱ ص ۳، تہذیب التہذیب: ج ۱ ص ۱۷۷، کتاب المعارف لابن قتیبہ: ۲۳۵ (لیڈن)، [2] ابن خلکان: ج ۱ ص ۳ [3] ابن سعد: ج ۶ ص ۱۸۸، ابن خلکان: ج ۱ ص ۳ [4] وفیات ص ۳ انساب سمعانی،

"ابراہیم بن یزید بن قیس بن الاسود بن عمرو بن ربیعۃ بن ذہل[1] النخعی"

نخع (بفتح النون[2] والخاء المعجمۃ) یمن کے ایک قبیلہ کا نام ہے جو بنی مذحج کی شاخ تھا، یہ شاخ اپنے جد اعلیٰ جسر ابن عمرو کے لقب پر نخع کے نام سے مشہور ہوئی، جسر کو نخع کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی قوم سے جدا ہوگیا تھا، ابن خلکان کا بیان ہے :-

وانما قیل[3] لہ النخع لانہ انتخع من قومہ ای بعد عنھم	اس (جسر) کو نخع کہا گیا، اس لئے کہ وہ اپنی قوم سے دور ہوگیا تھا۔

بنی آزد کے ایک بطن کا نام بھی نخع[4] تھا،

امام نخعی فقیہ کوفہ اسی یمنی قبیلہ کی طرف منسوب ہیں، امیرالمومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں جب کوفہ آباد ہوا تو قبائل یمن کے ساتھ بنو نخع بھی وہیں جاکر سکونت پذیر[5] ہوئے، یہاں یہ قبیلہ خوب پھلا پھولا۔ اور اس میں بڑے بڑے ائمہ فقہ وحدیث پیدا ہوئے، علقمہ، اسود، ابراہیم اسی قبیلہ کے افراد تھے، جو فقہ واحکام کے عمائد واساطین میں شمار کیے جاتے ہیں۔

نخعی کی ولادت | امام نخعی مشہور تابعی اسود بن یزید کے بھانجے ہیں، ان کی والدہ کا نام ملیکہ[6] بنت یزید بن قیس النخعیہ ہے۔ امام نخعی کی ولادت بہ قول ابن حبان[7] (م ۳۵۴ھ) ۵۰ھ میں ہوئی لیکن نخعی کی کل مدت عمر کو مدنظر رکھتے ہوئے ۵۰ھ کی تعیین صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے،

ابن خلکان[8] کا بیان ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر ۴۹ برس تھی، ایک اور قول کی بنا پر ۵۸ برس کا ثبوت ملتا ہے، لیکن پہلا قول صحیح ہے، کتاب المعارف[9] لابن قتیبہ سے معلوم

---

[1] تہذیب ج ۱ ص ۱۷۷ [2] الانساب سمعانی [3] وفیات ج ۱ ص ۳ [4] لسان العرب لفظ نخع [5] انساب سمعانی [6] وفیات : ج ۱ ص ۳ [7] تہذیب : ج ۱ ص ۱۷۷ [8] وفیات : ۱/۳ [9] صد ۲۲۵

ہوتا ہے کہ ۴۶ برس کل عمر تھی، یحییٰ بن سعید القطان تصریح کرتے ہیں کہ پچاس سے متجاوز تھی اور ابوبکرؒ بن عیاش کہتے ہیں کہ پچاس کے قریب تھی علامہ ذہبی کا بیان حسب ذیل ہے۔

مات ابراھیم فی اخر سنۃ خمس وتسعین کھلا قبل الشیخوخۃ	ابراہیم النخعی سنہ ۹۵ کے اخیر میں سن شیخوخت سے پہلے مرے

طبقات ابن سعد کا فیصلہ بھی سن لیجئے:-

واجمعوا علی انہ توفی فی سنۃ ست وتسعین فی خلافۃ الولید بن عبد الملک بالکوفۃ وھو ابن تسع واربعین	اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کی وفات ۹۶ھ میں بعہد ولید بن عبد الملک کوفہ میں ہوئی، اس وقت وہ ۴۹ برس کے تھے۔

ان اختلافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سال ولادت کا تعین اوائل سنہ ۴۶ھ یا اواخر سنہ ۴۵ھ کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم وتربیت | کوفہ اس زمانہ میں علم وفن کا زبردست مرکز تھا، اس کی علمی اور دینی مرکزیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ستر اصحابؓ بدر اور تین سو اصحاب الشجرہؓ یہاں اقامت پذیر ہوئے، حضرت عمر وعلی رضوان اللہ علیہما کوفہ کو "جمجمۃ الاسلام" اور "کنز الایمان" کا خطاب دیتے ہیں صحابۂ کرام نے اس سرزمین کو اپنی تعلیم وتربیت سے بقعۂ نور بنا دیا تھا، جہاں شعر وادب، نحو وزباندانی، فقہ واحکام آثار وسنن کے چشمے موجزن تھے، خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے نامور اصحاب وتلامیذ علقمہ واسود وغیرہما کوفہ میں احکام قرآنیہ وتشریعات کی زمین ایسی ہموار کر چکے تھے کہ آئندہ اسی سطح پر فقہ حنفی کی عالیشان عمارت کھڑی ہوئی حضرت

لہ طبقات: ج ۶ ص ۱۹۹ لہ ایضاً لہ تذکرۃ الحفاظ ج ۱: ص ۶۹ لہ ج ۶ ص ۱۹۹ لہ ج ۶ ص ۴ لہ ایضاً طبقات

عہ یعنی وہ صحابہ کرام جو بیعت رضوان میں شریک تھے، یہ بیعت ۶ھ میں بمقام حدیبیہ ہوئی تھی منہ

ابن مسعود اور ان کے نامور شاگردوں کی علمی خدمات کا اعتراف بڑے بڑے اعیان امت سے منقول ہے، یہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قول کی نقل پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

اصحاب[۱] عبد اللہ سرج هذه القریة	عبد اللہ (ابن مسعود) کے اصحاب اس سرزمین کے چراغ ہیں۔

امام نخعی کی تربیت اصحاب[۲] عبد اللہ کے دامن عاطفت میں ہوئی ان کے فتاوی و قضایا اور فقہ و حدیث کا بیش بہا گنجینہ اپنے دل و دماغ میں محفوظ کیا، اور جب تدوین کتب کا دور آیا تو یہی خزانہ صفحۂ قرطاس پر فقہ حنفی کے نام سے عام ہو گیا۔

شوق تحصیل | زمانۂ تحصیل میں علمی شغف کا یہ عالم تھا کہ اپنے زملاء کے ساتھ بیٹھتے تو استاد کی تقریر اس استغراق سے سنتے تھے کہ کسی کو یہ خیال بھی نہیں گذرتا تھا کہ نخعی بھی اس مجلس میں موجود ہیں محمد بن سیرین (م ۱۱۰ھ) کہتے ہیں:۔

انی لاحسب[۳] ابراهیم الذی تذکرون	میں سمجھتا ہوں کہ ابراہیم جس کا تم لوگ ذکر کرتے ہو
فتی کان یجالسنا فیما اعلم عند مسروق	وہی جوان ہے جس کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ مسروق کی مجلس میں اس طرح بیٹھتا تھا گویا وہ ہم لوگوں میں
فکأنه لیس معنا وهو معنا	موجود ہی نہیں۔

ابن سیرین اسی نوجوان کو علقمہ کی مجلس درس میں بھی اسی عالم میں پاتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

---

[۱] طبقات، ج ۶ ص ۴، [۲] ایضاً ج ۶ ص ۱۸۸ [۳] اصحاب عبد اللہ کا اطلاق اسود، علقمہ اور ان کے زملاء کے علاوہ حضرت ابراہیم نخعی، اعمش وغیرہم پر بھی ہوتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ تصریح فرماتے ہیں ولعبد اللہ بن مسعود اصحاب یعرفون باصحاب عبد اللہ بن مسعود لیس لهم سمة الا هذا اصحبوه طویلا ولحلوه جمیلا، واثنوا علیه جزیلا منهم علقمة بن قیس والاسود بن یزید النخعی وعمرو بن میمون الاودی وربیع بن خثیم ولهولاء اصحاب یعرفون لیس لهم سمة الا اصحاب عبد اللہ، منهم ابراهیم النخعی وابو اسحق السبیعی والاعمش ومنصور، ازالة الخفاء مقصد دوم ص ۱۸۵

هو[1] فی القوم کانه لیس فیهم — وہ جماعت میں اس طرح ہوتا گویا اس میں موجود ہی نہیں۔

شیوخ امام نخعی | امام نخعی نے جن شیوخ سے استفادہ کیا ان میں اسود بن یزید (م سنہ ۷۵ھ یا ۷۴ھ)، عبدالرحمٰن بن یزید، علقمہ بن قیس (م سنہ ۶۲ھ) مسروق بن الاجدع (م سنہ ۶۲ یا ۶۳ھ)، ابو معمر[2]، ہمام[3] بن الحارث، قاضی شریح (م سنہ ۷۶ یا ۷۸ یا ۷۹ھ) اور سہم[4] بن منجاب وغیرہم کی شخصیتیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں،

علامہ ذہبی نے امام نخعی کے متعلق شعبی کا مندرجۂ ذیل قول نقل کیا ہے:۔

"فذاك[5] الذی یروی عن مسروق ولم یسمع منه" — وہ مسروق سے روایت کرتے ہیں حالانکہ مسروق سے سماع نہیں کیا۔

لیکن محمد بن سیرین کے مذکورہ بالا بیان اور تہذیب التہذیب کی تصریح سے صاف ظاہر ہے کہ مسروق سے نخعی نے روایت کی ہے

علقمہ کے ساتھ نخعی کو خاص تعلق رہا ان کی خدمت میں صغر سنی سے رہے، عبداللہ بن مسعود کے فقہ کا قیمتی ذخیرہ علقمہ ہی کے ذریعہ نخعی کو ہاتھ آیا، ابو قیس کا بیان ہے۔

رأیت[6] ابراهیم غلاماً محلوقاً یمسك لعلقمة بالرکاب یوم الجمعة — میں نے ابراہیم کو بچپنے میں دیکھا ہے کہ اس کا سر گھٹا ہوا تھا اور وہ علقمہ کا رکاب جمعہ کے دن تھامے تھا

صحابہ کرام سے ملاقات | علقمہ واسود زمانۂ حج میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اکثر ملاقات

---

[1] ایضاً ج ۶ ص ۱۸۹ [2] المتوفی بالکوفة فی ولایة الحجاج [3] تہذیب ج ۱ ص ۷۷، [4] تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۶۹

[5] میزان الاعتدال: ج ۱ ص ۳۵ [6] طبقات: ج ۶ ص ۱۹۰

کرتے نخعی ان دونوں کے ہمسفر ہوتے اور حضرت ام المومنین کی ملاقات سے مشرف ہوتے تھے، اس وقت تک نخعی سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے ان کا بیان ہے کہ حضرت عائشہؓ کو سرخ لباس[۱] پہنے دیکھا تھا یحییٰ بن معین کہتے ہیں

"ادخل علی عائشۃ وھو صغیر"[۲]	لڑکپن میں حضرت عائشہؓ کے یہاں گئے تھے

محمد بن ادریس الشہیر بابی حاتم الرازی (م ۲۷۷ھ) کی تصریح ہے:۔

لم یلق[۳] احدا من الصحابۃ الا عائشۃ	ان کی ملاقات حضرت عائشہؓ کے سوا کسی سے
ولم یسمع منھا وادرک انسا	نہیں ہوئی، حضرت عائشہ سے سماع نہیں کیا
ولم یسمع منہ	حضرت انس کا زمانہ پایا لیکن سماع نہیں کیا۔

ان روایات کے خلاف ابن المدینی (م ۲۳۴ھ) کہتے ہیں:۔

لم یلق[۴] النخعی احدا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	نخعی صحابہ کرام میں سے کسی سے نہ ملے۔

گویا ان کو حضرت عائشہ کی ملاقات سے بھی انکار ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ اور نخعی کی ملاقات صرف بطریق سعید بن ابی عروبہ

عن ابی معشر عن ابراھیم ثابت ہے اور یہ سند کمزور ہے لیکن حضرت عائشہؓ سے نخعی کی ملاقات[۵] ایک تاریخی حقیقت ہے جس پر علی بن عبداللہ المدینی کے سوا تقریباً سب کا اتفاق ہے اور سعید بن ابی عروبہ

ابن حبان کتاب الثقات[۶] میں لکھتے ہیں کہ نخعی ۵۰ھ میں پیدا ہوتے اور ان کو حضرت مغیرہؓ اور انسؓ سے سماع کا اتفاق ہوا اس کے متعلق علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ مغیرہؓ کی وفات ۵۰ھ میں اور نخعی کی ولادت بھی اسی سنہ میں ہوئی، پھر مغیرہ سے سماع حدیث کیونکر ممکن ہوا

کی روایت جس کی سند کو ابن المدینی کمزور بتاتے ہیں ابن حبان کے بیان سے سند صحیح ہو جاتی ہے[۵]

---

[۱] تہذیب ج ۱ ص ۱۷۷، طبقات: ج ۶ ص ۱۸۹، [۲] تہذیب ص ۔ [۳] ایضاً تہذیب [۴] تہذیب ج ۱ ص ۱۷۷، [۵] ایضاً [۶] ایضاً

حضرت انسؓ سے سماع حدیث کے متعلق ابن حجر[1] کی تحقیق یہ ہے کہ مسند بزار میں حضرت انسؓ سے نخعی کی ایک روایت موجود ہے جس کے متعلق بزار[2] کہتے ہیں:

لا نعلم ابراهيم اسند عن انسؓ الا هذا	ہمیں نہیں معلوم کہ نخعی نے حضرت انسؓ سے اس حدیث کے سوا کبھی اسناداً روایت کیا ہو

حضرت ابوجحیفہ[3]، زید بن ارقم (م ۶۶ھ) اور عبداللہ بن ابی اوفیٰ (م ۸۶ھ) سے نخعی کی ملاقات ہوئی حضرت ابن عباس (م ۶۸ھ) سے نخعی کا سماع ثابت نہیں اور بہ قول ابن المدینی حارث بن قیس اور عمرو بن شرحبیل سے کبھی سماع کا اتفاق نہیں ہوا[4]

مسند درس کوفہ کی آبادکاری کا کام ختم ہوا، تو حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا چنانچہ حضرت عمرؓ اہل کوفہ کو لکھتے ہیں:

انی[5] بعثت الیکم بعمار امیرا وعبداللہ بن مسعود معلما ووزیرا وهما من النجباء من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اهل بدر فاقتدوا بهما واسمعوا من قولهما وقد آثرتکم بعبداللہ علی نفسی	میں نے تم لوگوں کے پاس عمار (ابن یاسر) کو امیر بنا کر اور عبداللہ ابن مسعود کو معلم و وزیر بنا کر بھیجا ہے، دونوں رسول اللہ (صلعم) کے اصحاب نجباء میں سے اہل بدر سے ہیں، تم ان دونوں کی پیروی کرو، اور ان کی باتیں سنو، اور عبداللہ کو بھیج کر میں نے تم لوگوں کو اپنے آپ پر ترجیح دی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کے بعد ان کے اصحاب علقمہ بن قیس، اسود بن یزید النخعی، عمرو بن

---

[1] المتوفی ۹۱ھ، آخر من مات من الصحابۃ بالبصرۃ [2] تہذیب: ۱/۱۷۷، ۳؎ م ۸۶ھ علی قول ابن القواری ۸۹ھ [3] تہذیب: ج ۱ ص ۱۷۷ [4] آخر من مات من الصحابۃ بالکوفۃ [5] تہذیب ج ۱ ص ۱۷۷ [6] ازالۃ الخفاء مقصد دوم

میمون الاذدی، ربیع بن خثیم وغیرہم مرجع انام بنے۔ علقمہ واسود کے بعد امام نخعی کوفہ کے مسند درس پر جلوہ فرما ہوئے، اٹھارہ[1] برس کی عمر میں آپ نے فقہ واحکام اور سنن وآثار کی خدمت شروع کی، اور جیساکہ اسلاف کا دستور رہا ہے مسجد الحی میں جا بیٹھتے[2] وہیں ضرورتمند اپنے سوالات واستفسارات پیش کرتے تھے، ان کے تلامیذ لوگوں کے سوالات اور شیخ کے جوابات سنتے اور قلمبند کر لیتے تھے۔ ایک دفعہ حسن[3] بن عبیداللہ نے امام موصوف سے احادیث سننے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے فرمایا کہ مسجد میں جاؤ وہیں کوئی سائل آئیگا تو سن لوگے، غرض اس طرح سنن وآثار، صحابہ کے فتاویٰ وروایات، اور تابعین کرام کے اقوال وافکار کا مذاکرہ واعادہ ہوجاتا تھا۔

تلامیذ امام نخعی سے جن لوگوں نے استفادہ کیا ان میں سے اعمش، منصور ابن عون، زبید، حماد بن ابی سلیمان، مغیرہ بن مقسم الضبی[4] (م ۱۳۳ھ) سماک بن حرب (م ۱۲۳ھ) اور حکم بن عتیبہ بہت ہی مشہور ومعروف ہیں۔

فرائض میں اعمش اور حلال وحرام میں حماد بن ابی سلیمان کا پایہ بلند تھا، ایک دفعہ مغیرہ نے امام نخعی سے پوچھا کہ آپ کے بعد ہم کس سے سوال کریں گے تو امام نخعی نے کہا حماد سے حماد کبھی کبھی اپنے معلومات لکھ لیا کرتے تھے اور کہتے تھے۔

واللہ ما ارید بہ الدنیا — بخدا میں اس کے ذریعہ دنیا کو نہیں طلب کرتا۔

سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں ۱۲۰ھ میں حماد نے وفات پائی۔

اعمش کا نام سلیمان بن مہران ہے، یہ بنو کاہل وبنو اسد کا ایک بطن ہے کے موالی میں

---

[1] معارف ابن قتیبہ ص ۲۳۳ [2] طبقات: ج ۶ ص ۱۹۰ [3] تہذیب ج ۱ ص ۱۷۷ [4] تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۶۹

[5] طبقات: ج ۶ ص ۲۳۲

سے تھے، ان کے متعلق محمد بن سعد کا بیان ہے

وکان الاعمش صاحب قرآن و فرائض و علم بالحدیث — اعمش، قرآن، فرائض اور حدیث کے عالم تھے،

یحیی القطان کہتے ہیں:۔

کان من النساک وکان علامۃ الاسلام — عابد وزاہد لوگوں میں سے تھے اور دنیائے اسلام کے علامہ تھے۔

اعمش کی پیدائش ۶۰ھ میں عاشوراء کے دن ہوئی اور وفات ۱۴۸ھ میں، لیکن یحیی بن عیسی الرملی کہتے ہیں کہ ۵۸ھ میں اعمش پیدا ہوئے بہ قول ہشیم بن عدی ۱۴۷ھ میں اور واقدی و فضل بن دکین کا بیان ہے کہ ۱۴۸ھ میں ان کی وفات ہوئی

علمی جلالت | امام نخعیؒ کی علمی جلالت و برتری مسلم تھی، چنانچہ سید القراء طلحہ بن مصرف (م ۱۱۲ھ) کہتے ہیں:۔

ما بالکوفۃ اعجب الیّ من ابراھیم وخیثمۃ — کوفہ میں میرے نزدیک ابراہیم اور خیثمہ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔

مغیرہؒ کہتے ہیں کہ ہم لوگ ابراہیم سے اس طرح ڈرتے تھے، جیسے کوئی صاحب اقتدار حاکم سے ڈرتا ہے

امام نخعی کے جلیل القدر معاصرین کو بھی ان کی فضیلت و تقدم کا اعتراف تھا، حضرت سعید بن جبیر اور امام شعبی جیسے اجلۂ روزگار کے الفاظ اس کے قطعی ثبوت ہیں، حضرت سعید

---

[1] طبقات: ج ۶ ص ۲۳۸ ازالۃ الخفاء (مقصد دوم) ص ۱۵۸ [2] خیثمہ بن عبدالرحمن بن ابی سیرۃ (یزید) بن مالک بن عبداللہ بن ذویب الجعفی الکوفی بہ قول ابن قانع ۸۰ھ میں انتقال کیا، تہذیب ج ۳ ص ۱۷۹ [3] تذکرۃ الحفاظ ۱/۶۹

فرماتے ہیں۔

استفتونی وفیکم ابراھیم النخعی — ابراہیم نخعی کی موجودگی میں مجھ سے فتویٰ طلب کرتے ہو؟[1]

ابن عونؒ امام نخعی کی وفات کے بعد امام شعبی سے ملے تو امام شعبی نے کہا "قسم اللہ کی نخعی نے اپنے بعد کسی کو اپنا ثانی نہ چھوڑا ابن عون نے پوچھا کیا صرف کوفہ میں؟ امام شعبی نے کہا کوفہ ہی پر کیا منحصر ہے، بصرہ، شام وغیرہ ملکوں میں بھی ان کا ثانی نہیں"[2]

امام نخعی کی وسعت معلومات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اعمش نے جب بھی کسی حدیث کا ذکر کیا نخعی نے اس پر اضافہ کیا۔[3] امام شعبی فرماتے ہیں

ماترک احدا اعلم منہ[4] — کسی کو اپنے سے زیادہ جاننے والا نہ چھوڑا

نخعی کے مشہور و جلیل القدر شاگرد اعمش کہتے ہیں کہ ابراہیمؒ حدیث کے صیرفی تھے[5]

نخعی اور ان کے معاصرین امام نخعی کے ہم عصر، حضرت سعید بن جبیر (م ۹۵ھ) امام شعبی، مکحول شامی (م ۱۱۸ھ) حسن بصری (م ۱۱۰ھ) طاؤس بن کیسان (م ۱۰۵ھ) اور بہتیرے ائمہ کبار ہیں جو اپنے اپنے اطراف میں مرجع خلائق بنے ہوتے تھے۔

ان ممتاز معاصرین میں امام نخعی کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ اس دور میں امام نخعی کے سوا نقد حدیث کے جتنے ائمہ واعیان تھے سب ہی موالی تھے صرف امام نخعی کی ذات گرامی تھی جس کو سارا عرب، عجم کے مقابلہ میں پیش کر سکتا تھا۔

ایک دفعہ عبدالملک بن مروانؒ نے امام زہری (م ۱۲۴ھ) سے پوچھا کہ آج مکہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، [2] ایضاً ابن سعد ج ۶ [3] ابن سعد: ج ۶ ص ۱۹۸ [4] طبقات ص... [5] تہذیب ۱/۱۷۷ [6] تذکرۃ الحفاظ [7] تفسیر در روح البیان ۳/۳۲۱ الرق فی الاسلام ص۱۹۱ ایضاً مقالات شبلی ۱/ اس واقعہ کو ہشام بن عبدالملک کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ یہ سوالات عبدالملک ہی کے ہو سکتے ہیں علاوہ بریں امام نخعی کی وفات باتفاق مورخین ولید کے عہد میں ہوئی۔ پھر ہشام کے عہد میں نخعی کا ذکر کیسا؟

کار رئیس کون ہے، زہری نے کہا عطاء بن ابی رباح م ۱۱۵ھ) عبدالملک نے کہا اور یمن میں، زہری نے کہا طاؤس، اسی طرح عبدالملک نے مصر، جزیرہ، خراسان، بصرہ، کوفہ کے متعلق پوچھا اور زہری نے مکحول یزید بن ابی حبیب، میمون بن مہران اور ضحاک بن مزاحم کے نام لیے عبدالملک ہر شخص کے نام پر پوچھتا جاتا تھا کہ یہ عرب ہیں یا عجم، زہری کہتے جاتے تھے کہ عجم، جب ابراہیم نخعی کا نام لیا اور کہا کہ وہ عرب ہیں تو عبدالملک نے کہا کہ اب دل کو تسکین ہوئی۔

نخعی اور شعبی | کوفہ میں امام نخعی کی ہمسری اگر کسی کو حاصل تھی تو وہ امام شعبی (م ۱۰۴ھ) کی ذات گرامی تھی، امام شعبی عمر میں امام نخعی سے بہت بڑے تھے، ان کو پانچ سو صحابہ کرام کی ملاقات کا شرف حاصل تھا،

امام نخعی و شعبی دونوں اہل کوفہ کے قضیے و معاملات طے کرتے تھے اور کوئی مسئلہ آن پڑتا تھا تو یہی دونوں بزرگ فیصلہ صادر کرتے تھے ان دونوں کے اقوال و فتاوے حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت علی کرم اللہ وجہہ و حضرت عمر فاروق رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فیصلوں کے آئینہ دار ہیں، روایت بالمعنی اور ارسال دونوں بزرگوں کے یہاں موجود ہیں۔

لیکن بہ قول ابن عونؒ ان دونوں کی طبیعت میں اس قدر فرق ضرور تھا کہ امام شعبی کی طبیعت میں انقباض تھا اور امام نخعی کی طبیعت میں انبساط، بایں وصف آپ اس قدر محتاط تھے کہ جب تک کوئی سوال نہ کرتا تکلم نہ فرماتے، زبید کا بیان ہے:-

ما سألت ابراهيم عن شئ	میں جب کبھی ابراہیم سے سوال کرتا تو ان کی
الاعرفت فيه الكراهية	ناپسندیدگی ظاہر ہو جاتی۔

---

[۱] طبقات ۶/۱۹۰ و ۱۷۴، [۲] تذکرۃ الحفاظ ۷۹/۱، [۳] تذکرۃ الحفاظ، ابن سعد ۱۸۹/۶

اعمش کہتے ہیں۔

قلت لابراهيم انيك فاعرض عليك	میں نے ابراہیم سے کہا کہ آپ کے پاس آتا ہوں
قال انی لاکرہ ان اقول لشئ کذا	اور سوال پیش کرتا ہوں تو انھوں نے کہا کہ میں ناپسند
وھو کذا	کرتا ہوں کہ کسی چیز کے متعلق کہوں اور اس کی
	حقیقت ہی اور ہو۔

ابو حصین ایک مسئلہ پوچھنے آئے تو آپ نے فرمایا، کوئی اور نہ ملا جس سے پوچھ لیتے[1] غرض خاموش رہنا چاہتے تھے لیکن کب تک خاموشی سے گذار سکتے کہ وہی فقہائے کوفہ کی زبان تھے۔

نخعی کے مراسیل | سلسلۂ سند میں اکثر راوی و مروی عنہ کے درمیان کا واسطہ محذوف ہوتا ہے ایسی روایت فقہا و اصولیین کے نزدیک مرسل کہی جاتی ہے، لیکن محدثین کی خاص اصطلاح یہ ہے کہ اگر تابعی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کا واسطہ مذکور نہ ہو تو وہ حدیث مرسل کہی جائے گی۔

امام نخعی اصحاب مراسیل سے ہیں۔ حافظ ابو سعید علائی ان کو مکثر الارسال کہتے ہیں[2]۔ علوم الحدیث میں امام حاکم[3] کا بیان ہے کہ مدینہ میں ابن المسیب (م ۹۳ھ) مکہ میں عطاء بن ابی رباح، بصرہ میں حسن بصری، کوفہ میں ابراہیم بن یزید نخعی، مصر میں سعید بن ابی ہلال، شام میں مکحول سے اکثر حدیثیں مرسل روایت کی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ امام شعبی، قاضی شریح، محمد بن سیرین، مجاہد بن جبیر المخزومی، ابوایاس معاویۃ بن قرۃ البصری وغیرہم سب اصحاب مراسیل ہیں۔

باقی آئندہ

---

[1] طبقات: ج ۶ ص ۱۹۲ [2] طبقات: ج ۲ [3] تہذیب: ج ۱ ص ۱۷۷ [4] تدریب: ص ۶۹

قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر

از جناب مولوی غلام ربانی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

(۵)

اسی عام دستور کے مطابق ظاہر ہے کہ قرآن کی بھی واقعی شکل اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ جس حال میں پیش کرنے والے نے دنیا کے حوالہ قرآن کو کیا بس یہی قرآن کی اصلی شکل ہے، یہی سمجھا بھی گیا ابتداء سے اس وقت تک اسی شکل میں قرآن نسلاً بعد نسل سے منتقل ہوتا ہوا چلا آرہا ہے۔ یہ ایک واضح کھلی ہوئی بات ہے لیکن کچھ دن سے یورپ کے مستشرقین نے دنیا کو قرآن کے متعلق ایک خاص مسئلہ کی طرف متوجہ کیا یعنی اس کتاب کی ہر سورہ، سورہ کی ہر ہر عبارت کا ہر فقرہ کب نازل ہوا اس کا پتہ چلانا چاہئے۔ سمجھا یہ گیا ہے کہ قرآن کی صحیح مرتب شکل وہی ہوسکتی ہے جس میں نزولی ترتیب (یعنی ان سوالوں کے جواب . . . . کے بعد قرآن کی ترتیب صحیح ترتیب ہوگی مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا تصنیفی کاروبار کرنے والوں کا عام قاعدہ ہے کہ اپنی تصنیف کو آخری شکل میں مرتب کرنے سے پہلے متفرق قسم کی یادداشتوں میں مواد کو نوٹ کرتے رہتے ہیں اور بعد کو ان ہی یادداشتوں کی مدد سے آہستہ آہستہ اپنی کتاب کو مکمل کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات یہ بھی کیا جاتا ہے کہ کتاب کے جس حصہ کے متعلق مواد کو دیکھتے ہیں کہ فراہم ہوچکا ہے تو پہلے اسی حصہ کو لکھ لیتے ہیں، یوں ہی سہولتوں کے لحاظ سے بہ تدریج یہ کام جب پورا ہوجاتا ہے، تب آخری شکل میں کتاب کو مرتب کرکے دنیا کے

سامنے عام قاعدہ ہے کہ مصنفین اپنی کتاب پیش کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہی آخری شکل اس کتاب کی اصلی اور واقعی شکل قرار پاتی ہے اور کسی کے دل میں اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا کہ مصنف کو کن کن مراحل سے اپنی تصنیف کے اس جد و جہد میں گزرنا پڑا۔ اس کا پتہ چلاتے، مصنف کے پرانے فائلوں اور ان بستوں کو ٹٹولے جن میں اس کی یادداشتیں رکھی جاتی تھیں اور کاغذ، سیاہی وغیرہ کی کہنگی اور تازگی کو دیکھ دیکھ کر فیصلہ کرے کہ ان یادداشتوں میں تاریخی طور پر کن کو مقدم اور کن کو مؤخر قرار دیا جائے یا یہ کہ مصنف نے اپنی کتاب کے کس حصے کو پہلے مکمل کیا اور کس حصہ کی تکمیل بعد کو کی۔ بالفرض

"غم نداری بز بخر"

کی ان غیر ضروری جھنجھٹوں میں میں تو خیال کرتا ہوں، کوئی خواہ مخواہ مبتلا بھی ہو، تو ایک قسم کا خبط ہی اس کو سمجھا جائے گا۔ تاہم انسانی تصنیفات کے متعلق سراغ رسانی کی اس غیر ضروری مہم کا ممکن ہے کہ کچھ فائدہ بھی ہو۔ غریب آدمی زندگی کے مختلف دور میں مختلف حالات سے گذرتا رہتا ہے۔ کبھی انشراح قلب انبساط و نشاط کی حالت میں رہتا ہے کبھی انقباض و کوفت دماغی میں مبتلا ہو جاتا ہے یہ اور اسی قسم کے دوسرے نفسیاتی کیفیات کا اثر جیسے زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے۔ انسان کے تصنیفی کاروبار بھی اس سے متاثر ہوں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے، اور کچھ نہیں تو بھی کیا کم ہے کہ کتاب کے کس حصہ کو نشاط و انبساط کی حالت میں مصنف نے لکھا ہے اور کن حصوں کی تکمیل انقباض و کوفت دماغی کے زمانہ میں ہوئی، اس ٹٹول سے اسی کا پتہ چل سکتا ہے مگر اللہ میاں کے متعلق تو مزاجی اور دماغی اتار چڑھاؤ کی اس کیفیت کی بھی گنجائش نہیں۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ غیر تو غیر خود مسلمانوں کا ایک طبقہ جو قرآن کو خدا کی کتاب مانتا ہے

ادھر کچھ دنوں سے اسی لایعنی، غیر ضروری مشغلے میں یورپ کے بعض پادریوں کے اغوائی اشاروں سے الجھ گیا ہے۔

خود بھی اسی میں الجھا ہوا ہے اور جانتا ہے کہ جس مسئلے کا مسلمانوں کے دل پر کسی زمانے میں کبھی کسی قسم کا کوئی خطرہ بھی نہیں گذرا تھا اسی میں ان کو بھی الجھا دے بڑھتے ہوئے بعض تو یہاں تک پہنچ کر کہنے لگے کہ قرآن کا مطلب ہی مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ موجودہ ترتیب کو الٹ پلٹ کر نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کر کے نہ پڑھا جائے عیسائی پادریوں کی بات تو سمجھ میں بھی آتی ہے وہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی افکار و خیالات کا العیاذ باللہ مجموعہ سمجھتے ہیں اس لئے نزولی ترتیب کے پتہ چلانے کا فائدہ یہ بتاتے ہیں کہ اس ذریعہ سے

"ہم ایک زبردست دماغ کی ترقی، ایک پاکیزہ روح کی کمزوری و توانائی اور ایک بڑے انسان کی ناگزیر نیرنگیوں کو دیکھنے لگتے ہیں" (لین پول خطبات واحادیث رسول ص۱)

لیکن خیال تو کیجئے ایک مسلمان بے پارہ جو قرآن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ خالق کائنات کی براہ راست کتاب یقین کرتا ہے کیا اس نزولی ترتیب کی تلاش میں پاپڑ بیلنے کے بعد اللہ میاں کی پاکیزہ روح کی "کمزوریوں اور ناگزیر نیرنگیوں" کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے؟ یا نزولی ترتیب کی جستجو کی دعوت دینے والے کیا اپنے پیدا کرنے والے مالک کی ان ہی مذبوحی حرکات کا تماشا خود بھی اور مسلمانوں کو بھی دکھانا چاہتے ہیں؟

میں نے جیسا کہ عرض کیا انسانی تصنیفوں کے متعلق بھی جب اس قسم کی کریز گیوں کا مالی خولیا دماغوں میں پیدا نہیں ہوتا تو العیاذ باللہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب کے متعلق اس سوال کے اٹھانے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں؟ اور کوئی چاہے بھی تو میں نہیں سمجھتا کہ کسی انسانی تصنیف

کے متعلق بھی ان باتوں کا پتہ چلانا آسان ہے کہ مصنف کو اس کی ترتیب کے سلسلے میں کن مرحلوں سے گذرنا پڑا، یادداشتوں میں کون سی یادداشت پہلے نوٹ ہوئی اور کون بعد، یا کتاب کا کون سا حصہ پہلے مکمل ہوا۔ اور کون بعد، قرآن کے ساتھ مسلمانوں کی غیر معمولی دلچسپیوں نے جہاں بہت سی عجیب و غریب چیزیں قرآن کے متعلق پیدا ہو گئی ہیں مثلاً اس کتاب کے ایک ایک حرف اور حروف کے اعراب یعنی زیر، زبر، پیش، سب ہی کو انھوں نے ثواب کا کام سمجھ کر گن لیا ہے، اور جو کچھ اس سلسلے میں تیرہ سو برسوں کی طویل مدت میں وہ کرتے چلے آئے ہیں ایک مستقل کتاب کا وہ مضمون ہے غیر معمولی دلچسپیوں کے اسی ذیل میں دنیا کی تمام کتابوں کے مقابلہ میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے کل تو نہیں لیکن معقول اور معتدبہ حصہ کے متعلق مسلمانوں میں ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں، جن سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی کون سی سورہ کس مقام میں اُتری یعنی مکہ میں یا مدینہ میں، اسی طرح ان ہی روایتوں میں اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ فلاں آیت یا آیتوں کا مجموعہ فلاں مشہور واقعہ کے وقت اترا۔ شان نزول کی اصطلاح ان ہی معلومات کے متعلق مسلمانوں میں مروج ہے اور یہ بھی ایک حد تک صحیح ہے کہ ان روایتوں کی مدد سے سورتوں کی کافی تعداد کے متعلق اس کا پتہ چلا لیا گیا ہے کہ مکہ میں اُتریں یا مدینہ میں اور کچھ تھوڑی بہت آیتوں کے متعلق بھی کوئی چاہے تو اس قسم کے معلومات فراہم کر سکتا ہے لیکن ان ساری معلومات کے بعد بھی مسلمانوں نے نہیں بلکہ یورپ کے ان ہی پادریوں نے جو آج کل استشراق کی نقاب چہروں پر ڈال کر یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ بجائے دینی اور مذہبی عصبیت کے ان کے کاروبار کا تعلق صرف علمی تحقیقات سے ہے۔ بہرحال مستشرقین کا یہی طبقہ دو ڈھائی سو سال کی کدوکاوش کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ

"صحیح ترتیب نزول کا معلوم کرنا ناممکن ہے" (نولڈکی)

برٹش فیلڈ جو اسی فیلڈ کا مشہور سپاہی ہے اس بے چارے کو بھی اسی اعتراف پر مجبور ہونا پڑا کہ

"میں پہلے ہی سے اس کا اقرار کیوں نہ کر لوں کہ اس سلسلے میں (یعنی نزولی ترتیب کی جاسوسی میں)

قابل اعتماد نتائج حاصل کرنے کی بہت ہی کم امید ہے۔" (یہ فقرے بہ دفنیر احمل کی کتاب سے لئے گئے ہیں)

اور یہ حال تو اس وقت ہے جب قرآن کی موجودہ متواتر، و قطعی مسلمہ ترتیب میں ترمیم کی اجازت ان روایتوں کی بنیاد پر دی جو شان نزول کے سلسلے میں ہماری کتابوں کے اندر پائی جاتی ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ روایات کا جو ذخیرہ ہمارے یہاں پایا جاتا ہے اس ذخیرے میں سب سے زیادہ کمزور اور حد سے زیادہ ضعف ان روایتوں کی خصوصیت ہے جن کا تعلق قرآن کی تفسیر وغیرہ سے ہے، محدثین کا اس پر اتفاق ہے، تواتر و توارث کے نیر تاباں کی روشنی مذ ہباً نہ سہی عقلاً ہی سہی میں پوچھتا ہوں کہ جگنو کے دم کی روشنی سے کیا مغلوب ہو سکتی ہے جن چیزوں کو آفتاب کی روشنی میں ہم دیکھ رہے ہیں اور جو معلومات اس روشنی میں حاصل ہوئے ہوں، کیا ان معلومات میں ترمیم کی جسارت ان چیزوں کی مدد سے کوئی کر سکتا ہے جن پر گھپ اندھیری رات میں جگنو کی دم کی روشنی میں اتفاقاً کسی کی نظر پڑ گئی یقین کیجئے کہ قرآن کی موجودہ مرتب تشکل کے متعلق ہمارے علم کی عقلی کیفیت، نزولی روایات کے مقابلہ میں بھی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے[1]

---

[1] نزولی روایات کی حیثیت اور سنداً ان کا دوسرے اسلامی روایات کے مقابلہ میں کیا درجہ ہے ایک مستقل مضمون ہے سب سے پہلا مسئلہ اس سلسلہ کا یہ ہے کہ کسی آیت یا آیتوں کے کسی مجموعہ کے متعلق صحابی یا تابعی جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں معاملہ میں نازل ہوئی یعنی نزل فی کذا وہ کہتے ہیں تو اس کا واقعی مطلب کیا ہوتا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ علامہ زرکشی صاحب البرہان،، حضرت شاہ ولی اللہ اور دوسرے اکابر ائمہ اسلام نے تصریح کی ہے کہ جس معاملہ یا جس واقعہ پر قرآن کی وہ آیت صادق آتی ہے تو اسی کے متعلق تعبیر کا یہ ایک طریقہ تھا یعنی یہ آیت فلاں چیز پر صادق آتی ہے اسی مفہوم کو نزل فی کذا سے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

نزولی ترتیب کا ایک تاریخی لطیفہ | اسی نزولی ترتیب کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ وہ بھی ہے جسے منسوب کرنے والوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کر کے کچھ اس طرح اسے مشہور کر دیا ہے کہ عوام میں گویا یہ مان لیا گیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کر کے ایک نسخہ واقعہ میں تیار کیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس نزولی ترتیب کا مطلب اگر صرف یہی ہے کہ جلد بندی میں سورتوں کی یعنی ان قرآنی رسالوں کی جو ترتیب اس وقت پائی جاتی ہے یعنی پہلے سورہ فاتحہ، پھر البقرہ پھر آل عمران آخر الناس تک۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نسخے میں سورتوں کی ترتیب یہ نہ تھی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے الفاظ سے لوگ ادا کرتے تھے قیامت تک پیش آنے والے واقعات پر قرآنی آیتیں عموماً صادق آتی ہیں اس لئے ہم ہر زمانہ میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت فلاں معاملہ یا واقعہ یا مسئلہ کے متعلق نازل ہوئی لیکن اس کا یہ مطلب کہ واقعتہً اسی وقت وہ آیت نازل ہوئی صحیح نہ ہوگا دیکھو اتقان (نوع ۹) شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر میں بھی یہی لکھا ہے ابن تیمیہ اور زرکشی کے اقوال اتقان میں ہیں، علاوہ اس کے کون نہیں جانتا کہ نزولی روایتوں سے بخاری و مسلم بلکہ صحاح ستہ کی اکثر کتابیں خالی ہیں دوسرے بلکہ زیادہ تر تیسرے درجہ کی کتابوں میں یہ روایتیں ملتی ہیں اور اس پر بھی حال ان روایتوں کا یہ ہے کہ ایک ایک آیت کے متعلق شان نزول کی روایتوں میں متعدد واقعے بیان کئے گئے ہیں ان روایتوں کی کیا حالت ہے ان کا سرسری اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اور تو اور یہ مسئلہ کہ سب سے پہلی نازل ہونے والی آیت تک کے متعلق ایک سے زائد روایتیں پائی جاتی ہیں عام طور پر اقراء کے متعلق مشہور ہے لیکن نزولی روایات کے ذخیرے میں دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ بعض لوگ سورہ فاتحہ کو بعض لوگ سورہ الفلق کو سب سے پہلی نازل ہونے والی سورہ قرار دیتے ہیں، اسی طرح کہاں نازل ہوئی؟ اس سوال کے جواب میں آپ کو سورہ فاتحہ تک کے متعلق معلوم ہوگا کہ بجائے مکہ کے کہتے ہیں مدینہ میں نازل ہوئی اور یہ تو عام بات ہے کہ ایک ہی آیت کے متعلق پانچ پانچ چھ چھ شان نزول تک مروی ہے ابن قیم نے محدثین کے اس طرز عمل پر کہ ان ہی نزولی روایتوں کی وجہ سے کہدیتے ہیں کہ فلاں آیت پانچ دفعہ مثلاً نازل ہوئی سخت تنقید کی ہے ۱۲۔

تو میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس میں کوئی اہمیت نہیں ہے، کسی ایک مصنف کی چند کتابوں مثلاً سعدی کی گلستاں و بوستاں کی جلد بندی میں آپ خواہ بوستان کو پہلے رکھوا دیجئے یا گلستان کو ان دونوں کتابوں کے مضامین پر کوئی اثر اس کا نہیں پڑتا اور ابھی آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض دوسرے صحابہ کے قرآنی نسخوں کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ ان میں سورتوں کی ترتیب وہ نہ تھی جو اس وقت پائی جاتی ہے لیکن اس نزولی ترتیب کا مطلب اگر یہ ہے کہ ہر ہر سورہ میں اگر آیتوں کے اندر جو ترتیب اس وقت پائی جاتی ہے حضرت علی والے مرتبہ نسخے میں بجائے اس ترتیب کے کوئی اور ترتیب آیتوں میں دی گئی تھی تو اس کا ؟ نتیجہ کیا ہو سکتا ہے اس کی دلچسپ داستان تو ابھی آپ کو معلوم ہوگی لیکن چونکہ حضرت علی کی طرف اس روایت کو منسوب کر کے مختلف قسم کی غلطیاں پھیلانے والے پھیلا رہے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود اس روایت کی جو واقعی حیثیت اور کیفیت ہے پہلے اس سے مسلمانوں کو مطلع کر دیا جائے۔

واقعہ صرف یہ ہے کہ روایات اور حدیثوں کی موجودہ عام کتابوں مثلاً بخاری و مسلم اور ان کے سوا صحاح کی جو دوسری کتابیں ہیں ان میں سے کسی کتاب میں یہ روایت نہیں پائی جاتی حدیث کی ان کتابوں میں ہی نہیں بلکہ جن کتابوں کو حدیث کی کتابیں کہتے ہیں خواہ سنداً ان کا مقام کتنا ہی گرا ہوا ہو ان میں بھی یہ روایت نہیں ملتی چند غیر معروف کتابیں جن کا ذکر سیوطی نے اتقان میں کیا ہے ان کے سوا سند کے ساتھ صرف ابن سعد کی کتاب طبقات میں اس وقت تک مجھے یہ روایت ملی ہے کنز العمال میں بھی اس روایت کو نقل کر کے صرف ابن سعد ہی کا حوالہ دیا ہے . . . . . .

. . . . جس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ صاحب کنز العمال بلکہ جلال الدین سیوطی نے رطب و یابس روایتوں کی محیط دائرۃ المعارف (انسا ئکلو پیڈیا) جب تیار کرنی چاہی تو ان دونوں بزرگوں کو بھی غالباً ابن سعد کے طبقات کے

سوا کسی ایسی کتاب میں یہ اثر نہ ملا جسے وہ لایق ذکر خیال کرتے بہر حال ابن سعد نے جن الفاظ میں اس روایت کو درج کیا ہے ان کو پڑھ لیجئے جو یہ ہیں۔

عن محمد قال نبئت ان علیا ابطاء عن بیعة ابی بکر فلقیه ابو بکر فقال اکرهت امارتی فقال لا ولکنی آلیت بیمین ان لا ارتدی بردائی الا الی الصلوٰة حتی اجمع القرآن	محمد (ابن سیرین) سے یہ روایت ہے وہ کہتے تھے مجھے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ حضرت علی کی طرف سے جب حضرت ابو بکر کی بیعت میں کچھ تاخیر ہوئی تب حضرت ابو بکر حضرت علی سے ملے اور پوچھا کہ میری امارت (یعنی خلافت) کو کیا ناپسند کیا اس پر حضرت علی نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ نماز کے سوا اپنی چادر (جسے اوڑھ کر باہر نکلتے تھے اسے) نہ اوڑھوں گا جب تک کہ قرآن کو جمع نہ کر لوں۔

اصل روایت تو اسی پر ختم ہو جاتی ہے آگے محمد یعنی ابن سیرین نے آخر میں اتنا اضافہ اور کیا کہ

فزعموا انه کتبه علی تنزیله	لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت علی نے تنزیل بہ
ابن سعد ج ۲ ملتا مطبوعہ یورپ	اس قرآن کو لکھا تھا۔

بس یہ سارا فتنہ قرآن کی نزولی ترتیب کا ابن سیرین کے ان ہی الفاظ "کتبه علی تنزیله" کو بنیاد بہ اٹھایا گیا، میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ بعض روایتوں میں اپنے خود تراشیدہ مطالب بھر کر ان سے لوگوں نے ناجائز نفع اٹھایا ہے ان میں ایک روایت یہ بھی ہے علامہ شہاب محمود آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس روایت کو چنگاری بنا کر فتنے کی آگ جن لوگوں نے پھیلائی

ان میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت ابوحیان توحیدی کی ہے (دیکھئے مقدمہ روح المعانی ص۹ ج۱) یہ ابوحیان توحیدی کون تھا اور زندگی بھر کیا کرتا رہا اس کا قصہ تاریخوں میں پڑھئے[1]

---

[1] ابوحیان توحیدی کے کچھ حالات لسان المیزان میں حافظ ابن حجر نے بھی بیان کئے ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ یہ چوتھی صدی کا آدمی ہے، اس عہد کے دو مشہور وزیر صاحب بن عباد اور ابن العمید کے درباریوں میں تھا۔ علم کو دنیا طلبی کا ذریعہ انہی وزراء کے دربار میں گھس کر بنانا چاہا جیسا کہ اس کا بیان ہے اس میں کامیابی اس کو نہ ہوئی تب اس نے علم سے فتنہ انگیزی کا کام لینا شروع کیا [illegible] قابل تھا اور حریری کے ابوزید سروجی کا پارٹ ادا کیا کرتا تھا اسی لئے بعض لوگوں نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ صوفیوں کا شیخ تھا اور ادیب الفلاسفہ اور فیلسوف الادباء بھی تھا یعنی فلسفیوں کے سامنے ادیب بنتا تھا اور ادیبوں کے سامنے فلسفی اور جیسے ابن الراوندی [illegible] مسلمانوں کے [illegible] کی طرف [illegible] کتابیں لکھا کرتا تھا بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہی پیشہ تنگ آکر اس فیلسوف الادباء اور ادیب الفلاسفہ نے اختیار کر لیا تھا جعلی کتابوں کے بنانے میں کمال تھا لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر کی طرف سے ایک خط اس نے تصنیف کیا اور ظاہر یہ کیا کہ حضرت علی نے ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے جب انکار کیا تو دونوں (ابوبکر و عمر) نے مل کر یہ خط حضرت علی کو لکھا تھا، اس خط میں کہیں تو خوشامد کی باتیں تھیں اور کہیں دھمکیاں حضرت علی کو دی گئی تھیں الغرض اس جعلی خط کو لکھ کر مسلمانوں میں اس نے پھیلا دیا جب فتنہ زیادہ پھیلا تو بعض لوگوں نے اس سے دریافت کیا۔ ایک دن راز کھول دیا کہ شیعوں کے [illegible] بنانا چاہتا تھا [illegible] شیعوں سے زیادہ اس میں سنیوں کے خلاف مواد تھا ایسی باتیں جو ابوبکر و عمر کی طرف منسوب کی گئی تھیں جو کسی معمولی مسلمان کی طرف بھی کاربرآری کے سلسلے میں منسوب نہیں ہو سکتیں اس سلسلے میں ان حضرات کے کارنامے کھلے ہیں اسی بناء پر علماء حق نے اس کے متعلق اس فیصلہ کا اپنی کتابوں میں اعلان کیا کہ یہ بڑا جھوٹا مفتری اور دین سے مفلس، علانیہ بیہودہ بکواس کرنے والا اور حق باتوں سے [illegible] ان کے پھیلانے میں کمال رکھتا تھا۔ حافظ ابن حجر نے ابن مالی کی کتاب الفریدہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔ ابن جوزی نے بھی لکھا ہے کہ "ابوحیان زندیق تھا" اس کی انہی حرکتوں کی وجہ سے [illegible] ابوحیان کو جلا وطن بھی کر دیا تھا اصلی نام علی بن محمد تھا لکھا ہے کہ جب مرنے لگا تو اس کے شاگرد جو بستر علالت کے ارد گرد جمع تھے اور اس کی زندگی کی خصوصیتوں سے واقف تھے گھبرا کر بے پناہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تلقین شروع کی اور توبہ استغفار کے

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سورتوں کی ترتیب کا ذکر اگر اس روایت میں ہے اور روایت کے جو الفاظ ہیں ان میں یقیناً اس کی بھی گنجایش ہے تو اس وقت تو خیر کوئی بات ہی نہیں ہے اب بھی مسلمان بچوں کے پڑھانے کے لئے عم کے پارے کی سورتوں کی ترتیب بدل دیتے ہیں یعنی پہلے والناس پھر الفلق اور آخر میں سورۂ عم یتساءلون ان پاروں میں چھاپی جاتی ہے کسی کو خیال بھی نہیں گذرتا کہ ترتیب سورتوں کی اگر بدل بھی گئی، تو کیا ہوا؟ اور مقصد اگر سورتوں کی آیتوں کی الٹ پھیر کا ہے، غالباً فتنہ پردازوں کی یہی نیت یہی ہے بھی ورنہ سورتوں کی نزولی ترتیب کے مسئلہ کو اتنی اہمیت کیوں دیتے، تو اب دیکھئے روایت کا حال کیا ہے، محمد یعنی ابن سیرین روایت کی ابتدا ہی کرتے ہوئے "نُبِّئت" کا لفظ بولتے ہیں، یعنی مجھے ایسی اطلاع دی گئی ہے لیکن اطلاع دینے والے کا نام نہیں لیتے چلئے روایت مجہول ہو گئی اور اس سے بھی دلچسپ بات تو اس کے بعد ہے یعنی جب نزولی ترتیب کی خبر دینے لگے تو "زعموا" کا لفظ استعمال کیا یعنی لوگ ایسا خیال کرتے ہیں کہ حضرت علی نے قرآن کے اس نسخے کو تنزیل پر لکھا تھا، بجائے خود "زعم" کا لفظ عربی میں روایت کو کمزور کر دینے کے لئے کافی ہے اسی لئے بعض لوگوں نے بزرگوں میں اپنے لڑکوں سے کہا تھا کہ "زعموا" کا یہ لفظ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لئے اس کو ہدایت کرنے لگے، کہتے ہیں کہ ابوحیان نے تب آنکھیں کھولیں اور سر اٹھا کر بولا کہ کیا میں کسی فوجی سپاہی یا پولیس کے جوان کے پاس بیٹھا ہوں پھر کہا کہ "رب غفور" کے دربار میں حاضر ہو رہا ہوں اسی آخری فقرے پر دم نکل گیا خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا؟ دراصل اس کے مزاج میں شوخی اور گستاخی تھی۔ ادب سے محروم تھا صاحب بن عباد اور ابن العمید کے دربار میں جب توقعات رکھتا تھا تو لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ان کی تعریف میں مبالغہ کرتے ہوئے یہ تک اس نے لکھ مارا کہ یہ دونوں اگر نبوت کا دعویٰ کر بیٹھیں تو ان پر بھی وحی نازل ہونے لگے، اور شریعت نئی ہو جائے مسلمانوں کے دینی اختلافات کا خاتمہ ہو جائے متعدد جعلی حدیثوں کے مشہور کرنے میں اس نے خاصی شہرت حاصل کی جن میں حضرت علی والی یہ روایت بھی ہے یعنی قرآن کی نزولی ترتیب کی وجہ سے بیعت سے رکے رہے دیکھو ۳۷؎ لسان المیزان

مجھے بخش دو، یعنی کبھی استعمال نہ کرنا حدیثوں میں بھی آیا ہے کہ جھوٹ کو چلتا کرنے کے لئے "زعموا" کا لفظ بہت اچھی سواری کا کام دیتا ہے جیسے اس زمانے کے اخبار نویس "سمجھا جاتا ہے" "قیاس کیا جاتا ہے" "معتبر حلقوں سے یہ بات پھیلی ہے" دراصل جھوٹ کو آگے بڑھانے کی یہ سواریاں ہیں ماسوا اس کے خیال کرنے والے کون لوگ تھے ان کے نام کا بھی ابن سیرین ذکر نہیں کرتے یہ دوسری جہالت اسی روایت میں ہے حافظ ابن حجر نے اسی لئے انقطاع کا نقص بتاتے ہوئے اس روایت کو سنداً مسترد کر دیا ہے اور مان بھی لیا جائے تو نزولی ترتیب میں سورتوں کی ترتیب اور آیتوں کی ترتیب دونوں کا احتمال ہے، لیکن مدعاء مدعیوں کا جب ہی ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ذریعہ سے یہ ثابت کریں کہ سورتوں کی ترتیب نہیں بلکہ ہر سورہ کی آیتوں کی موجودہ ترتیب کی جگہ نزولی ترتیب حضرت والا نے دی تھی ظاہر ہے کہ اس کے معین کرنے کی قطعاً کوئی صورت نہیں ہے علاوہ اس کے علماء نے لکھا ہے کہ بعض روایتوں سے جو معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ و منسوخ آیتوں کو ایک ہی جگہ مرتب کر کے حضرت علی نے ایک کتاب لکھی تھی اور اسی کی طرف یہ اشارہ ہے تو بقول آلوسی پھر یہ قرآن کا نسخہ ہی کب باقی رہا یہ تو "ناسخ و منسوخ" کی دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب ہوگی۔ اور بھی بیسیوں احتمالات ہیں کہنا یہی ہے کہ لے دے کر اسی ایک ٹوٹی پھوٹی شکستہ و بہ شستہ روایت کو بنیاد بنا کر یقین کی اس قوت کو مضمحل کرنے کی کوشش کرنا جو قرآن کے موجودہ متواتر و متوارث ترتیب کے متعلق انسانی فطرت رکھتی ہے بجز مغالطہ بازی کے اور کیا ہے[1]

---

[1] اتقان میں سیوطی نے جیسا کہ میں نے عرض کیا بعض غیر مشہور کتابوں کا حوالہ دے کر بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے مثلاً ابن الفرس کی کتاب الفضائل کی طرف منسوب کر کے ابن سیرین ہی کی اس روایت کو درج کرتے ہوئے نئی بات کا اضافہ یہ کیا ہے کہ ابن سیرین سے عکرمہ (مولیٰ ابن عباس) نے اس قصہ کا ذکر کیا تھا اس پر ابن سیرین نے عکرمہ سے دریافت کیا کہ حضرت علی کے قرآن جمع کرنے کا مطلب کیا تھا کہ کما اُنزِلَ الاوّل فالاوّل یعنی جو پہلے نازل ہوئی اس کو پہلے پھر اس کے بعد جو نازل ہوئی بالفاظ دیگر ابن سیرین نے سوال کیا کہ علی نے کیا نزولی ترتیب پر (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

ماسوا اس کے سب سے زیادہ دلچسپ مسئلہ یہ ہے کہ نزولی ترتیب کے ڈھونڈنے والوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اگر ابتدائی ترتیب پر ہر ہر سورۃ کی آیتوں کو مرتب کرنے کی کوشش میں اگر کوئی کامیاب بھی ہو جائے جس طرح وہ نازل ہوتی رہی ہیں مگر آیتوں میں اس تاریخی ترتیب کے پیدا کرنے کی سعی لاحاصل کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کو سوچ سکتے ہیں آپ کی توجہ ادھر منعطف کرانا چاہتا ہوں جس کا ذکر شروع مضمون میں بھی اجمالاً کر چکا ہوں یعنی میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنی سورتوں کی حیثیت کسی واحد بسیط کتاب کی نہیں ہے بلکہ ہر ہر سورے کا ایک موضوع اور اس کی غرض و غایت دوسری سورہ کے مقابلہ میں مستقل حیثیت رکھتی ہے علاوہ اس کے کہ تجربہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے میں تو کہتا ہوں کہ سورتوں کے مضامین کی اسی استقلالی حیثیت کے احساس ہی کا نتیجہ عہد صحابہ میں یہ تھا کہ صرف دو سورتیں یعنی سورہ انفال اور سورہ برأت کے مضامین میں تھوڑا بہت وحدت کا رنگ پایا جاتا تھا لیکن پھر بھی دونوں کی حیثیت چونکہ بالکلیہ ایک نہ تھی آپ جانتے ہیں کہ امتیاز کے اسی رنگ کو باقی رکھنے کے لئے کیا گیا؟ یہ تو آپ دیکھتے ہیں کہ ہر سورہ دوسری سورہ سے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے فقرے سے جدا ہوتی ہے لیکن ان دونوں سورتوں کے بیچ میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" نہیں ہے حضرت عثمانؓ سے جب پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ

کانت قصتها شبیهة بقصتها فظننت انها منها — یعنی دونوں کے مضامین ملتے جلتے تھے اس
فقبض رسول اللہ صلی اللہ — لئے میں نے خیال کیا کہ یہ (برأت) بھی اسی میں
علیہ وسلم ولم یبین لنا انها منها — شریک (یعنی انفال ہی میں) داخل ہے استنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جمع کیا تھا؟ اس روایت میں ہے کہ جواب میں عکرمہ نے کہا کہ جن و انس بھی اکٹھے ہو کر چاہیں کہ قرآن کو اس ترتیب پر مرتب کریں تو نہ کر سکیں گے ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ عکرمہ کے عربی الفاظ یہ ہیں لو اجتمعت الانس والجن علی ان یولفوہ ذالک التالیف ما استطاعوا" اسی طرح ابن اشتہ کی کتاب المصاحف سے سیوطی نے نقل کیا ہے کہ ابن سیرین کہا کرتے تھے کہ حضرت والے مرتبہ قرآن کے متعلق مدینہ کے لوگوں کو لکھا اور بہت تلاش کیا لیکن مل نہ سکا خود یہی اس روایت کے جعلی ہونے کی دلیل ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ مرتبہ نسخہ اور کسی کے پاس نہیں تو خاندان اہل بیت میں تو ضرور رہتا اگر واقعی کوئی قرآن انھوں نے لکھا تھا ۱۲۔

فمن اجل ذلك قرنت بينهما ولم اكتب بينهما بسم الله الرحمن الرحيم (ابوداؤد و ترمذی از جمع الفوائد)

میں رسول اللہ کی وفات ہوگئی مگر آپ سے یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ واقعی براءت انفال میں سے ہے اس لئے دونوں کو ہم نے جوڑ تو دیا لیکن "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ان دونوں کے بیچ میں نہ لکھا

آپ دیکھ رہے ہیں سورتوں کے مضامین کے مسئلہ میں صحابہ کے احساس کی اس نزاکت کو، سورتوں کی وحدت اور تعداد کا مدار مضامین کی وحدت و تعداد پر ہے صحابہ کا جو نقطۂ نظر اس باب میں تھا کیا اس کے لئے اس سے زیادہ واضح شہادت کی ضرورت ہے، بہرحال یہ ایک واقعہ ہے کہ دیکھنے میں قرآن کی سورہ کتنی ہی چھوٹی نظر آتی ہو جیسے ہاتھی کے مقابلہ میں چیونٹی خواہ جتنی بھی مختصر معلوم ہوتی ہو لیکن ایک مستقل جسمانی نظام کی وہ مالک ہے یہی حال ہر سورہ کا ہے اور کہا جا سکتا ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ موضوع اور غرض و غایت کے لحاظ سے جیسے جغرافیہ کا علم طب سے اور طب کا تاریخ سے، تاریخ کا کیمسٹری سے الگ حیثیت رکھتا ہے یہی اور بجنسہٖ یہی حال قرآن کی ہر سورہ کا . . . .

. . . . دوسری سورہ کے مقابلہ میں ہے اب ذرا خیال کیجئے کہ نزولی ترتیب پر ہر ہر سورہ کی آیتوں کو مرتب کرنے کے معنی کیا ہونگے مذکورہ بالا مختلف علوم و فنون، مثلاً طب، جغرافیہ، کیمسٹری اکانومی وغیرہ کی کتابیں جن کا مصنف فرض کیجئے کہ ایک ہی شخص ہو اور ان ساری کتابوں کو آگے پیچھے شروع کرکے اس نے خاص مدت میں ختم کیا ہو اب اگر مصنف کی ان تمام قدیم یادداشتوں

لہ مثلاً سورۂ قل ہو اللہ احد، یا الکوثر یا العصر ہی کو لیجئے تین چار آیتوں سے زیادہ ان میں کوئی صورت نہیں ہے لیکن جن حقایق اور معانی سے ان میں ہر ایک لب ریز ہے اور انسانی زندگی کے جن خاص شعبوں کے متعلق حیرت انگیز انکشافات ان سے ہوتے ہیں کسی جاننے والے سے پوچھئے کچھ نہیں تو علامہ فراہی کی تفسیر کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے اسی کا مطالعہ کیا جائے ۱۲ ۔

کے تلاش کرنے میں کوئی کامیاب بھی ہو جائے جنھیں مختلف علوم و فنون کی ان کتابوں کی تالیف و تصنیف
کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً مصنف جمع کرتا رہا اور ان ہی کی مدد سے ہر کتاب کو اس نے مکمل کیا
پھر ان تمام یادداشتوں میں تاریخی ترتیب پیدا کر کے سب کو مرتب کر کے کسی کتاب کی شکل میں
کوئی پیش کرے تو صورت اس کتاب کی کیا ہو جائے گی؟ اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے اگر آپ کو اس
کتاب کی ابتدائی چند سطروں میں تو طب کے کچھ نسخے اور مسائل ملیں اور ان ہی کے بعد کے فقروں
میں جغرافیہ کے معلومات، ان کے بعد کیمسٹری کے نظریات علی ہذا القیاس چوں چوں کا مربہ کوئی واقعہ
ہو یا نہ ہو لیکن یہ کتاب تو یقیناً چوں چوں ہی کا مربہ یا دیوانی ہنڈیا ہو گی۔

بہرحال قرآن کی موجودہ ترتیبی شکل تواتر اور توارث کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے ایک
ایسی قطعی حقیقت کے متعلق نزولی ترتیب والی ایسی روایتوں کی مدد سے ترمیم پر آمادہ ہو جانا جن کی سند
کو حدیثوں کی صحت کے معیار پر پورا اترنا آسان نہیں ہے جنون نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

اتقان میں سیوطی نے طبرانی کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس
کی سند جید ہے، حاصل اس کا یہ ہے کسی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی سے پوچھا کہ
ایسے آدمی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ

یقرء القرآن منکوسا قرآن کو الٹ کر پڑھتا ہے۔

بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کی جو عام ترتیب ہے، بجائے اس ترتیب کے
الٹ کر قرآن کو پڑھتا ہے لکھا ہے کہ جواب میں ابن مسعود نے فرمایا کہ

ذاك منكوس القلب وہ اوندھے دل کا آدمی ہے۔

بتائیے کہ اسی زمانہ میں جب اس قسم کے لوگوں کو منکوس القلب کہا گیا تھا تو اس زمانے میں سورتوں
ہی کی ترتیب میں تصرف و ترمیم ہی کی جرأت کیوں نہ کی جائے ہم اس کو کیا کہیں۔ حالانکہ جیسا

کہ میں نے عرض کیا سورتوں کی ترتیب کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے، خود بخاری ہی میں ہے کہ ایک عراقی ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ ذرا اپنا قرآن مجھے دکھائیے۔ ام المومنین نے فرمایا کہ کس لئے دکھاؤں اس نے کہا کہ آپ کے قرآن کی جو ترتیب ہے یعنی سورتوں کی جو ترتیب ہے اسی ترتیب سے میں بھی اپنے قرآن کی سورتوں کو مرتب کرنا چاہتا ہوں۔ ام المومنین نے اس وقت جواب میں فرمایا کہ

مایضرک ایہ قرأت بخاری ص۱۸۵ج۲ کسی طرح پڑھو تم کو اس سے نقصان نہ پہنچے گا

میں نے پہلے بھی کہیں کہا ہے کہ بچوں کے لئے عم کا پارہ سہولت کے لئے آج بھی اس ترتیب پر نہیں چھپتا جس ترتیب پر قرآن میں یہ سورتیں ہیں اور یہ وہی بات ہے کہ ایک ہی مصنف کی چند کتابوں کو آپ جس ترتیب سے چاہیں جلد بندی کرا سکتے ہیں کتاب کے معانی و مطالب پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا

پس اصل مسئلہ ہر ہر سورہ کی آیتوں کی ترتیب کا ہے اور اس مسئلہ میں جیسا کہ سیوطی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا اول سے آخر تک اس پر اتفاق ہے کہ آیتوں کی ترتیب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جبرئیل علیہ السلام کے حکم سے دی ہوئی ہے اس ترتیب میں کسی قسم کی ترمیم خود قرآن کی ترمیم ہے، سیوطی کے الفاظ یہ ہیں کہ

ترتیب الآیات فی السور بتوقیفہ صلی اللہ علیہ وسلم وامرہ غیر خلاف فی ھذا بین المسلمین (اتقان نوع ۱۸) — ہر ہر سورہ میں آیتوں کی ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے سے اور حکم سے دی گئی ہے اس میں مسلمانوں کے اندر کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اور میری تو سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ ایسی بھی کوئی کتاب کیا کسی مصنف کی ہو سکتی ہے کہ اس کے فقروں کو تو کسی نے بنایا ہو اور ان فقروں کو جوڑ کر عبارت کسی نے بنائی ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے اور میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ عہد صدیقی میں سورتوں کی جلد بندی جس ترتیب سے کرا دی گئی تھی اس کا پابند دوسروں کو نہیں بنایا گیا تھا بلکہ جیسے کسی مصنف کی چند کتابوں کو بندھوانے والے جس ترتیب کے ساتھ جلد بندھوا دیتے ہیں ابتداء میں اسی قسم کی انفرادی آزادی مسلمانوں کو جو تھی اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے بعض صحابیوں کے قرآن کی ترتیب دوسرے صحابی سے مختلف بھی ہوتی تھی مثلاً غیر معیاری روایتوں میں ہے کہ ابن مسعود کے مصحف میں نون کی سورہ الذاریات کے بعد القیامہ کی سورۃ ثم یتساءلون کے بعد النازعات کی سورۃ الطلاق کے بعد اور الفجر کی سورۃ التحریم کے بعد اسی طرح ابی بن کعب کے مصحف میں کہتے ہیں کہ الکہف اور الحجرات کی سورتیں نون کے بعد تبارک حجرات کے بعد النازعات الواقعہ کے بعد الم نشرح قل ہو اللہ کے بعد تھی۔

لیکن عہد عثمانی میں حضرت ابوبکر صدیق کے زمانہ کے مجلد کرائے ہوئے قرآن کی نقلیں حکومت نے مرکزی صوبوں میں تقسیم کرکے یہ حکم مسلمانوں کو بھیج دیا گیا کہ سورتوں کی ترتیب میں بھی اسی کی پابندی کی جائے اور دوسری ترتیب سورتوں کی بھی قانوناً ممنوع قرار دے دی گئی اس وقت سے یہ اختلاف بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

باقی یہ سوال کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد حکومت میں جس ترتیب سے سورتوں کی جلد بندی کرائی گئی تھی آیا یہ صحابہ کی رائے سے فیصلہ کیا گیا تھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ ترتیب سورتوں میں قایم کی گئی، کوئی واضح روایت اس باب میں نہیں ملتی لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ

انما الف القرآن علی ما کانوا یسمعون	یعنی اس وقت قرآنی سورتوں میں ترتیب اسی
من النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتقان ضہ	ترتیب کی پیروی میں دی گئی جس ترتیب سے

صحابہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنتے تھے۔

امام مالک کی اس تاریخی شہادت کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی جبرئیل علیہ السلام کو اس سے پہلے جو رمضان گذرا تھا، دو دفعہ قرآن آپ نے سنایا تھا، یہ روایت بخاری وغیرہ تمام صحاح کی کتابوں میں پائی جاتی ہے اس وقت تک بجز چند آیتوں کے قرآن پورا نازل ہو چکا تھا پس جس ترتیب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کو سنایا تھا کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ سورتوں کی جلد بندی میں اس طرز عمل کی پیروی نہ کی جاتی۔ پس سورتوں کی ترتیب کا مسئلہ بھی اس لحاظ سے جبرئیل امین ہی کا توثیق یافتہ ہے اور خدا کا فضل ہے کہ عہد عثمانی کے اس فرمان کے بعد جس میں عہد صدیقی کے مرتبہ مصحف کی پیروی ہر مسلمان کے لئے لازم کر دی گئی، اس وقت تک مسلمان مشرق و مغرب میں اول سے آخر تک اسی کے پابند ہیں البتہ ضرورتاً جیسے بچوں کی تعلیم وغیرہ کی سہولت کے لئے کبھی اس آزادی سے بھی نفع اٹھالیا جاتا ہے جو اس فرمان کے نفاذ سے پیشتر صحابہ میں پائی جاتی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ گو قرآن کے پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں تجویدی خدمات اور اس کے سمجھنے سمجھانے میں تفسیری کارناموں کے سوا خود لکھنے لکھانے میں بھی قرآن کے مسلمانوں نے جن اولوالعزمیوں کا بھی ثبوت دیا ہو عربی غیر عربی ہر قسم کے مسلمان کے لئے قرآن کا پڑھنا آسان ہو جائے اس کے لئے انھوں نے جو کچھ بھی کیا ہو حروف میں غیر معمولی محاسن پیدا کیے گئے اعراب زبر زیر پیش جزم تشدید وغیرہ جیسی ایجادیں کی گئیں، حتیٰ کہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن کو مسلمانوں نے سونے موتی اور مختلف قسم کے جواہر کے سیال محلول سے بھی بکثرت لکھوایا اور کیا کیا بتاؤں کہ اس تیرہ سو سال کے عرصے میں کیا کچھ نہیں کیا۔[1]

---

[1] حال ہی میں میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ نظام الملک طوسی سلجوقی دربار کے مشہور وزیر کے پاس ہدیہ

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چودہ سال بعد عہد عثمانی میں قرآنی سورتوں کی جس ترتیبی شکل پر اتفاق واجماع قایم ہو گیا، اس کے متعلق یہ خیال کہ اس میں ردوبدل کا کسی حیثیت سے بھی کچھ امکان ہے، خیال تو خیال حقیقت یہ ہے کہ کبھی کسی زمانے میں کسی کو کسی قسم کا خطرہ بھی اس وقت تک نہ ہوا تھا جب تک کہ عیسائی پادریوں نے استشراقی کھال اوڑھ کر اغوائی القاءا ور وسوسہ اندازیوں کی مہم شروع نہ کی تھی لیکن یابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکفرون -

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں ایک عالم جن کا نام عبدالسلام ابو یوسف تھا، قرآن مجید لکھ کر پیش کیا تھا جس میں یہ صنعت رکھی گئی کہ تین رنگ تو انھوں نے جواہرات کو محلول اور سیال کرکے حاصل کیا اور ایک سیال محلول سونے کا تیار کیا۔ قرآن لکھ کر جب پورا ہو گیا تو سرخ رنگ سے اختلاف قرأۃ کو ان آیتوں کے نیچے ظاہر کیا تھا، جن کی قرأت میں قراء کا اختلاف ہے اسی طرح قرآن کے ایسے الفاظ جن کے معانی عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہیں ان کے معانی کو سبز رنگ والے جوہری محلول سے لکھا تھا اسی طرح نیلم کے سیال محلول سے انھوں نے پورے قرآن پر زیر وزبر پیش جزم تشدید مد وغیرہ لگایا تھا اور ایسی تمام آیتیں جن سے عہد وپیمان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہو یا جن سے باہمی خط وکتابت تبریک وتہنیت یا تقرب وتسلی وغیرہ میں کام لیا جا سکتا ہو، اسی طرح جن جن آیتوں میں جنت کی بشارت یا جہنم کی دھمکی دی گئی ہے اس قسم کے تمام مقامات پر سونے کے سیال محلول سے پورے قرآن میں نشانات لگائے تھے دیکھئے الکتانی کی کتاب التراتیب الادارۃ ج ۲ صفحہ ۱۱۲ مطبوعہ مراکش اس سلسلہ میں مسلمانوں کے غیر معمولی کارناموں کی کوئی چاہے تو ایک ضخیم تاریخ مرتب کر سکتا ہے ۱۲ -

تصحیح

(قدرتی نظام اجتماع) کی قسط دوم ماہ ستمبر ۴۹ء صفحہ ۱۵۶ وصفحہ ۱۵۷ کے حاشیہ کو صحیح کرکے یوں پڑھئے۔

صفحہ ۱۵۶ حاشیہ سے "بخاری" کے بجائے فتح القدیر لابن الہمام جلد اول صفحہ ۱۲۹ ہونا چاہئے -

حاشیہ سے مشکوٰۃ باب الجماعۃ عن البخاری کے بجائے البحر المختار جلد اول صفحہ ۷ پڑھنا چاہئے۔

صفحہ ۱۵۷ سے بخاری باب حد المریض ان یشہد الجماعۃ پڑھنا چاہئے -

مضمون کی تیسری قسط کا نومبر میں انتظار فرمائیے

امیر الامراء نواب نجیب الدولہ ثابت جنگ
اور
جنگ پانی پت

(از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی)

پہلے ہی سے دکن کے مسلمانوں اور مرہٹوں کو اپنی جانب مائل کر رکھا تھا اس قضیہ نے طول کھینچا محمد شاہ کے عہد میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ نظام الملک جب اپنی مضبوطی کرکے مالوہ سے دکن کی طرف راہی ہوا اور مرہٹوں کے جرگہ کو بھی اپنے ساتھ ملالیا۔ سیدوں نے سید دلاور علیخاں کو جو مالوہ کی سرحد پر فوج لئے پڑا تھا۔ نظام الملک کے تعاقب کا حکم دیا جب مقابلہ ہوا دلاور علیخاں نے نظام الملک کے مقابلہ میں منہ کی کھائی۔ سیدوں کو شکست کی اطلاع ملی تو سیدوں نے عالم علی خاں کی سرکردگی میں اورنگ آباد میں فوج پڑی ہوئی تھی کو لکھا نظام الملک کو آگے نہ بڑھنے دیا جائے وہ مقابل ہوا اور مارا گیا۔ اب سیدوں کے ہوش کے طوطے اڑ گئے۔ تو محمد شاہ بادشاہ کو ہمراہ لے کر سید حسن علی خاں نظام الملک کی سرکوبی کے لئے دکن روانہ ہوئے مگر راستہ میں ہی ہلاک ہوگئے۔ بادشاہ دلی لوٹے ۱۱۳۲ھ میں نظام الملک بھی دکن سے دلی آئے اور وزارت کے عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ یہاں محمد شاہی دربار میں نظام الملک کو عالمگیری دربار کی شان کہاں نظر آسکتی تھی اور محمد شاہی دربار کے خفیف الحرکات امراکہاں اس سنجیدہ امیر کی موجودگی کو پسند کرنے لگے نظام الملک اپنی دکن کی آزاد حکومت کو غنیمت سمجھ کر دکن چلا گیا اور نادر شاہ کے حملہ

کے وقت پھر دہلی آگیا۔ نادر شاہ سے محمد شاہ کی صلح کرانے کا باعث ہوا نادر کچھ رقم تاوان لے کر
واپس جارہا تھا کہ برہان الملک نے اسے دہلی جانے کی ترغیب دی بیان کیا جاتا ہے کہ اس غصے
کے باعث کہ صلح میں اس کی عزت افزائی نہیں ہوئی دہلی پہنچ کر نادر نے قتل عام کا حکم دے دیا
آخر آصف جاہ تلوار گلے میں ڈال کر نادر کے پاس پہنچا۔ اور شہر کی حالت اس شعر میں بیان کی

کسے نماند کہ اورا بہ تیغ ناز کشی — مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

نادر نے فی الفور قتل عام بند کر دیا اور آصف جاہ سے کہا کہ

بہ ریش سفیدت بخشیدم

نادر کے جانے کے بعد آصف جاہ دکن چلا گیا وہاں پہنچکر اپنے ابھارے ہوئے مرہٹوں کی آویزش
میں الجھ گیا بدقت تمام احمد نگر پران کو شکست دی جس سے انھوں نے صلح کر لی۔ اسی زمانہ میں
آصف جاہ کے دوسرے بیٹے ناصر جنگ نے جو دکن کا نائب تھا بغاوت کا علم بلند کر دیا مگر باپ نے
مقابلہ میں شکست دی اور قندھار (نزد ناندیڑ دولت آصفیہ) کے قلعہ میں قید کر دیا اس کے بعد
کرناٹک پر فوج کشی کر دی یہاں جا بجا نواب بن بیٹھے تھے ۱۷۴۲ء میں وہاں کا گورنر صفدر علی خاں
اپنے ایک نسبتی بھائی مرتضے خاں کے ہاتھوں مارا گیا اور بدنظمی اور بڑھ گئی ۱۷۴۳ء میں آصف جاہ
نے کرناٹک کی نوابیوں کو فوج کشی کر کے ختم کیا اور علاقہ تصرف میں لایا۔ انورالدین خاں بہادر
شہامت جنگ گوپاموی کو کرناٹک یا پائین گھاٹ کا ناظم مقرر کیا اور بالا گھاٹ کی گورنری اپنے نواسے
ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ کو دی اس کے بعد آصف جاہ کی توجہ اندرونی نظم و نسق کی درستی
پر مبذول رہی۔

انتقال | ۱۷۴۸ء میں خبر ملی کہ احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کر دیا آصف جاہ مصلحت کے لحاظ
سے برہان پور آگیا لیکن چند روز بعد ابدالی کی شکست کی خبر مل گئی وزیر سلطنت قمر الدین خاں مارا گیا

احمد شاہ بادشاہ بنا تو اس نے آصف جاہ کو منصب وزارت قبول کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ لیکن آصف جاہ نے بڑھاپے کی وجہ سے اس خدمت سے معذوری ظاہر کی برہان پور ہی میں بیمار ہوا وہیں ۱۹ر جون ۱۷۴۸ء کو ۷۷ برس کی عمر میں انتقال کیا سید برہان الدین کے روضہ میں دفن کیا گیا اسلامی حکمرانی کے دور کا یہ آخری عظیم المرتبت انسان تھا۔

اولاد | آصف جاہ کی شادی گلبرگہ کے ایک سید کی صاحبزادی سیدۃ النساء بیگم سے ہوئی جس کے بطن سے غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی، ناصر جنگ۔ بادشاہ بیگم۔ محسنہ بیگم دوسری بیگموں سے امیر الملک صلابت جنگ، نظام علی خاں بہادر اسد جنگ (آصف جاہ ثانی) محمد شریف بسالت جنگ شجاع الملک مغل علی خاں۔ نواب معین الملک عرف میر منو کو جو نواب قمر الدین خاں وزیر محمد شاہ کا ۱۷۴۸ء میں پنجاب کا صوبہ دار محمد شاہ نے کیا۔ پہلا حملہ احمد شاہ درانی کا شجاعت و مردانگی سے روکا ۱۷۵۲ء میں درانی کا حملہ ہوا رسد رسانی کی تکلیف سے تنگ ہو کر شالا مار باغ میں صلح کی شرائط طے کیں اور پچاس لاکھ نقد اور کچھ ہاتھی گھوڑے مع ساز و سامان دے کر سوا لاکھ کا خلعت لیا اور جالندر، لاہور اور کوہستان کی سند حکومت حاصل کی اس زمانہ میں سکھوں کی غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا رعایائے پنجاب ناخدا ترسوں کے ہاتھوں سخت نالاں تھی۔ میر منو ان کی گوشمالی اور سرزنش کے لئے قصور کی جانب روانہ ہوا اور ان کو وہ سزا دی کہ لاہور اور پنجاب کی تاریخیں ان خونی اوراق سے بھری پڑی ہیں وہ فتح یابی کے بعد ایک دن شکار کو جا رہا تھا کہ گھوڑے سے گر پڑا ہو گئی اور اس طرح تڑپ کر نواب کی جان گئی یہ واقعہ ۱۷۵۳ء کا ہے۔

مراد بیگم | مراد بیگم جس کو بعض مورخین نے مغلانی بیگم بھی لکھا ہے میر منو کی چہیتی بیگم تھی بڑی لایق اور ہوشمند خاتون تھی شوہر کے صوبیداری کے عہد میں مشیر کار تھی اس کے انتقال پر آغوش میں امین الدین خاں تین سال کا خورد سال بچہ میر منو کی یادگار تھا حکومت پنجاب کا والی قرار دے کر خود سرپرست بنی

چھ ماہ بعد وہ لڑکا چیچک سے انتقال کر گیا۔

مراد بیگم کے لئے بڑی مشکل تھی نہ وہ حکومت چھوڑ سکتی تھی اور نہ اسے اپنے حکمراں رہنے کی کوئی صورت نظر آتی تھی۔ نواب قمر الدین خاں وزیر کی بیٹی تھی محلوں کی پلی ہوئی ان چالوں سے واقف جنسے بادشاہ تخت پر بٹھائے جاتے اور اُتارے جاتے۔ لکھی پڑھی تھی اس نے اپنے شوہر کے امراء و رفقاء کو اپنی رفاقت میں کیا اور ایک طرف احمد شاہ درانی کو دوسرا بادشاہ دہلی احمد شاہ تیموری کے درباروں میں خفیہ طور پر اپنے وکیل اور ایلچی بھیجکر ضابطہ کی سند حکومت منگوائی اس کے بعد ہاتھ پیر نکالنے لگی امراء کے اختیار جو بڑھے ہوئے تھے محدود کرنے لگی اس پر بیگم کے خلاف وسیع پیمانہ پر ایک سازش کیگئی جس میں یہ قرار پایا کہ بیگم کو تخت لاہور سے اتار کر اپنے گروہ میں سے کسی کو حاکم بنالیں بیگم نے احمد شاہ درانی کو تمام احوال لکھ بھیجے اس نے ایک نامی امیر سردار جہاں کو کچھ فوج دے کر بیگم کی نیابت میں کام کرنے کے لئے لاہور روانہ کیا امراء میں دربار کا امیر اعظم نواب میر بھکاری خاں رستم جنگ مدار المہام دبانی مسجد طلائی لاہور سے بیگم بہت خائف رہتی ایک دن اس کو محلات میں بلوا کر جہان خاں کے روبرو لونڈیوں کے ہاتھ اسی سوٹی لوادی اس واقعہ سے امرا رخانہ نشیں ہوگئے سکھوں کو میدان خالی ملا پھر پر پرزے نکالنے لگے۔ علاقوں کے علاقے لوٹ لیتے زمینداروں سے محاصلہ تک زبردستی وصول کر لیتے جہان خاں بہت کچھ انتظام کرتا مگر اس کی تدابیر کام نہ دیتیں ملک کی بد انتظامی سکھوں کی لوٹ مار کے متعلق امرائے خانہ نشین نے عریضہ بادشاہ دہلی کو بھیجا غازی الدین خاں اپنے وزیر کو جو نظام اول دکن کا پوتا تھا سپاہ دیکر بادشاہ نے بھیجا بعض مورخ کہتے ہیں خود غازی الدین خاں لاہور کی طرف متوجہ ہوا وہ ابھی جالندھر کے علاقہ میں تھا اس نے مراد بیگم کو جو اس کی پھوپی ہوتی تھی یہ پیغام دیا کہ اپنی لڑکی کی شادی میرے ساتھ کردو مراد بیگم کی دلی منشا یہ تھی اس بہانہ سے وزیر مجھ سے گٹھ جائے اور پنجاب کی حکومت

قبضہ میں رہے۔ چنانچہ لشکر اور سامان کے ساتھ لاہور سے روانہ ہوگئی ماچھی واڑہ میں غازی الدین خاں
مقیم تھا اس جگہ دھوم دھام سے شادی اپنی دختر کی کردی دو ماہ تک وزیر دلہن کے ساتھ عیش
وعشرت میں مصروف رہا اور پھر دہلی واپس چلا گیا اور اپنا ایک معتبر افسر سید جمیل الدین کو بیگم کی
نیابت میں چھوڑ گیا۔ بیگم اور امرائے دربار کی حالت دیکھ جہان خاں لاہور چھوڑ کر کابل چلا گیا تھوڑے
عرصہ بعد جمیل الدین اور بیگم میں ٹھن گئی جس کی اطلاع احمد شاہ کو دی گئی اس کا چوتھا حملہ لاہور پر
اسی بیگم کی دعوت کا نتیجہ تھا دہلی میں جب بیگم کی اس سازش کا حال معلوم ہوا تو غازی الدین خاں نے
مرزا آدینہ بیگ حاکم جالندھر کو لکھا کسی ترکیب سے بیگم کو گرفتار کرکے دہلی بھجوادو چنانچہ بیگم
خواجہ سراؤں کے ہاتھوں دھوکے سے گرفتار ہوگئی اور دہلی بھیجدی گئی اس خدمت کے صلے میں غازی الدین
نے لاہور کا صوبہ دار آدینہ بیگ کو کردیا۔

احمد شاہ ابدالی نے پھر ۱۷۵۶ء میں لاہور پر قبضہ کیا آدینہ بیگ بھاگ کر یہاں سے دہلی روانہ
ہوا غازی الدین نے اپنی پھوپی اور ساس کے ذریعہ بادشاہ درانی سے قصور معاف کرایا اس حملہ
میں احمد شاہ درانی نے دہلی کو ۲ ماہ تک لوٹا۔ اس کے بعد کے حالات مراد بیگم کے نہ مل سکے

راجہ اجیت سنگھ | راجہ اجیت سنگھ ابن راجہ جسونت سنگھ جودھپوری جسونت سنگھ نے عالمگیر کے ساتھ
جبکہ وہ شجاع سے مقابل ہونے والا تھا دغا کی تھی مگر قصور معاف کردیا جب بہادر شاہ کو اعظم شاہ
سے فرصت ملی تو دکن کام بخش سے نبٹنے چلا سفر میں اجیت سنگھ ساتھ تھا راستے سے جودھپور
چلتا ہوا اور حرکات ناشائستہ کرنے لگا راجہ جے سنگھ سوائی جے پور کو بھی ہمنوا کرلیا آخرش بادشاہ
نے عظیم الشان کے ذریعہ سرکوبی کی اور پھر بعض شرائط پر صلح ہوگئی خود بہادر شاہ سرہند کی طرف
دکن سے لوٹتے ہوئے گیا سکھوں نے وزیر خاں چکلہ دار کو قتل کردیا تھا گورو گوبند کی طاقت روبہ
ترقی تھی اس کے انسداد کا کافی انتظام کیا۔

فرخ سیر کے عہد میں سید حسن علی نے اجیت سنگھ کی گوشمالی اچھی طرح سے کر دی۔ سید سنگھ نے اپنی راج کنواری کا ڈولہ فرخ سیر کے نذر کیا۔ بادشاہ نے اجمیر کا صوبہ دار کر دیا۔ سیدوں سے میل کر کے داماد کا کام تمام کرایا۔ کچھ عرصہ تک تمرد کرتے رہے محمد شاہ فرخ سیر کی وجہ سے بہت خیال کرتا تھا اپنے لڑکے کی بیوی پر نظر بد ڈالنے لگے جس بنا پر بیٹے نے باپ کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔

قطب الملک | راجہ رتن چند سید عبد اللہ خاں کا کارندہ تھا تمام کاروبار کا اہتمام اس کے سپرد تھا سید صاحب کو وزارت ملی تو عیش و عشرت میں لگ گئے رتن چند ڈوبے نذر گذرانتا ان کی کثرت سے حریص تھیں رتن چند راشی پڑا تھا اس کی بدولت سید عبد اللہ خاں بدنام ہو گئے فرخ سیر کی معزولی اور قتل کا محرک اول رتن چند تھا سید حسن علی کے مارے جانے کے بعد رتن چند کو قید کر دیا۔

راجہ محکم سنگھ امیر الامراء حسن علی خاں کا دیوان تھا اپنے آقا کے مارے جانے کے بعد اس کے قاتلوں کے ہمدم و دمساز بن گئے اور ششش ہزاری منصب پایا۔

صفدر جنگ مرزا مقیم ابو المنصور خاں جن کے بزرگ کسرے کا کام کرتے تھے سعادت خاں کے بھانجے اور داماد تھے صوبہ داری اودھ اور دلی کی وزارت ملی مگر پٹھانوں کے اقتدار سے دل میں خلش رکھتے تھے بادشاہ کو نواب فرخ آباد سے ناراض کرا کر ان کے خلاف جنگ کرا دی فرخ آباد پر تسلط کر کے اپنے دیوان راجہ نول رائے کو وہاں کا حاکم مقرر کیا کچھ دن بعد بنگشوں نے بلوہ کر کے نول رائے کو قتل کر دیا تو کسی شخص نے

"اے نول سرخ رو"

سے تاریخ نکالی۔

روان کرد خون یلاں جو بہ جو	ادا کرد حق نمک مو بہ مو
زنیزداں رسید تدحور ملک	بیار دیر دانے نول سرخ رو

راجہ کے مارے جانے کے بعد صفدر جنگ نے مرہٹوں کو اپنی کمک کے واسطے بلایا پٹھانوں نے کمایوں کے کوہستان میں پناہ لی اور آخرکار صلح کرکے اطاعت قبول کی شاہ درانی سے سرہند پر شاہی فوج کا مقابلہ ہوا قمرالدین خاں وزیر قتل ہوا صفدر جنگ کی کوشش سے ابدالی کو واپس جانا پڑا اس صلہ میں الہ آباد کی صوبہ داری عنایت ہوئی پھر بھی بادشاہ کے ساتھ غداری کی ۱۷۵۴ء میں انتقال ہوا

اس کا بیٹا شجاع الدولہ تھا جو ظالمانہ طبیعت کا شخص اور ظلم وجور میں حجاج ابن یوسف سے کم نہ تھا۔ پانی پت کی لڑائی کے بعد انگریزوں سے جنگ آزمائی کی انگریزوں نے یہ دیکھ کر کہ میر قاسم صوبہ دار بنگال ان کے قبضہ سے نکلنا چاہتا ہے اس کو گدی سے اُتار دیا اور اس نے شجاع الدولہ کے پاس پناہ لی اور حمایت پر آمادہ کیا۔ شجاع نے بہار پر حملہ کیا اور انگریزوں کو ہٹاتے ہوئے پٹنہ تک پہنچ گئے لیکن پٹنہ کے محاصرہ میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی اور برسات کی وجہ سے بکسر کی طرف ہٹ آنا پڑا۔ ۲۳ر اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کی لڑائی ہوئی پھر کمپنی سے صلح ہوگئی اب انگریز ساتھی ہوگئے مرہٹوں نے روہیلوں پر حملہ کیا چالیس لاکھ پر تصفیہ شجاع الدولہ کے ذریعہ ہوا۔ وعدہ وفا نہ کرسکے تو شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے ان پر چڑھائی کردی حافظ رحمت خاں ہولناتے پر اس جنگ میں شہید ہوئے یہ واقعہ ۱۷۷۴ء کا ہے حافظ صاحب کے خاندان کے ساتھ سخت مظالم کیے آخرش ۱۷۷۵ء میں دنبل کے مرض میں انتقال کیا۔

مرہٹے | نظام شاہوں اور عادل شاہی ریاستوں نے مرہٹوں کو نوازا۔ شاہ طاہر نے اپنے مفاد کے لئے مرہٹوں سے فوجی کام لیا ابراہیم عادل شاہ بھی دیکھا دیکھی ان کے سرپرست بنے حتے کہ فوج کا افسر تک مرہٹہ سردار کو بنایا جس سے اس قوم کو سربلندی نصیب ہوئی مگر لطف یہ ہے پہلے ان محسنوں ہی پر ہاتھ صاف کیا گیا ۹۹۹ھ میں بالا راؤجی اور سبنھاجی مرہٹہ سرداروں نے جو قطب شاہی سلطنت میں فوجی سردار وجاگیردار تھے علم بغاوت بلند کیا ابھی طاقت ور نہیں ہوئے تھے

حکومت نے سرکوبی کردی مگر شغل ڈاکہ زنی لوٹ مار قایم رکھتے رہے ملک عنبر نے بھی اس قوم سے کام لینا چاہا اور ان کی سرپرستی کی مگر ۱۰۲۴ھ میں جہانگیر نے عبدالرحیم خانخاناں کو دکن کی مہم پر مامور کیا۔ اس کا لڑکا ایرج خاں بالاپور برار میں مقیم تھا ملک عنبر کی مرہٹہ فوج کے سردار جادو رائے اودرائے بالو رائے ملک عنبر سے کٹ کر ایرج خاں سے آملے۔ خلعت و منصب پاتے کچھ دن نہ گذرے تھے ان سے بھی غداری کرکے اودے رائے شہزادہ خرم کے قدموں پر آجھکا یہاں بھی منصب جلیلہ عطا ہوا۔ اب دربار شاہی میں باریاب بنے۔ ساہو جی (پدر سیواجی مہاراج) کو درباری عزت ملی مگر اس نے فتنہ اٹھایا تھا کہ خرم نے مزاج پرسی کرادی اور اس کا علاقہ غداری کرنے کی بناء پر ملک عنبر کے بیٹے کو دیا گیا۔

ساہو جی ہاتھ پیر مارتے رہے مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اس قضیہ میں پیمانہ عمر لبریز ہوگیا اس کا بیٹا سیواجی مرہٹوں کا سردار بنا اور چاروں طرف لوٹ مار کا بازار گرم کردیا مسلم ریاستیں باہمی خانہ جنگیوں میں مبتلا تھیں جس نے مرہٹہ سردار سیواجی کو ہاتھ پیر لگانے کا موقعہ بہت زیادہ دیا اورنگ زیب عالمگیر نے اس کی بہادری کی قدر کی مگر یہ اپنی بیجا غارتگری کی حرکتوں سے باز نہ آیا بادشاہ نے شاہانہ و شجاعانہ ایسے حملے کئے جس سے سیواجی کی طاقت پاش پاش ہوکے رہ گئی فرخ سیر کے عہد میں امیرالامراء سید حسن علی خاں صوبہ دار دکن ہوکر گئے تھے انھوں نے اپنے مفاد کی خاطر تباہ شدہ مرہٹوں کی سرپرستی کی محرم ۱۱۳۱ھ کو اورنگ آباد سے بعزم دہلی پچیس ہزار سوار دس ہزار برق انداز اور عظیم الشان توپ خانہ کھانڈے راؤ دہباڑیہ کی سرداری میں لے کر چلے راجہ ساہو کی طرف سے بشوناتھ سنتاجی امداد کے لئے تھا یہ فوج دہلی پہنچی فیروز شاہ کی لاٹ کے نیچے خیمہ زن ہوئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ سید صاحب کی بدولت مرہٹہ فوج بادشاہ کے خلاف دارالحکومت میں آئی عوام بگڑ بیٹھے سید حسن علی کی فوج کو ڈنڈے بازی سے نوازا ہزار ہا مرہٹے

بے آئی مرے آخر ش حسن علی نے ان کو کچھ دے دلا کر دکن واپس کیا اور راجہ ساہو کے لئے وہ ہزاری
منصب و خلعت بادشاہ سے جو ان کے ہاتھوں کٹ پتلی بنا ہوا تھا دلوا دیا دکن کی چوتھ اور عطائی
پر مرہٹے بھی فائز نظر آنے لگے۔ بالاجی بشوناتھ نے راجہ ساہو کے کاروبار کو
ایسی ترقی دی کہ کولھاپور کی ریاست ماند پڑگئی اور مرتے ہوئے اپنے خاندان میں پیشوائی جڑ جما گیا
اس کے بعد اس کا بیٹا باجی راؤ پیشوا بنا جس نے نظام الملک سے ۱۱۴۲ھ میں مجیبھٹہ لیکر فتحیاب
ہوا اور نظام نے دب کر صلح کر لی اس فتح سے باجی راؤ کی تمام دکن میں دھاک بیٹھ گئی اور یہی
وہ عظیم الشان پہلی فتح تھی جس سے میدانی لڑائی میں مرہٹوں کے دل سے بالکل خوف جاتا رہا۔
باجی راؤ اور نظام الملک گٹھ گئے اور اُس نے اپنے وفادار نوکروں میں سے ملہار راؤ
اور رانا جی سیندھیا کو مرہٹوں کی زبردست جمعیتوں کے ساتھ خاندیس اور مالوہ کی طرف لوٹ مار
کرنے اور وہاں سے چوتھ وصول کرنے کے لیے بھیجا اور خود فوج گراں کے ساتھ راجپوتانہ اور اجمیر
کی طرف متوجہ ہوا۔ مالوہ کے حصے پر مرہٹے قابض ہوگئے بادشاہ نے غضنفر جنگ محمد خاں بنگش بانی
فرخ آباد کو مالوہ کی صوبہ داری پر مامور کیا مگر اس کے تغافل سے پیشوا باجی راؤ نے فائدہ اٹھانا چاہا
مگر روہیلہ پل پڑے مرہٹے ناکام ہوئے محمد خاں معزول ہوا راجہ جے سنگھ والی جے پور مالوہ کا
صوبہ دار کر دیا گیا مگر راجہ نے باجی راؤ کو بادشاہ سے مالوہ کی صوبہ داری دلوا دی اس طرح
گجرات کے بعد مالوہ میں بھی مرہٹے پھیل گئے جن کی تکوتاز کا میدان گوالیار اکبر آباد و الہ آباد تھا
غرضکہ ۱۱۴۳ھ ۱۱۴۹ھ کے آخر تک مرہٹے پنجاب، دہلی، روہیلکھنڈ، اودھ، بہار و بنگال
کے سوا تمام ہندوستان میں پھیل گئے۔
۱۱۴۹ھ میں ملہار راؤ ہلکر اور باجی راؤ تغلق آباد تک آئے اور ریواڑی کو لوٹ کر واپس
گئے شاہ نادر کی آمد سے یہ سیلاب کچھ عرصہ کے لئے رک گیا۔

روہیلہ | غور اور غزنی کے پٹھانوں نے جب کوہستان روہ میں سکونت اختیار کی تو وہاں کے باشندوں کو روہیلہ کہنے لگے۔

روہ ایک بہت وسیع پہاڑی سلسلہ ہے جس کے مشرق میں کشمیر مغرب میں دریائے ہلمین جوہرات سے متصل ہے اور شمال میں کوہ کاشغر اور جنوب میں بلوچستان ہے کوہ سلمان۔ قندھار۔ کابل۔ پشاور۔ خیبر باجوڑ اور حسن ابدال وغیرہ سب علاقے روہ میں شامل تھے یہاں کے لوگ شیر شاہ سوری کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور بریلی۔ آنولہ۔ فرخ آباد وغیرہ میں آباد ہوئے تو یہ علاقہ ان روہیلوں کی جمعیت کی وجہ سے روہیلکھنڈ مستقل طور سے کہلانے لگے پھر تو افغانستان سے غول کے غول ہندوستان آئے اور روہیلکھنڈ میں آباد ہوئے ان پٹھانوں کی دو جماعتیں ہوگئیں روہیلوں کا خاندان کھیٹر پر جو اب روہیلکھنڈ کے نام سے مشہور ہے قابض ہوگیا اور بنگش کے پٹھان اضلاع فرخ آباد پر قابض ہوگئے بنگشوں کے مورث اعلیٰ نواب محمد خاں ۱۷۱۴ء میں فرخ سیر کے عہد سلطنت میں بھوج پور اور شمس آباد کے جاگیردار مقرر ہوئے لیکن عہد سلطنت کے آخری ایام میں شہنشاہ دہلی کو مجبوراً نواب محمد خاں کے واسطے خودمختاری کا فرمان دینا پڑا نواب موصوف نے فرخ سیر کے نام پر فرخ آباد کو آباد کر کے اس کو اپنی قیام گاہ قرار دیا ۱۷۱۹ء میں فرخ سیر کے انتقال کے بعد نواب محمد خاں نے بدایوں پر بھی قبضہ کر لیا اس زمانہ میں نواب سید علی محمد خاں متبنیٰ داؤد خاں سردار روہیلہ کا غلبہ اور فتوحات علاقہ کھیٹر میں ہونا شروع ہوگئیں کھیٹر کے حدود جو موجودہ روہیلکھنڈ کے حدود تھے۔ بریلی۔ مرادآباد۔ سنبھل۔ بدایوں کے اضلاع علاقہ کھیٹر میں شامل تھے۔ ۱۷۱۵ء میں فرخ سیر کے عہد میں شیخ عظمت اللہ مرادآباد کے حاکم مقرر ہو کر آئے انھوں نے داؤد خاں اور انکے متبنیٰ نواب سید علی محمد خاں سے تعلقات رکھے یہی دونوں اولوالعزم روہیلوں کی حکومت کے بانی ہوئے۔

داؤد خاں | داؤد خاں جنہوں نے نواب سید علی محمد خاں کو متبنیٰ کیا تھا خود ہی شاہ عالم خاں بن شہاب الدین خاں کے متبنیٰ تھے۔ شہاب الدین خاں قندھار کے علاقہ کے رہنے والے تھے شاہ عالم خاں شاہجہاں کے عہد میں کھیڑ آئے اور یہیں اقامت پذیر ہوگئے۔

افغان اس علاقہ میں پہلے ہی سے رہتے تھے بعض تجارت کرتے اور بعض حکام ضلع اور جاگیرداروں کی ملازمت کرتے تھے لیکن ان کو یہ علاقہ کچھ مفید اور موافق نہ ہوا شاہ عالم خاں کے چونکہ مدت تک کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی تھی اس لئے انھوں نے ایک لڑکے کو جس کا نام داؤد خاں تھا متبنیٰ کر لیا۔ ان کے متبنیٰ کرنے کے بعد شاہ عالم خاں کے کئی لڑکے پیدا ہوئے مگر سوائے رحمت خاں (حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہادر) کے سب صغر سنی ہی میں مر گئے داؤد خاں کی پرورش شاہ عالم خاں نے کی اپنی ذہانت اور خداداد قابلیت کی بدولت داؤد خاں شاہ عالم خاں کے جملہ کاروبار میں دخیل ہوگئے شاہ عالم خاں ان سے نہایت شفقت سے پیش آتے اور پدرانہ برتاؤ کرتے۔ یہ برتاؤ شاہ عالم خاں کی بیوی کو ناگوار ہوا ادھر یہ خیال گذر رہا تھا موروثی جائداد کا مالک آگے چل کر داؤد خاں ہوگا چنانچہ انھوں نے قتل کرانے کی تدبیر کی داؤد خاں کو سازش کا پتہ لگ گیا انھوں نے شاہ عالم خاں کو اس واقعہ کی خبر نہیں کی بلکہ خود وہاں رہنا خطرناک سمجھا اور شاہ عالم خاں سے نوکری کرنے کے بہانہ سے ہندوستان آنے کی اجازت لی۔

داؤد خاں محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے یہاں اتفاق سے کچھ روہیلوں سے ملاقات ہوئی وہ اس کے ساتھ ہوگئے داؤد خاں نے علاقہ کھیڑ میں کوہ الموڑہ کے دامن میں سکونت اختیار کی اور اردگرد ہاتھ صاف کرنے لگے رفتہ رفتہ اسی سوار اور تین سو پیادے اس کے پاس جمع ہوگئے جنگل میں کچی گڑھی اپنے رہنے کے لئے بنالی علاقہ بھر میں ان کی شجاعت اور بہادری کی تھوڑے عرصے میں دھوم مچ گئی کچھ عرصہ تک مدار اسہائے اور لچھمن سنگھ زمینداروں کے یہاں

ملازم رہے اور اس کی زمینداری کو وسیع کرنے میں قریب دیوار کے علاقہ پر قبضہ جما یا دوسرے جاگیرداروں نے ان سے استدعا کر کے اپنے پاس بلا لیا۔ مستعدی سے اپنے فرائض انجام دئے صلہ میں کثیر رقم ملی اور کئی موضع قبضہ میں آئے ضلع بدایوں کے اکثر دیہات دبائے تبیابوبی میں سکونت اختیار کی داؤدخاں کی اس کامیابی کی خبر سن کر شاہ عالم خاں بھی اپنے وطن تورشہامت (روہ) سے یہاں آئے۔ داؤدخاں نے ان کی بہت تعظیم و تکریم کی اور واپسی کے وقت ان کو دو ہزار روپیہ دئے اور یہ رقم سالانہ دینے کا وعدہ کیا دوبارہ شاہ عالم آتے اور وطن جاتے ہوئے قزاقوں سے مڈبھیڑ ہوگئی اور شاہ عالم خاں شہید ہو گئے داؤدخاں کو خبر لگی اس نے آکر ان کو بیرون شہر بدایوں دفن کیا حافظ رحمت خاں نے اپنے عہد میں مقبرہ تعمیر کرایا جو اب تک موجود ہے اس کے بعد داؤدخاں نواب عظمت اللہ خاں کے پاس جو مرادآباد اور سنبھل کے حاکم تھے چلے گئے ان ہی کے ذریعہ بہت سا علاقہ شاہی الگذاری میں داؤدخاں کو مل گیا۔

مرہٹوں کی لڑائی میں داؤدخاں نے کارنمایاں کئے جن کے صلے میں شاہ دہلی کے یہاں سے موضع شاہی ضلع بریلی اور بدایوں میں سالی پرگنہ جاگیر میں عطا ہوا۔ اب رئیسانہ زندگی بسر رنے لگے۔ مگر طبیعت میں اولوالعزمی تھی راجہ دیبی چند والی کمایوں کے یہاں ملازم ہوگئے وہاں ن سے ایک ناگوار واقعہ سرزد ہوا اس نے دھوکے سے قید کر لیا اور قتل کرا دیا راجہ کے ملازموں نے لاش کو ساتول ندی کے کنارے دفن کر دیا۔ اس وقت داؤدخاں کے حقیقی بیٹے محمد خاں بت کم سن تھے۔ اس لئے دوندے خاں۔ صدرجان۔ پایندہ خاں۔ سردار خاں۔ کبیر خاں (خاں وغیرہ نے جو داؤدخاں کے مشیر کار تھے (نواب) سید علی محمد خاں کو جانشین بنایا انھوں نے ب دم سے روہیلوں پر حکومت شروع کر دی جن کی تعداد اس وقت پانچ صد تھی سید محمد خاں نوابان رام پور کے مورث اعلیٰ ہیں۔ جنکا تفصیلی حال آگے آتا ہے۔

نواب نجیب الدولہ بہادر

نام و نسب | نجیب خاں مخاطب بہ نواب نجیب الدولہ ثابت جنگ ابن سردار اصالت خاں ابن ملک عنایت خاں ابن منیر خاں ابن جہان خاں ابن نظیر خاں ابن اسمعیل خاں عمر خیل مانیری قبیلہ عمر خیل باعتبار بزرگی و شرافت و ناموری افاغنہ میں امتیازی درجہ رکھتا تھا۔ جو کالا۔ درا حلوائی۔ مان ری علاقہ ررہ میں آباد تھا۔

خاندانی حالات | اصالت خاں اپنے قبیلہ کا سردار تھا ان کے بھائی سردار بشارت خاں تجارت اسپ کا مشغلہ قرار دیے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ بسلسلہ تجارت آخر زمانہ فرخ سیر شاہ دہلی میں ہندوستان آئے اور اپنے ہموطن روہیلوں جنہوں نے کھٹیر پر اپنی حکومت قائم کرلی تھی کے پاس مقیم ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ایک جماعت روہیلہ کی معاونت حاصل کرکے بلاس پور (تحصیل رام پور ہے) پر قبضہ جمایا اور خوش حال رئیس بن کر رہنے سہنے لگے اور اپنے نام سے موضع بشارت نگر آباد کیا۔

مگر بشارت خاں وطن آتے جاتے رہتے تھے۔

پیدائش | نجیب خاں سنہ ۱۱۱۹ھ میں پیدا ہوئے[1]

تربیت | ماں باپ کے زیر سایہ تربیت ہوئی۔ اصالت خاں کو لکھنے پڑھنے سے لگاؤ نہ تھا صرف سپاہی بننا فخر سمجھتے تھے چنانچہ نجیب خاں کو بھی فنون حرب سے واقف اور شہسواری میں طاق کرایا گیا اور اپنے آبائی پیشہ میں لگا دیا مگر نجیب خاں میں قدرتی سرداری کی خو بو تھی اپنے ہم عمر افغانوں میں مار دھاڑ کرکے اپنا مطیع کرلیا کرتے قرب و جوار میں ان کی جرأت و بہادری کی شہرت تھی ملکہ ایک وقت وہ آگیا تمام علاقہ ان کے نام سے کانپتا تھا۔ بشارت خاں عرصہ بعد وطن آئے

[1] نجیب التواریخ صہ

نجیب خاں کی آمد | اپنے ہونہار بھتیجے کے حالات سن کر بہت خوش ہوئے اور بھائی سے اجازت لے کر اپنے ساتھ ۱۱۵۵ھ میں ہندوستان لے آئے بشارت خاں کی ایک دختر نواب سید علی محمد خاں بہادر کو منسوب تھی چنانچہ تاریخ خورشید جہاں میں ہے۔

"بشارت خاں عم نجیب الدولہ یک دختر نواب علی محمد خاں بہادر را بہ نکاح دادہ بود"[1]

دوسری دختر کو نجیب خاں سے منسوب کیا جن سے نواب ضابطہ خاں پیدا ہوئے۔ نواب علی محمد خاں نے اپنی دختر کا جو بنت بشارت خاں کے بطن سے تھی نواب ضابطہ خاں سے نکاح کم عمری میں کر دیا تھا۔

"نکاح دختر نواب علی محمد خاں کہ نام آں معصومہ بیگم و از بطن دختر بشارت خاں بود با نواب ضابطہ خاں بہادر خلف نجیب الدولہ کردہ شد کہ غلام قادر از بطن اوست"[2]

سوانح زندگی | غرضکہ نجیب خاں اور نواب علی محمد خاں ہم زلف تھے چنانچہ نواب نے اپنے پاس ان کو آنولہ بلا لیا اور کچھ سواروں کی سرداری پر فائز کیا۔

---

[1] تاریخ خورشید جہاں صفحہ ۱۸۸ [2] ایضاً

(باقی آئندہ)

ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل

(۵)

(از جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف دہلے)

میں اس میں سے چند اشعار جو صاحبزادے کے سانحۂ ارتحال سے تعلق رکھتے ہیں نقل کرتا ہوں:۔

ہڑتال کے عروج کا قصہ بیاں ہو گیا	جس نے عطا کیا ہے غم جاوداں ہمیں
نورِ نگاہ لخت جگر شیر خوار پور	کرنا پڑا زمین کے نیچے نہاں ہمیں
اک بوند بھی دوا کی نہ جس کو ہوئی نصیب	ہڑتال کے یہ ذاتی ہوئے امتحاں ہمیں
مخلوق کی صعوبتیں جو گوش زد ہوئیں	بے عدد بے شمار ہوئیں لاتعد ہوئیں[1]

یہ رولٹ ایکٹ مورخہ ۱۸ر مارچ ۱۹۱۹ء کو مجلس مقننہ میں پاس ہوا تھا۔ اور اس کے بعد ہندوستان بھر میں گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف زبردست بلوے ہوئے۔ سائل صاحب کے بچے فرید میاں کا انتقال اپریل ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ اس وقت سائل صاحب جناب فرخ نادری کی صاحبزادی کی تقریب نکاح میں شرکت کی غرض سے نارے میں تشریف فرما تھے۔

۱۹۱۹ء کے سیاسی واقعات کتاب روشن مستقبل میں ملاحظہ فرمائیے۔

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی جلد اول صفحہ ۱۰۳۲

نواب صاحب کی سکونت | نواب صاحب کا اصل آبائی مسکن گلی قاسم جان میں تھا جو نواب ضیاء الدین احمد خاں کا پھاٹک کہلاتا ہے جب ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد سے دہلی واپس آئے تو محلہ فراش خانے میں کرایہ کا مکان لے کر قیام کیا پھر ۱۹۱۰ء میں لال دروازہ کے اندر آخر میں محلسرا ہے یہ نواب صاحب کی والدہ کی طرف سے حصہ میں آئی تھی۔ اس میں منتقل ہو گئے۔

لال دروازہ کی وجہ تسمیہ سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتی کہ اس پر ہر جگہ سرخ رنگ ہے۔ یہ دروازہ شاہی زمانے کا ہے اور اصل میں مرزا مغل بیگ خاں کی حویلی دروازہ تھا[1]۔

۱۹۳۴ء میں یہ مکان فروخت کیا گیا۔ کیونکہ اس میں نواب صاحب کے بھتیجے مرزا ناصر الدین کا بھی حصہ تھا۔ فروخت کر کے تقسیم کیا گیا۔ اور نواب صاحب نے اپنے رہنے کے لئے فراشخانہ میں حکیم عبد الرشید خاں کا مکان کرائے پر لیا لال دروازہ ہی میں پھاٹک سے ذرا آگے بڑھ کر دائیں ہاتھ کو ایک کٹرہ نواب صاحب کی ملکیت تھا اس کو خالی کرا کر مکان بنانا شروع کیا۔ یہ مکان ۱۹۳۶ء میں بن کر تیار ہو گیا اور نواب صاحب فراشخانے سے اپنے نو تعمیر مکان میں منتقل ہو گئے اور اسی مکان میں انتقال ہوا افسوس کہ ۱۹۴۷ء میں یہ مکان صاحبزادے نے حاجی نور احمد مالک ہمدرم دواخانہ کے ہاتھ فروخت کر کے دہلی کو خیر باد کہا اور اپنی سسرال لاہور چلے گئے۔ اواخر ۱۹۴۷ء میں بیگم صاحب بھی دہلی سے رخصت ہو گئیں۔

نواب صاحب کی پبلک لائف | نواب صاحب مرحوم چونکہ ایک والئ ریاست خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے مقامی حکام سے تعلق رکھنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ان کی خاندانی وفاداریوں اور اعزازات کی وجہ سے حکام بھی ان کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے اس کے علاوہ ان کی ذاتی

---

[1] واقعات دار الحکومت دہلی ص ۱۹۷ ج دوم

قابلیت اور علم وفضل اور مجد و شرف بھی ہر شخص کو ان کی عزت و احترام پر مجبور کرتا تھا۔
دہلی کے زعماء و مشاہیر جن سے نواب صاحب کے دوستانہ مراسم تھے جہاں تک مجھے معلوم ہے مندرجۂ ذیل تھے۔ پیرجی مظفر علی مرحوم سجادہ نشین خواجہ باقی باللہ (یہ نواب صاحب کے خالہ زاد بھائی تھے) ڈپٹی عبدالحامد خاں مرحوم خان بہادر حکیم امجد علی خاں مرحوم آنریری مجسٹریٹ ڈپٹی سید ہادی حسین مرحوم۔ نواب فیض احمد خاں مرحوم۔ حکیم اجمل خاں مرحوم۔ قاری سرفراز حسین عزمی مرحوم۔ حافظ عبدالرحمٰن مدح خواں مرحوم۔
ہندوستان کے دیگر مشاہیر میں سے مندرجۂ ذیل حضرات سے بھی سائل صاحب مرحوم کے خاص مراسم تھے رائے صاحب بجرنگ سنگھ ریاست بھدری ضلع پرتاپ گڑھ رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو الہ آباد۔ پنڈت دیوان رادھے ناتھ کول گلشن۔ سرشاہ محمد سلیمان مرحوم چیف جسٹس فیڈرل کورٹ۔ جناب صفی لکھنوی۔ جناب بیباک شاہجہانپوری نواب عزیز یار جنگ عزیز حیدرآباد۔ پنڈت ترلوکی ناتھ زار دہلوی۔ جناب نوح ناروی
حکیم اجمل خاں | حکیم اجمل خاں خاندان شریفی کے آفتاب تھے جن پر اس خاندان کی قدیم روایات اور تہذیب و معاشرت کا خاتمہ ہو گیا۔ حکیم صاحب کی ذات گرامی مکارم اخلاق اور علم وفضل مجد و شرافت کا مجموعہ تھی ان کے دولت خانے پر بالعموم رات کو بعد عشاء مجلس احباب ہوتی تھی۔ اکثر بڑی دلچسپ علمی و ادبی صحبتیں رہتی تھیں اور شہر کے علماء و ادباء جمع ہو جاتے تھے حکیم صاحب متبحر عالم تھے عربی و فارسی ادب پر بھی پورا عبور تھا۔ متانت کا یہ عالم تھا کہ کبھی قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا گیا۔ باوجود اس کے بذلہ سنج بھی تھے اور نہایت لطیف مذاق کرتے تھے طبیعت میں سلامت روی تھی۔ نواب سر امیر الدین احمد خاں مرحوم والی ریاست لوہارو جو حضرت سائل کے حقیقی بہنوئی تھے ان کے خاص دوستوں میں سے تھے حکیم صاحب ان کو بھائی صاحب

کہا کرتے تھے۔ نیز مولانا ابوالکلام آزاد علامہ مفتی کفایت اللہ وغیرہم سے بھی عقیدتمندانہ خلوص رکھتے تھے۔

نواب شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ اور نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ دونوں بھائی حکیمؒ صاحب کی مجلسوں میں ان کے دولت خانے پر بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ اور اکثر سفروں میں ساتھ رہتے تھے ایک مرتبہ حیدرآباد کے سفر میں بھی ساتھ تھے اور وہاں بھی دلچسپ ادبی مشغلہ رہتا تھا

حیدرآباد سے واپسی کے بعد حکیم صاحب ۱۹۱۲ء میں سخت بیمار ہوئے قدرے افاقہ ہوجانے کے بعد تبدیل آب وہوا کی غرض سے ادکھلے میں قیام تجویز ہوا۔ دوران قیام میں نواب شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ اور نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ اور میر باقر علی داستان گو اور حافظ احمد خاں استاذ شطرنج وغیرہ احباب و مصاحبین کا زیادہ وقت ادکھلے ہی میں گذرتا تھا۔ یہ کبھی علیحدہ علیحدہ آتے تھے اور کبھی سب جمع ہوجاتے تھے۔ اجتماعی صحبت بہت پرلطف ہوتی تھی۔ سائل صاحب جیسے قادرالکلام اور مشہور زمانہ شخص کا یہ حال تھا کہ اس صحبت میں پہنچکر دنیا ومافیہا کو بھول جاتے تھے۔ تاباںؔ صاحب و سائلؔ صاحب دونوں بھائی طویل القامت بھاری بھرکم اور نہایت خوبصورت بزرگ تھے۔ سائلؔ صاحب اپنے بھائی کا بیحد احترام کرتے تھے اور اپنے باپ کی جگہ سمجھتے تھے۔ تاباںؔ صاحب داغؔ صاحب کے کلام کو بازاری کلام کہتے تھے اور ان کے کلام کی تعریف سے بہت چڑھ جاتے تھے۔ حکیم صاحب گاہے گاہے اپنی مجلس میں یہ لطیف مذاق اس طرح کیا کرتے تھے کہ کسی دوسرے شخص کو اشارہ کردیتے تھے جو مجلس میں اس وقت تک داغؔ کے کلام کی تعریف کرتا جب تک تاباںؔ صاحب مشتعل نہ ہوجاتے بالعموم آداب مجلس کا لحاظ رکھتے تھے مگر

زیادہ مشتعل ہو جانے کی صورت میں پھر کسی کا احترام ملحوظ نہ رکھتے تھے۔ جو منھ میں آتا برملا کہتے تھے
جس وقت یہ جنگ تاباںؔ اور سائلؔ دونوں بوڑھے بھائیوں میں واقع ہوتی تھی تو طاقت بشری کا کام نہ تھا کہ ہنسی کو ضبط کر سکے۔ ایک روز او کھلے میں دونوں بھائی موجود تھے دیگر اراکین محفل بھی جمع ہو گئے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر تک مجلس مشاعرہ گرم رہی۔ احباب کی جانب سے ان کے بہترین طرز ادا اور معنوی نزاکتوں پر داد سخنوری دی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں حکیم صاحب نے جناب سائلؔ کو اشارہ کیا۔ وہ دو زانو ہو بیٹھے اور داغ کا کچھ کلام پڑھ کر مافوق العادۃ الفاظ میں تعریف کرنی شروع کر دی۔ اس پر تاباںؔ صاحب کا پارہ چڑھنا شروع ہوا۔ پھر سائل صاحب نے تاباں صاحب کی طرف رُخ کر کے عرض کیا کہ بھائی صاحب شعر کہنا کوئی خالہ کا گھر نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جناب داغ نازک خیالی اور جذبات آفرینی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے اور قادر الکلام بھی ایسے تھے کہ ایک گھنٹہ میں پچاس شعر بلا تکلف قلم برداشتہ لکھ جاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں آج کل کی شاعری بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہے بھلا تاباں میں اتنی تاب کہاں تھی غیظ و غضب کے ساتھ کہنے لگے ابے اس کو اور تجھ کو شعر کہنے اور سمجھنے کی لیاقت ہی کیا ہے کیا قلم برداشتہ لکھنا ہی معیار سخندانی ہے اگر یہی ہے تو مصرع کہو! جناب سائل نے ادب کے ساتھ مصرع دیا جس کو سنتے ہی ادنیٰ تامل کے ساتھ تاباں صاحب نے یہ شعر پڑھا:۔

عدو میرا نہ تو میرا نہ چرخ فتنہ جو میرا شفق بن کر چڑھا ہے چرخ کے سر پر لہو میرا

شعر سنتے ہی مجلس پھڑک اُٹھی۔ حکیم صاحب کھڑے ہو گئے اور تاباں صاحب کو گلے لگا لیا سائل صاحب شرمندہ تھے اور تاباں صاحب کا یہ حال تھا کہ فرط غضب سے آنکھیں سُرخ تھیں۔ منھ سے کف جاری تھا۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ پنکھا جھلا گیا پانی کے چھینٹے

دیئے گئے۔ جب ذرا حواس بجا ہوئے اور زبان قابو میں آئی تو سائل صاحب کو بے تحاشا گالیاں
دینی شروع کیں۔ سائل صاحب ہاتھ باندھ کر سر جھکائے ہوئے سب کچھ سنتے رہے۔ آخر
جب سانس پھول گیا اور تھک گئے تو فرمانے لگے کہ اس سے زیادہ گالیاں دینے کی مجھ میں
طاقت نہیں لہذا چوٹی کی ایک گالی اور دیتا ہوں کہ شہاب الدین کے نطفے سے تو نہیں یا میں نہیں۔
اسی طرح سائل صاحب کو ایک طبی سوال پہلے سے سمجھا دیا گیا تھا تاکہ وہ تاباں صاحب
کی موجودگی میں وہ سوال مجلس میں پیش کریں غرضکہ نواب سائل نے دوسرے وقت تاباں
صاحب کی موجودگی میں . . . . حکیم صاحب کی طرف متوجہ ہو کر با ادب
عرض کیا کہ بھائی صاحب میں کئی روز سے ایک طبی مسئلے میں سخت متردد ہوں جس کو اگر آپ
نے صحیح تسلیم کر لیا تو نہ صرف میری زندگی کا ایک اصول بدل جائیگا بلکہ دنیا پر ایک جدید حقیقت
کا انکشاف ہوگا۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنے زمانہ ہوش سے آج تک اپنے بھائی کو باپ کی جگہ سمجھتا
ہوں اور بیحد احترام کرتا ہوں۔ مگر آج کے بعد بھائی صاحب کو اسی طرح میرا احترام کرنا ہوگا
وہ مسئلہ یہ ہے کہ توام بچوں میں سے جو بعد میں پیدا ہوا وہ بڑا ہے کیونکہ استقرار تو اسی کا پہلے
ہوا تھا۔ دوسرا اپنے مؤخر استقرار کی وجہ سے اس کی پیدائش میں حائل ہوا۔ حضرت تاباں سے
اس کا جواب نہ بن پڑا۔ برس پڑے۔ گالیاں دینے لگے حاضرین مجلس اور حکیم صاحب منہ پھیر
پھیر کر ہنستے تھے۔ اور پھر سائل صاحب کے چست فقرے مزید ستم ڈھا رہے تھے کہ بھائی جان یقیناً!
اب تو آپ کو گالیاں دینے کا حق نہیں۔ اب تو آپ کو میرا احترام کرنا چاہئے کافی دیر تک دلچسپ
گرما گرمی رہی۔ آخر میں حکیم صاحب نے استاد تاباں کے حق میں فیصلہ دیا۔ اور سائل صاحب کو
شکست ہوئی۔[1]

---

[1] حیات اجمل مؤلفہ شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں

حکیم اجمل خاں کا انتقال ۲۸ دسمبر ۱۹۲۷ء م ۱۳۴۶ھ میں بمقام رامپور ہوا۔ اور جنازہ دہلی لاکر درگاہ سید حسن رسول نما میں دفن کیا گیا۔

مؤلف حیات اجمل نے لکھا ہے کہ تاباں اور سائل دونوں توأم بھائی تھے اور اسی پر مؤخر الذکر واقعہ کی بنیاد ہے حالانکہ تاباں کی تاریخ پیدائش ۱۲۷۵ھ ہے اور ان کے بعد ان کے بھائی مرزا بہاء الدین طالب کی پیدائش ۱۲۷۹ھ کی ہے اور ان دونوں سے چھوٹے سائل صاحب ہیں جن کی تاریخ پیدائش ۱۲۸۰ھ کی ہے ان میں سے جوڑواں کوئی بھی نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ حکیم صاحب کی محفل میں کچھ اسی قسم کا مذاق ہوا ہوگا جس کو مؤلف حیات اجمل نے واقعہ نفس الامر خیال کیا۔

نیز مؤلف حیات اجمل لکھتے ہیں کہ حکیم صاحب نے تاباں صاحب سے کچھ اردو کلام میں اور زیادہ تر فارسی کلام میں اصلاح لی ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ غالباً اس بناء پر غلط فہمی ہوئی کہ حکیم صاحب ان کو استاد کہتے تھے۔ حکیم صاحب ہی نہیں بلکہ ان کو تمام ہم عصر لفظ "استاد" سے خطاب کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ تاباں صاحب نہایت معزز اور قابل فخر خاندان کے فرد تھے اور ایک ایسے اولوالعزم دادا کے پوتے تھے جس کا علم و فضل تمام ہندوستان میں مسلم تھا۔ اور خود بھی علوم مشرقیہ میں درک رکھتے تھے۔ ان تمام امور کے علاوہ نہایت مغلوب الغضب تھے جو شخص ان کو استاد نہ مانے اس سے ناراض ہوتے تھے اور جو ان کا کلام نہ سنے اس کو برا بھلا کہتے تھے اور جو ان کے کلام کی داد نہ دے اس کو جاہل کہتے تھے لوگ ان کی عادات سے واقف تھے اور خاندانی وقار کا بھی پاس تھا اس لئے اکثر لوگ ان کو استاد کہتے تھے

جناب سید اشتیاق حسین صاحب شوق نبیسۂ استاد ظہیر دہلوی حکیم اجمل خاں مرحوم کے مطب میں برسوں رہے ہیں اور سائل صاحب کے دولت خانہ پر ہی قیام رہتا ہے وہ

فرماتے ہیں کہ حکیم صاحب کی مہارت اور قابلیت تمام اصناف فنون میں تاباں صاحب سے بدرجہا زائد تھی تاباں صاحب سے ان کا اصلاح لینا صحیح نہیں ہے۔

یادِ اجمل

از حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی یکے از تلامذۂ حضرت سائلؔ دہلوی

زمین ہند پر برپا قیامت خیز طوفاں ہے
لبوں پہ نالۂ شیون دلوں میں سوز ہجراں ہے

اسیر درد کی قسمت یہ ناکامی بھی خنداں ہے
یہ صورت دیکھ کر دیدہ سیہ بختوں کا گریاں ہے

صدائے درد و غم بگرفتہ مشرق را و مغرب را
کہ ما وائے نماندہ مجد و فضل و حکمت و طب را

مسیح الملک جو سدرہ نشین عزم و ہمت تھا
سحابِ فیض کوہِ استقامت بحرِ حکمت تھا

وہ اجمل جو فروغ افزائے بزم دین و ملت تھا
مسلّم رہبرِ اعظم مسلمانوں کی قسمت تھا

نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں اس نوا سنجِ صداقت کو
ترستا ہے دل بیتاب اب عیش و مسرت کو

وہ اجمل آہ جو زینت وہ ایوان امکاں تھا
شرافت کے سما کے آسماں کا مہر تاباں تھا

وہ جس کے فیض سے دہلی کا خطہ اک خیاباں تھا
جدا ہم سے ہوا فردوس دہلی کا جو رضواں تھا

پیاپے آ رہی ہے یہ صدا شہر خموشاں سے
جو قابل ناز کے تھی لٹ گئی رونق گلستاں سے

وہ اجمل آہ جو کل تک رئیس بزم خلّاں تھا
چراغ زندگانی آہ کل جس کا فروزاں تھا

ہوا وہ آج رخصت جس پہ سارا ہند نازاں تھا
ہمارا ہم نوا، غمخوار، دردِ دل کا درماں تھا

نقابِ خاک میں پنہاں فلک نے کر دیا اس کو
وطن سے دور جا کر موت کا ساغر دیا اس کو

جو کل تک جلوہ آرا تھا سریرِ علم و عرفاں پر — کرم کی ضو فشانی کر رہا تھا چرخِ احساں پر
برابر کار فرما تھا ہمارے جسم اور جاں پر — ترنم ریزیاں جو کر رہا تھا بزمِ امکاں پر
فلک کے جورِ بیجا نے کیا نذرِ فنا اس کو
چھپایا زیرِ خاک اس کو کیا ہم سے جدا اس کو

صدائیں گونجتی ہیں پی کہاں کی کوہساروں میں — ترانے درد کے گاتی ہے بلبل مرغزاروں میں
چلی جاتی ہے زاری اشکباری آبشاروں میں — سراپا حزن ہے اف زیر و بم بربط کے تاروں میں
نظر جس پر اٹھائی اس کو غم میں مبتلا پایا
زباں پر نام جب آیا تو غم ہی کا مزا پایا

کہاں ہو آہ اے اجمل نگاہیں تم کو جویا ہیں — تمہاری یاد میں مضطر تمہارے نام لیوا ہیں
در و دیوار سے آثارِ ویرانی ہویدا ہیں — تسلی دو ہمیں آ کر کہ ہم ماتم سراپا ہیں
سراسر خون شدہ ارماں ز چشمِ خوں فشاں ریزد
بیادت خوش بگریم خوں ز ہر اشکم فغاں ریزد

دعا ہے اب کہ جولانگاہ اجمل خلدِ اعلیٰ ہو — دعا ہے اب کہ اجمل نغمہ سنج شاخِ طوبیٰ ہو
بروزِ حشر زیرِ سایۂ عرشِ معلیٰ ہو — شہنشاہِ عرب کا قرب شاملِ لطفِ مولیٰ ہو
گہرہائے سرشکم می فشانم بر مزارِ تو
بدارائے دو عالم می سپارم جملہ کارِ تو

عام اخلاق و عادات | نواب صاحب مرحوم کی ذات گرامی اسلامی تہذیب و اخلاق کی حامل تھی چھوٹوں کے ساتھ محبت و شفقت ہم عصروں کے ساتھ اخوت و مودت علماء و صلحا کے ساتھ اخلاص و عقیدت ان کی خصوصیات تھیں۔

ہندستان کے مشہور دار العلوم مدرسہ امینیہ دہلی کے جلسوں اور تقریبات میں نواب مرحوم ضرور شریک ہوا کرتے تھے۔ اور اکثر نظمیں بھی پڑھا کرتے تھے۔ مدرسہ امینیہ کی بنا حضرت مولانا امین الدین صاحب (المتوفی ۱۳۳۶ھ) نے ۱۳۱۵ھ میں رکھی تھی ان کے ساتھ نواب صاحب کو انتہائی محبت و عقیدت تھی۔ مولانا مرحوم کے انتقال کے بعد مدرسہ امینیہ کا اہتمام راقم الحروف کے والد ماجد حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مدظلہم العالی کے سپرد ہوا۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ کے ساتھ نواب صاحب مرحوم کو جو عقیدت تھی۔ اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب کو باوجود آنکھیں جاتے رہنے کے پہچان لیتے تھے ایک مرتبہ میں نے دریافت کیا کہ حضرت مفتی صاحب کو آپ کس طرح پہچان لیتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ بات بتانے کی نہیں ہے۔ میں نے اصرار کیا فرمایا کہ میں مفتی صاحب کا عاشق ہوں۔ ظاہری آنکھوں سے نہیں دل کی آنکھوں سے پہچانتا ہوں میری روح ان کے سامنے جھک جاتی ہے۔

کتب خانہ رحیمیہ کے سامنے رکشا کھڑی ہے۔ نواب صاحب رکشا میں تشریف رکھتے ہیں اور سگریٹ سے شوق فرما رہے ہیں معلوم ہوا کہ حضرت مفتی صاحب تشریف لا رہے ہیں سگریٹ فوراً رکشا کے پیچھے پھینک دیا جاتا ہے معمول کے مطابق مزاج پرسی وغیرہ کے بعد مفتی صاحب تشریف لے جاتے ہیں۔ جو شخص موجود ہوتا ہے اس سے نواب صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ مفتی صاحب نے دیکھا تو نہیں ؟

راقم الحروف سے بے انتہا محبت فرماتے تھے اور اکثر شام کو کتب خانہ رحیمیہ پر تشریف لاتے تھے۔ اور ۱۹۳۶ء سے جب سے کولھے اور ٹانگیں بالکل بیکار ہو گئی تھیں اٹھنے بیٹھنے سے معذور ہو گئے تھے۔ روزانہ شام کو رکھشا میں تشریف لاتے تھے۔ یہ وضعداری اس پابندی کے ساتھ آخر وقت تک جاری رہی کہ آندھی اور مینہ کے باوجود ناغہ نہ کرتے تھے رکھشا کے ساتھ ایک کرسی رہتی تھی جس میں دونوں طرف دستے لگے ہوئے تھے۔ رکھشا سے کرسی پر کھسک آتے تھے کرسی کو دو آدمی اٹھا کر دکان کے تختے کے قریب لگا دیتے تھے اسی طرح کھسک کر تختے پر بیٹھ جاتے تھے اور اکثر رکھشا میں بھی بیٹھے رہتے تھے۔ بعض ملاقاتی اور شاگرد وغیرہ بھی آجاتے تھے۔ کبھی ادبی مشغلہ کبھی اصلاح و تنقید اور کبھی مختلف موضوعوں پر گفتگو رہتی تھی۔

راقم الحروف کو اپنا مرشد زادہ فرمایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ میری زندگی کے یہی دو گھنٹے ہیں جن میں میں اپنے آپ کو زندہ تصور کرتا ہوں۔ میں عرض کرتا کہ یہی دو گھنٹے میری بھی سعادت و خوش نصیبی کے ہیں ایک روز جبکہ کتب خانے کے سامنے رکھشا میں تشریف رکھتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب تشریف لائے مزاج پرسی کی۔ نواب صاحب آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب جی رہا ہوں اور راقم الحروف کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اگر یہ نہ ہوتا تو میں کبھی کا مر چکا ہوتا اس بچے کے پاس دو گھڑی کے لئے آجاتا ہوں اور اسی وقت میں اپنے آپ کو زندہ سمجھتا ہوں۔

اس مدت میں ان کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ کبھی کسی کی غیبت کرتے نہیں دیکھا۔ فحش اور گالی کا تو وہم بھی نہ تھا۔ حالانکہ بعض آدبا گالی کو بھی ایک ادبی خدمت سمجھتے ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کے منہ پر گالیاں دیں مگر انھوں نے کبھی جواب نہ دیا۔

مرحوم کے بھتیجوں میں سے ایک ہونہار شاعر مرزا جمیل الدین عالی (بن نواب سراج الدین احمد خاں)

بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے مرحوم کے سامنے کہا کہ فلاں شخص آپ کی شان میں گستاخی کرتا ہے ۔ فرمایا کہ بیٹا! جب تم میری گود میں بیٹھ کر میری ڈاڑھی نوچتے تھے اور میں کبھی تم پر ناراض نہیں ہوا تو میں ان لوگوں کو کیا کہوں جو میری عیب چینی کرتے ہیں ۔

نہایت وسیع الظرف فراخ دل اور سیر چشم تھے ۔ انداز گفتگو شیریں اور دلچسپ ہوتا تھا ۔ اسلامی تہذیب اور وضعداری کے دلدادہ تھے ۔ اور ایسے رئیس سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے جو باوجود دولت مندی کے اسلامی شعائر کا پابند ہو ۔

غالباً ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے کہ سی پی کے ایک نوجوان والیٔ ریاست نواب عبدالوحید خاں غازی آف گوردھا دہلی آئے تھے ۔ میں نے ان کو اور استاد مرحوم کو اپنے غریب خانے پر زحمت دی تھی بڑی دلچسپ محفل رہی استاد مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے نوجوان رئیسوں میں اس شخص جیسا متدین اور متشرع رئیس نہیں دیکھا فرمایا کرتے تھے کہ ایسے لوگوں سے بھی میرا رابطہ رہا ہے جنھوں نے شراب کے حوض میں غوطے لگائے ہیں مگر میں نے ایک قطرہ شراب نہیں پی ۔ حضرت نوح ناروی فرماتے ہیں کہ قیام حیدرآباد کے زمانے میں صرف دو شخص ایسے تھے جن کا کیرکٹر ریاستی تعیش کی فضا سے یکسر محفوظ رہا ۔ ایک سائل دہلوی دوسرے احسن مارہروی ۔

(باقی آیندہ)

ادبیات

نعتِ رسول

(از جناب بسمل شاہجہانپوری)

امید شفاعت کیا کہنا تسکینِ دل وجاں کیا کہنا
اے شافعِ محشر فخرِ بشر امت کے نگہباں کیا کہنا

اے ماہِ عرب اے مہرِ عجم اے نیّرِ تاباں کیا کہنا
ہر پردۂ ظلمت چاک ہوا اے مشعلِ یزداں کیا کہنا

انوارِ نبوت سے ابتک دن رات میں اک تابانی ہے
اے مہرِ درخشاں کیا کہنا اے شمعِ شبستاں کیا کہنا

آئینِ حکومت پر جس کے دنیا کے سلاطیں جھکتے ہیں
اس شان کا پیغمبر بھیجا اے رحمتِ یزداں کیا کہنا

اے شمسِ ضحیٰ اے بدرِ دجیٰ اے نورِ دوعالم صلّ علیٰ
اے جلوۂ حق اے شمعِ حرم اے کوکبِ عرفاں کیا کہنا

ہر حرف سراجِ راہِ ہدیٰ ہر لفظ بیاضِ رمزِ خدا
تحریرِ مشیت کے حامل اے صاحبِ قرآں کیا کہنا

کیا نعت سنائی صلّ علیٰ صلوٰۃ اللہ صلوٰۃ اللہ
اے بسملِ احمد کیا کہنا اے مردِ مسلماں کیا کہنا

"اپنے حضورؐ کے نام"

پیکرِ اسلام ——— قرآنِ مجسّم السّلام
السلام اے رہنمائے روحِ آدم السّلام

جب زمیں ظلمات میں ملفوف تھی محصور تھی
ظلمتوں سے پار ہو سکتا نہ تھا سورج کا نور

زندگی جب زندگی کی عظمتوں سے دور تھی
آدمی پر جب ہنسا کرتے تھے حیوان وطیور

لشکرِ طاغوت کے جشنِ ظفر کے درمیاں — دیکھ کر سڑتی ہوئی انسانیت کی سخت لاش
جب فضاؤں سے گذرتے تھے ملایک نوحہ خواں — اپنے سینہ میں لئے اندوہ سے دل پاش پاش

لے کے آتے تھے بدی کی شب میں شوقِ صبح خیر — نیّر تاباں حسیں تاروں کے جھرمٹ، ماہتاب
اور حسین انسانیت کی صبحِ نو دیکھے بغیر — روز چھپ جاتے تھے اپنے وقت پر حسرت مآب

وقت چلتا ہی رہا تکتا ہوئے سوئے فلک — شیطنت کے ہاتھ سے روحوں کا خوں ہوتا رہا
کھا گئے عقلِ بشر نفس و جبلت بے جھجک — رات دن باطل کا اندھیارا فزوں ہوتا رہا

سجدہ کرتے کرتے سنگ و خشت کے اصنام کو — ٹھوس بے حس ہو گئی تھی روح مثلِ سنگ و خشت
بھول کر اپنے رسولوں کے حسیں پیغام کو — لڑ رہی تھیں امتیں آپس میں گمراہی کی جنگ

کفر پر آخر فنا کی کپکپی طاری ہوئی — لطفِ حق نازل ہوا بھٹکے ہوئے انسان پر
اس طلوعِ نیّرِ اعظم کی تیاری ہوئی — جس کی کرنوں کو چمکنا تھا رُخِ فاران پر

ہر طرف ہونے لگی بارش الٰہی نور کی — ہو گیا شاداں عرب کا ریگ زارِ تشنہ کام
اور روشن ہو گئی دنیا قریب و دور کی — آپ آئے اور بدل کر رکھ دیے باطل نظام

کر دیا انسان کو جنّ و ملایک کا امام
السّلام اے رہنمائے روحِ آدم السّلام

مادیت ہے اسیرِ گردشِ ایّام پھر — آج پھر اس نے فروغِ روح کو دھندلا دیا
لوٹ آئے کفر کے تاریک صبح و شام پھر — جیسے اپنے آپ کو تاریخ نے دہرا دیا

منتظر ہیں لطفِ حق کے آپ کے بیکس غلام
السّلام اے رہنمائے روحِ آدم السّلام

(شمس نوید)

تبصرے

مسلمانانِ عالم کی کمزوری کے بنیادی اسباب | از مولانا محمد منظور نعمانی قیمت ۶ر
پتہ :- کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ۔

یہ چھوٹی تقطیع پر ۴۰ صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں قرآن مجید سے ثابت کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں اچھا برا جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم اور اس کی مشیت سے ہوتا ہے پھر اس کے حکم سے جو کچھ ہوتا ہے اس کے لئے قدرت کے خاص خاص مقررہ قوانین وضوابط ہیں اور اس دنیا میں کسی قوم کا بننا اور بگڑنا اس کا سربلند اور سرنگوں ہونا انھیں قوانین کے ماتحت ہوتا ہے۔ چنانچہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہر جگہ مسلمانوں پر جو انحطاط پایا جاتا ہے وہ انھیں قوانین کے ماتحت اور انھیں اسباب کا طبعی نتیجہ ہے جو قرآن نے بیان کئے ہیں اس کے بعد یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اب مسلمانوں کے لئے اپنی اس عام اور ہمہ گیر کمزوری کو دور کرنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں بھی قرآن مجید کی تعلیمات بالکل صاف واضح اور روشن ہیں اور مسلمان ان پر چل کر اپنے لئے عزت و وجاہت اور امن و عافیت کی وہ تمام نعمتیں پا سکتے ہیں جن سے اس وقت اپنے آپ کو وہ محروم سمجھتے ہیں رسالہ اگرچہ مختصر ہے اور اس میں موضوع بحث کے بعض گوشے تشنہ رہ گئے ہیں مثلاً مصنف کو چاہیے تھا کہ وہ ایک عام گفتگو کرنے کے بجائے یہ بتاتے کہ اس وقت مسلمانوں میں اخلاقی روحانی جسمانی اور مادی کون کون سی تباہ حالیاں پائی جاتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک تباہ حالی کن کن اسباب کا اور ان کی کن کن غلط کاریوں کا نتیجہ ہے اور یہ بتانا اس لئے ضروری تھا کہ جب تک طبیب کسی مرض کے اسباب کو الگ الگ متعین کر کے نہیں بتائیگا محض ایک عام وعظ سنا دینے سے مریض

کی صحت یابی کی امید نہیں ہو سکتی۔ ہمارے مصلحین قوم کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ وہ رائے عامہ کے دباؤ سے گول مول باتیں کرتے ہیں اور مرض کے اصلی سرچشمۂ فساد پر نشتر لگانے کی جرأت نہیں کر سکتے حالانکہ یہ طریقہ وعظ و ارشاد قرآن کے طریقہ کے بالکل خلاف ہے تاہم رسالہ اپنی موجودہ شکل و صورت میں بھی مفید ہے اور اس کا مطالعہ عبرت و بصیرت کا موجب ہوگا۔

مسلمان قوم کی حالت اور حاملان دین کا فریضہ | قیمت ۶؍

یہ ۴۸ صفحات کا رسالہ بھی مولانا محمد منظور نعمانی کے قلم سے ہے اور اپنے خاص انداز میں اس میں انھوں نے وہ ہی باتیں بیان کی ہیں جن کی ایک عالم سے توقع ہو سکتی ہے۔ یعنی ہر پیشہ اور ہر طبقہ کے مسلمان مذہب سے ناواقفیت اور دینی تعلیمات سے بے خبری کا شکار ہیں اس لئے علماء کا فرض ہے کہ وہ تبلیغ اور تعلیم دین کی طرف متوجہ ہوں اس رسالہ میں یہ جو کچھ لکھا گیا ہے حرفاً حرفاً صحیح ہے اور اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ مولانا کا تعلق ایک خاص تبلیغی جماعت سے ہے اس بنا پر انھوں نے طبعی طور پر اپنی جماعت کے طریق تبلیغ کو ہی سب سے اچھا موثر اور عوامی طریقۂ اصلاح ثابت کیا ہے۔ حالانکہ اسلام کی تبلیغ جس قدر درس و تدریس تصنیف و تالیف اور جہاد زندگی میں مردانہ وار حصہ لینے سے ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے وہ بھی کچھ کم اہم اور عظیم الشان نہیں ہے۔

غدر کے چند علماء | از مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۱۴۴ صفحات کتابت و طباعت متوسط قیمت مجلد عہ؍ پتہ:۔ مکتبہ ادب اردو بازار دہلی۔

اس کتاب میں ان چودہ علماء کا تذکرہ کیا گیا ہے جو مختلف علوم و فنون میں کمال رکھنے کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کے دشمن تھے اور اس بناء پر اپنے ملک کو غیروں کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لئے جد و جہد کی پاداش میں انگریزوں کے معتوب ہوئے کتاب میں مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا محمد جعفر تھانیسری اور مولانا صہبائی وغیرہم کے علاوہ وہ جن کے نام عام طور پر مشہور ہیں متعدد

[illegible] مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول
لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب طبع دوم قیمت للعہ مجلد صہ
سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ
رفتہ ترجمہ، جدید ایڈیشن۔ قیمت [illegible]
اسلام کا نظام حکومت۔ اسلام کے ضابطۂ
حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث زیر طبع
خلافتِ بنی امیہ۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ قیمت [illegible]
مجلد [illegible] مضبوط اور عمدہ جلد [illegible]
[illegible] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم
وتربیت۔ جلد اول اپنے موضوع میں بالکل جدید
کتاب قیمت للعہ مجلد صہ
نظام تعلیم وتربیت جلد ثانی جس میں تحقیق وتفصیل
کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ قطب الدین ایبک کے وقت
سے اب تک ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و
تربیت کیا رہا ہے قیمت للعہ مجلد صہ
قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات
کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت صہ مجلد [illegible]
مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی
قیمت للعہ مجلد صہ
[illegible] قرآن اور تصوف۔ حقیقی اسلامی تصوف
اور مباحث تصوف پر جدید اور محققانہ کتاب قیمت
[illegible] مجلد [illegible]

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ اور رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات
کا بیان ——— زیر طبع
انقلاب روس۔ انقلاب روس پر بلند پایہ تاریخی
کتاب قیمت [illegible]
[illegible] ترجمان السنہ۔ ارشاداتِ نبوی کا جامع
اور مستند ذخیرہ صفحات ۶۰۰ تقطیع [illegible] جلد اول
قیمت [illegible] مجلد [illegible]
تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ مع تنقید وتحقیق
از مترجم ونقشہائے سفر قیمت [illegible]
جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔ یوگوسلاویہ
کی آزادی اور انقلاب پر نتیجہ خیز دلچسپ کتاب قیمت [illegible]
[illegible] مسلمانوں کا نظم مملکت۔ مصر کے مشہور مصنف
ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم اے پی ایچ ڈی کی محققانہ کتاب
النظم الاسلامیہ کا ترجمہ قیمت [illegible] مجلد [illegible]
مسلمانوں کا عروج وزوال طبع دوم قیمت [illegible] مجلد [illegible]
مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم
قیمت [illegible] مجلد [illegible]
حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی۔ قیمت [illegible]
مفصل فہرست دفتر سے طلب فرمائیے جس سے
آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

منیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسنِ خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے۔ ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہینگی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہینگے۔

۲۔ محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہونگے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائینگے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائیگا۔

۴۔ احبار۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبار میں ہوگا ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لیے ہے۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے ۲ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کے دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء: اسلام میں غلامی کی حقیقت - جدید اڈیشن جس میں نظرِ ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت ے مجلد ۱۱؎

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ زیرِ طبع

سوشلزم کی بنیادی حقیقت - اشتراکیت کے متعلق جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ مع مقدمہ از مترجم — زیرِ طبع

ہندستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

۱۹۴۰ء: نبی عربی صلعم - تاریخ ملت کا حصہ اول - جس میں سیرتِ سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے۔ جدید اڈیشن جس میں اخلاقِ نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے۔ قیمت ۸؍ مجلد ۱۲؍

فہم قرآن - جدید اڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو ازسرِ نو مرتب کیا گیا ہے قیمت ۳؎ مجلد ۳؎

غلامانِ اسلام - اسی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید اڈیشن قیمت ۸؍ مجلد ۸؍

اخلاق اور فلسفہ اخلاق - علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید اڈیشن جس میں حک و فک کے بعد غیر معمولی اضافے کیے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین اور سہل کیا گیا ہے۔ زیرِ طبع۔

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - جدید اڈیشن حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات تک - قیمت ۲؎ مجلد ۳؎

وحی الٰہی - مسئلہ وحی پر جدید محققانہ کتاب زیرِ طبع

بین الاقوامی سیاسی معلومات - یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے کے لائق ہے ہماری زبان میں بالکل جدید کتاب۔ قیمت ۳؎

تاریخ انقلاب روس - ٹراٹسکی کی کتاب "تاریخ انقلاب روس" کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید اڈیشن ۶؎ (زیرِ طبع)

۱۹۴۲ء: قصص القرآن جلد دوم حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ کے حالات تک دوسرا اڈیشن ۵؎ مجلد ۶؎

اسلام کا اقتصادی نظام: وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے تیسرا اڈیشن ۸؍ مجلد ۱۰؍

مسلمانوں کا عروج و زوال - صفحات ۵۰۰ جدید اڈیشن قیمت ۸؍ مجلد ۱۰؍

خلافتِ راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) جدید اڈیشن قیمت ۲؎ مجلد ۳؎، مضبوط اور عمدہ جلد قیمت ۳؎

بُرھان

جلد بست وسوم شمارہ (۵)

نومبر ۱۹۴۹ء مطابق محرم الحرام ۱۳۶۹ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ اکبر! آج انسان اخلاقی انحطاط و پستی کے کس قعرِ عظیم میں گر پڑا ہے کہ کل تک جو چیزیں اخلاقیات عامہ کے اصول موضوعہ کا حکم رکھتی تھیں اور جن کو اپنے اندر پیدا کیے بغیر کوئی شخص انسانی شرف و مجد اور شرافت نفس کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا آج نہ صرف یہ کہ کھلے بندوں ان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے بلکہ طاقت و قوت شہرت و نمود، ہر دلعزیزی و ناموری حاصل کرنے کے لئے اُن اُصول اخلاقیات کے برعکس راستہ پر چلنا لازمی اور ضروری قرار پا گیا ہے۔ یہ اخلاقی انحطاط ہر جگہ اور ہر قوم کی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے۔ لیکن سیاست تو خاص طور پر اب ایک ایسا حمام بن کر رہ گئی ہے جس میں اچھے سے اچھے ثقہ اور نیک آدمی کو بھی ننگا ہونا پڑتا ہے۔

سچ بولنا۔ انصاف کرنا۔ بات کا پاس کرنا اور قول و فعل میں مطابقت۔ یہ چند چیزیں انسانی اخلاق عامہ اور تمام مذاہب و ادیان کے ایسے ابتدائی اسباق ہیں جن کی تعلیم ہر بچہ کو شروع سے دی جاتی ہے اور عملی زندگی میں اُن پر کاربند رہنے کی اسے برابر تاکید و تلقین کی جاتی ہے۔ لیکن آج ان کی رسوائی کا یہ عالم ہے کہ دنیا میں جو جتنا بڑا لیڈر ہے اسی قدر وہ ان سے باغی اور منحرف ہے۔ سر اسٹیفرڈ کرپس نے اسٹرلنگ کی قیمت گھٹانے کا اعلان کیا تو چند گھنٹے پہلے تک دنیا کو یہی یقین دلاتے رہے کہ قیمت نہیں گھٹے گی وزیر اعظم ہند نے الہ آباد میں تقریر کرتے ہوئے صاف صاف کہا کہ راشٹریہ سیوک سنگھ پر ہم اب بھی اعتماد نہیں کر سکتے لیکن اس کے چند روز بعد ہی کانگرس ورکنگ کمیٹی نے اس جماعت کے لوگوں کو کانگرس کے ممبر بننے کا حق دے دیا۔ آج نئی دہلی سے واشنگٹن تک غلغلہ برپا ہے کہ ہم گاندھی جی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں لیکن اس دعویٰ کا مذاق اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس جماعت کے لوگوں نے گاندھی جی کی

انتہائی مظلومانہ شہادت پر مٹھائی تقسیم کی اور گھی کے چراغ جلائے آج انھیں کے لئے کانگرس کا دروازہ کھولا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ گاندھی جی کی زندگی کے صرف دو اصول تھے ایک سچائی اور دوسرا عدم تشدد۔ کوئی بتلائے کہ ان میں سے کس پر اور کہاں عمل ہورہا ہے ہر وزیر کے اعمال و افعال کا محاسبہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے اپنے محکمہ سے متعلق سرکاری اعلانات و بیانات دیتے اور پھر ان کو عملی جامہ پہناتے وقت کہاں تک اور کس حد تک سچائی کا پاس رکھا ہے؟ اُس کے قول و فعل میں کتنی مطابقت ہے؟ اس کے بیانات کہاں تک واقعات و حقائق سے تطابق رکھتے ہیں؟ گاندھی جی کا اُٹھنا بیٹھنا مذہب اور خدا پر ایمان تھا۔ مگر یہاں کسی کارروائی میں کسی وزیر کی زبان سے آپ نے خدا اور مذہب کا نام سُنا ہے؟ گاندھی جی کہتے تھے وزیروں کو حضرت عمرؓ کی طرح سادہ زندگی بسر کرنی چاہتے۔ لیکن یہاں ہو کیا رہا ہے؟ وزیروں کے لئے شاندار کوٹھیاں۔ نوکروں کا ہجوم۔ اعلیٰ قسم کی موٹریں، نہایت عمدہ فرنیچر۔ ہوائی جہاز سب کچھ ہیں لیکن کروڑوں انسانوں کے لئے سر چھپانے کو ایک چھت۔ بدن ڈھانکنے کو کپڑا۔ اور پیٹ بھرنے کو روٹی بھی نہیں ہے۔ گاندھی جی ہندوستانی تھے اور پکے ہندوستانی۔ صورت شکل۔ وضع قطع لباس اور رہن سہن کے طور وطریق ہر اعتبار سے!! لیکن ہمارے وزیروں کو مغربی لباس پہن کر فخر ہوتا ہے۔ انگریزی کھانے انھیں زیادہ مرغوب ہیں اور طرز معاشرت بھی انھیں مغربی ہی بھاتا اور پسند آتا ہے۔ گاندھی جی قرآن اور گیتا دونوں کے عاشق تھے اور اپنی پرارتھنا میں دونوں کو سُنتے تھے لیکن یہاں ریڈیو اسٹیشن سے دونوں کا نشر بند کیا جارہا ہے۔ گاندھی جی اس کے قائل تھے کہ ہر شخص کو مذہبی آزادی ملنی چاہئے لیکن یہاں حال یہ ہے کہ گذشتہ عید اضحیٰ کے موقع پر متعدد مقامات پر فساد ہوا اور وہاں کے مسلمانوں کے لئے عید کا دن بھی محرم بن گیا گاندھی جی پریم کی تصویر اور سراپا محبت تھے۔ وہ دوستوں کے جاں نثار اور دشمنوں کے دوست تھے لیکن یہاں پرانے دشمنوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے جاں نثار دوستوں کو بھی ٹھکرایا جارہا اور اُن پر بے اعتمادی کا اظہار کیا جارہا ہے۔

اب ذرا اپنے پڑوس پر بھی نگاہ ڈالتے چلئے شور یہ ہے کہ ہماری ریاست اسلامی ریاست ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے شراب کو حرام کہا اور یہاں اس سے لاکھوں روپیہ سالانہ کی آمدنی حکومت کے خزانہ میں داخل ہوتی ہے اسلام نے سودی لین دین کی سخت ممانعت کی لیکن یہاں اس پر کوئی پابندی نہیں ہے قرآن نے عورتوں کو حکم دیا "قرن فی بیوتکن" اپنے گھروں میں رہیں لیکن یہاں عورتوں کی ایک خاص فوج بنائی جارہی ہے اور مردوں کی نگرانی میں انھیں فوجی ورزشیں سکھائی جاتی ہیں۔ قرآن نے عورتوں کو عہد جاہلیت کی طرح بناؤ سنگار کرکے باہر نکلنے سے روکا "ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ" لیکن یہاں پارکوں اور تفریح گاہوں میں۔ بازاروں میں اور پارٹیوں میں ہر جگہ یہ تماشا کاسیات عاریات کے منظر بکثرت نظر آئیں گے اور قانون کا ہاتھ ان کے روکنے سے عاجز و درماندہ ہے۔ ہر شخص کی زبان پر اسلامی جمہوریت کا نعرہ ہے۔ لیکن خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے ایک معمولی شخص کو یہ کہنے کی جرأت ہو سکتی تھی کہ اگر آپ غلط راستہ پر چلے تو ہم آپ کو چرخے کے تکلے کی طرح سیدھا کر دیں گے۔ مگر یہاں یہ عالم ہے کہ اسلامی جماعت جس کا قصور اس مطالبے کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ مسلمان سچے مسلمان بنیں اور اپنے قول کے مطابق عمل بھی کریں اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا گیا ہے اور مقدمہ چلائے بغیر اس جماعت کے امیر اور کارکنوں کو نظر بند کر رکھا ہے پھر جہاں تک غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ اور برتاؤ کا تعلق ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف ارشاد ہے۔ "دمائھم کدمائنا واموالھم کاموالنا" ان کا خون ہمارے خون کی طرح اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح محفوظ و محترم ہوگا۔ لیکن یہاں ہو یہ رہا ہے کہ سکھ تو پہلے ہی صاف ہو گئے اب تھوڑے بہت ہندو جو رہ گئے ہیں وہ بھی خوف و ہراس اور بے اطمینانی کی وجہ سے کھسک رہے اور وطن سے بے وطن ہو رہے ہیں حضرت عمرؓ کو کوفہ کے گورنر عتبہ بن غزوان نے ایک مرتبہ حلوہ کا ایک خاص قسم کا حلوہ لاکر پیش کیا تو آپ سخت برہم ہوتے اور ان کو برا بھلا کہہ کر فرمایا کہ "خدا کی قسم ہم وہ چیز ہرگز نہ کھائیں گے جسے عام مسلمان نہیں کھا سکتے" لیکن یہاں کا حال یہ ہے کہ عوام پریشان حال ہیں روٹی اور کپڑے کو ترس رہے ہیں۔ مگر ارباب حکومت کے کاشانے عیش و عشرت

کے تمام لوازم سے معمور ہیں اور زندگی کی کوئی راحت نہیں ہے جو انھیں میسر نہ ہو۔

آپ کہیں گے یہ ساڑھے تیرہ سو سال کی پرانی بات ہے۔ خلافت راشدہ کو چھوڑ کر مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ان پر عمل کب ہوا ہے؟ گذارش یہ ہے تو پھر اس عہد کے علاوہ اسلامی حکومت قایم ہی کب ہوئی ہے۔ اگر آپ اپنی حکومت کو اسلامی حکومت کہتے ہیں تو آپ کو لامحالہ ابوبکر صدیق رضؓ اور عمر فاروق رضؓ کے نقش قدم پر چلنا ہوگا ورنہ یہ عنوان بدل کر اپنی حکومت کو ایک "مسلم اسٹیٹ" کہنا ہوگا نہ کہ "اسلامک اسٹیٹ" اور اس مسلم اسٹیٹ کے قیام پر آپ خواہ کتنے ہی خوش ہوں لیکن اسلام آپ کو کوئی مبارکباد پیش نہیں کرسکتا۔ اسلام انسانی فکر و عمل کی کائنات پر اپنے نظام حیات کو چھایا ہوا دیکھنا چاہتا ہے اور بس! وہ ایک مسلمان کہلانے والی قوم کی حکومت و خودمختاری کے عنوان کا فریب خوردہ نہیں ہوسکتا۔

بہرحال گاندھی جی ہوں یا اسلام دونوں اس پر متفق ہیں کہ ایک انسان کے اعلیٰ کیرکٹر کی بنیادی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ اس کا دل پاکباز ہو۔ اس کی زبان اور قلب میں ہم آہنگی ہو۔ وہ خود اپنے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ بھی انصاف کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ اس کا کوئی عمل ذاتی حظ نفس کے لئے نہ ہو۔ بلکہ قوم۔ جماعت اور انسانیت کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے ہو۔ صرف یہی چند اصول ہیں جن پر عامل ہو کر ہمارے لیڈر عوام کا اعتماد حاصل کرکے ملک کو مضبوط اور خوشحال بنا سکتے ہیں۔

یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ ایشیا پیغمبروں کی سرزمین ہے تمام بڑے بڑے مذاہب یہیں پیدا ہوئے اور یہیں سے ان کے برگ و بار تمام عالم میں پھیلے اس بنا پر ایشیا کے فلسفۂ اخلاق کا ایک اہم اصول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ مقاصد اچھے ہوں تو ان کو حاصل کرنے کے لئے ذرائع بھی اچھے ہی

ہونے چاہئیں۔ اس کے برخلاف موجودہ مغربی سیاست جو چند بازیگروں کی شعبدہ سامانی کا ایک اکھاڑہ ہے اس کے فلسفۂ اخلاق میں کسی اچھے مقصد کے لئے بُرے سے بُرے ذرائع بھی اختیار کرنے کی ترغیب پائی جاتی ہے۔ ہماری قوم کے لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرکے مضبوطی کے ساتھ اس پر قایم رہنے کا عزم صمیم پیدا کریں اگر انھوں نے پہلے راستہ کو اختیار کیا تو کوئی شبہ نہیں کہ اس طرح وہ نہ صرف اپنے ملک کو بچا سکیں گے بلکہ ایشیا کی لیڈر شپ اپنے ہاتھ میں لے لیں گے اور اخلاقی بنیادوں پر ایشیاء کی عظمت جدید کی تعمیر ایک ایسے طریقہ پر کرسکیں گے کہ مغربی مادیت کی ماری ہوئی دنیا بھی ان سے روشنی حاصل کرنے پر مجبور ہوگی اور اگر خدانخواستہ مغربی سیاست کی تقلید و پیروی میں انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا تو اس کا انجام تباہی اور عام بربادی کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا کیونکہ ہمارے لیڈر اپنے مغربی حریفانِ سیاست کی دیکھا دیکھی کتنا ہی جھوٹ بولنے اور مکر و فن کی باتیں کرنے کی کوشش کریں لیکن پھر بھی ان کی فطرت میں ایشیائی اوصاف و خصائل کا جوہر موجود ہے وہ غیر اخلاقی سیاسیات کے معرکہ میں اپنے حریفان سفید فام سے بازی نہیں جیت سکتے۔ جھوٹ بولنے کے حق میں ان کا شکست کھاجانا یقینی ہے حق اور سچ کا راستہ صرف ایک ہے۔ مکر و فریب اور کذب و دروغ کے ہزار راستے ہیں اور مغرب کو ان راستوں کی جنتی گہری۔ وسیع اور ٹھوس واقفیت ہے مشرق کو اس کا پاسنگ بھی نہیں !! . . . . سعید احمد

ندوۃ المصنفین کے حلقۂ احباب کے لئے اس ماہ المناک سانحہ حاجی اسرار احمد صاحب کی وفات ہے اکتوبر ۱۹۴۹ء کے آخری سفر کلکتہ میں حاجی صاحب مرحوم سے ملاقات ہوئی تھی اور میں ان کو اچھا خاصا تندرست چھوڑ کر آیا تھا اب عزیزم مولوی سعید احمد کے خط سے اچانک ان کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ یوں تو یہ دنیا گذشتنی اور گذاشتنی ہے۔ یہاں جو آتا ہے اُسے ایک نہ ایک دن رخصت بھی ہوجانا پڑتا ہے۔ آنے اور جانے کا یہ عمل جب سے دُنیا قایم ہے برابر جاری ہے

لیکن جانے والوں میں بعض ایسے ہوتے ہیں جو اپنے کردار، اخلاق، اور عمل کی وجہ سے ایک خاص مقام کے مالک بن جاتے ہیں پھر جب وہ قانونِ فطرت کے مطابق سفرِ آخرت اختیار کر لیتے ہیں تو جو جگہ انھوں نے اپنے لئے بنائی تھی وہ خالی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ خلا رخصت ہو جانے والے کی شخصیت کو یاد دلاتا رہتا ہے۔ اور اُس کی مفارقت کا احساس لوگوں میں بڑھ جاتا ہے۔

حاجی اسرار احمد صاحب مرحوم بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ مرحوم آنولہ ضلع بریلی کے باشندہ تھے، عرصہ دراز سے کلکتہ میں تجارت کرتے تھے۔ میں چودہ پندرہ سال ہوئے ان سے کلکتہ میں متعارف ہوا تھا۔ اس دوران میں مجھے برابر اُن کے کردار اور عمل کے مطالعہ کا موقع ملتا رہا وہ صرف اچھے تاجر ہی نہیں تھے بلکہ اپنے دل میں ایک ایسا احساس دل بھی رکھتے تھے جس میں مذہب کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جن کاموں کو وہ قوم کے لئے مفید سمجھتے تھے اُن میں اپنی حیثیت سے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے جب "ندوۃ المصنفین" کے قیام کا ابتدائی تصور مفتی عتیق الرحمن صاحب کے اور میرے ذہن میں آیا تو حاجی صاحب مرحوم اس کی تائید کرنے والوں کی صفِ اول میں تھے۔ پھر تائید بھی زبانی اور رسمی نہیں بلکہ عملی اور حقیقی، چنانچہ جو تعلق ندوۃ المصنفین سے انھوں نے پہلے دن قائم کیا تھا اُسے آخر وقت تک اُسی آن بان سے نباہتے رہے۔

حاجی صاحب مرحوم صرف چار پانچ دن ٹائیفائڈ میں مبتلا رہ کر اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حاجی صاحب کی وفات نے نہ صرف ندوۃ المصنفین کے حلقہ میں رنج وغم کی کیفیت پیدا کر دی ہے بلکہ جمعیۃ علماء، دار العلوم دیوبند، تبلیغی جماعت اور دوسرے بہت سے مذہبی ادارے بھی اس غم میں شریک ہیں"۔ ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی" مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور دعاء کرتا ہے کہ حق تعالیٰ انھیں صبرِ جمیل عطا فرمائیں اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے کر اپنے خصوصی انعام سے نوازیں۔ آمین

محمد حفظ الرحمٰن

پیغام ابراہیم

(جناب حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند)

آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں جو ایک تاریخی یادگار منائی جارہی ہے۔ اور جس کو ہم "عید قرباں" کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ تاریخ عالم کا اہم واقعہ، اور قربانی وجاں سپاری کی ایک بے مثال یادگار ہے۔

دُنیا میں جو انسان بھی کسی بلند اور پاکیزہ مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے اُسے امتحان وآزمائش کی سخت سے سخت اور کٹھن سے کٹھن منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ پھر اگر اُس کے دل میں مقصد کے حصول کی سچی آرزو اور لگن ہوتی ہے، اور وہ امتحان وآزمائش کی منزلوں میں من کا سچا اور لگن کا پکّا ثابت ہوتا ہے تو پھر کامیابی کی راہیں اُس کے لئے کھل جاتی ہیں۔ اور وہ اپنے اعلیٰ مقصد کو پالیتا ہے۔

خدا کے پیغمبر اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام جس مقصد اور مشن کو لے کر دنیا میں آتے ہیں۔ وہ انسانی مقاصد میں سب سے اُونچا اور پاک مقصد ہوتا ہے وہ زمین پر بسنے والے ہر انسان کو تباہی وگمراہی سے ہٹا کر سچائی اور خدا پرستی کی طرف بلاتے ہیں۔ اُن کے ساتھ خدا کا پیغام ہوتا ہے، اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے کہ زمین پر بسنے والے انسان خدا کے بھیجے ہوئے اس "نظامِ حیات" یا "دین" کو اختیار کریں جس سے دُنیا میں امن وسکون پیدا ہو، ظلم وناانصافی کا نام ونشان تک مِٹ جائے، سچائی کا بول بالا ہو، باطل پرستی کا خاتمہ ہو جائے اور امن وانصاف کے ہمہ گیر سائے میں خدا کی تمام مخلوق کو چین اور خوشحالی کی زندگی نصیب ہو۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی دنیا میں کوئی پیغمبر خدا کی طرف سے اس پاکیزہ مشن کو لے کر آیا ہے۔ اور اس نے خدا کو بھولے ہوئے، سچائی کے راستہ سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو حق پرستی کی دعوت دی ہے تو یکبارگی کفر وضلالت کی تمام سرکش طاقتیں اس "دعوت حق" کے مقابلہ کے لئے سامنے آگئی ہیں، اور انھوں نے بنی نوع انسان کو پیغام خدا وندی سے غافل رکھنے کے لئے اپنی تمام قوتیں صرف کر دی ہیں۔

قرآن حکیم کے صفحات کھلے ہوئے ہیں۔ آپ تمام پیغمبروں کے حالات و واقعات کو دیکھ جائیے۔ واقعات کی نوعیت مختلف رہی! لیکن ان سب کی روح ایک ہی تھی۔ اور وہ یہ کہ جب کسی "داعی حق" نے خلوص ومحبت سچائی اور دردمندی کے ساتھ کسی قوم کو حق پرستی کی دعوت دی تو اس قوم کی اکثریت نے اس "دعوت" کا جواب تمرد وسرکشی بہتان تراشی اور گالیوں ہی سے دیا۔ خدا کے ان سچے پیغمبروں کو مجنون اور دیوانہ کہا۔ کاہن اور جادوگر بتلایا ان کو سخت سے سخت ایذائیں پہنچائیں، ان کا مقاطعہ اور سوشل بائیکاٹ کیا اور ان کے راستہ میں رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے کئے۔ غرضیکہ ان کے مشن کو ناکام بنانے کے لئے اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں۔ لیکن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام عزم وثبات کے پیکر ہوتے ہیں ان کے ساتھ صبر واستقلال کا وہ جوہر ہوتا ہے جو کسی بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی شکست نہیں کھا سکتا اور کٹھن سے کٹھن آزمائش بھی ان کے لئے ہمت شکن نہیں ہوتی، اس لئے کہ ان کو رسالت ونبوت کا منصب جلیل تب ہی عطا کیا جاتا ہے جبکہ پہلے ان کے عزم واستقلال کو آزمائش وامتحان کی ترازو میں تول لیا جاتا، اور ان کے جذبۂ حق پرستی کو کسوٹی پر پرکھ لیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر تھے۔ انھیں نبوت وپیغمبری کا اعلیٰ منصب دیا گیا تھا اس لئے انھیں بھی ابتلاء وآزمائش کی کٹھن اور دشوار گذار منزلوں سے گذرنا تھا، اور قدم قدم پر اپنے جذبۂ تسلیم وجاں سپاری کا امتحان دینا تھا۔

چنانچہ سخت سے سخت آزمائشوں کے ذریعہ اُن کو جانچا گیا۔ لیکن وہ ہر امتحان میں کامیاب اور قربانی کی ہر کسوٹی پر کھرے اور کندن ثابت ہوئے۔

سب سے پہلے جب اُن کی "دعوتِ حق پرستی" سے تنگ آکر حاکم وقت "نمرود" نے اُن کو آگ کے دہکتے ہوئے شعلوں میں ڈلوایا، اور کہا کہ اب بھی اگر تم اپنے اس مشن سے باز آجاؤ تو تمہیں بچایا اور معاف کیا جا سکتا ہے! تو وہ عزم و استقلال کی ایک کڑی آزمائش تھی۔ لیکن اس موقعہ پر اُنھوں نے جس عزم و استقامت اور صبر و استقلال کا ثبوت دیا وہ صرف حضرت ابراہیمؑ کا حصہ تھا۔

پھر جب حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ کو فاراں کے لق و دق جنگل میں چھوڑ آنے کا حکم دیا گیا اور جانچا گیا کہ بیوی اور اکلوتا بچہ زیادہ عزیز ہے یا حکم خداوندی کی تعمیل! تو یہ بھی اُن کے جذبۂ تسلیم و رضا کا کوئی معمولی امتحان نہ تھا۔ لیکن خدا کا سچا پیغمبر اس امتحان میں بھی کامیاب ثابت ہوا۔ بڑھاپے کے ارمانوں اور خوشیوں کے مرکز، دن رات کی دعاؤں کے ثمر، اور گھر کے اکلوتے چشم و چراغ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کو صرف حکم الٰہی کی تعمیل میں ایک لق و دق جنگل میں چھوڑ آتے ہیں، اس طرح کہ چلتے وقت مڑ کر بھی نہیں دیکھتے کہ کہیں محبت پدری جوش میں نہ آجائے اور تعمیل حکم میں کوئی لغزش نہ ہو جائے۔

ان کٹھن منزلوں سے کامیاب گذر جانے کے بعد اب تیسرا امتحان درپیش ہے جو پہلے امتحانوں سے بھی زیادہ سخت اور حوصلہ آزما امتحان ہے!

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک سچے خواب میں دیکھتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ اُن کو حکم دے رہا ہے کہ ابراہیم! تم ہماری راہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی پیش کرو۔ حکم پاتے ہی اُٹھتے ہیں اور فوراً تعمیل حکم کے لئے نکل جاتے ہیں۔ سعادتمند بیٹا بھی تسلیم و رضا کا پیکر بن کر لیٹ جاتا ہے اور حضرت ابراہیم چھُری سے اُس کو ذبح کرنے لگتے ہیں کہ یکایک خدا کی طرف سے وحی آتی ہے: ابراہیم! بس! اس کو چھوڑ دو! اور دیکھو! تمہارے قریب مینڈھا کھڑا ہے

اس کو قربان کرو۔ ہمیں اسماعیل کی جسمانی قربانی درکار نہیں، یہ محض تمہارے جذبۂ تسلیم و رضا کا ایک امتحان تھا جس میں تم کامیاب ثابت ہوئے۔

جاؤ! حق پرستی اور عزم و ثبات کی راہ میں تمہاری یہ کٹھن آزمائش رہتی دنیا تک قربانی و جاں سپاری کی ایک یادگار رہے گی۔ جو ہر سال لوٹ لوٹ کر، سچائی کی طرف آنے والوں کو یہ یاد دلائیگی کہ سچائی کی راہ امتحان و آزمائش کی راہ ہے!

یہی وہ قربانی ہے جو خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی مقبول ہوئی کہ بہ طور یادگار ملت ابراہیمی کا شعار قرار پائی اور آج بھی دسویں تاریخ ماہ ذی الحجہ کو تمام دنیائے اسلام میں یہ شعار اسی طرح منایا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ دنیا میں جو انسان بھی حق و صداقت کی راہ پر چلتا ہے اُسے کڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے اور سچائی کی منزل تک پہنچنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنی پڑتی ہے اس لئے کہ قربانی ہی وہ کسوٹی ہے جس سے سچ اور جھوٹ، یا کھرے اور کھوٹے کی کھلی پہچان ہو جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس واقعہ کو ہزارہا برس گذر چکے ہیں لیکن خداوند عالم نے ملت ابراہیمی کے متبعین کے لئے یہ لازمی قرار دیدیا کہ وہ ہر سال اس واقعہ کی یاد تازہ کریں اور دسویں تاریخ ماہ ذی الحجہ کو خدا کی بارگاہ میں قربانی پیش کریں،

تاکہ ہر سال جب یہ دن لوٹ کر آئے تو حق پرستی کے دعویداروں کو یہ یاد دلادے کہ حق پرستی کا صرف زبانی دعوےٰ اپنی کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ بلکہ اُس کا ثبوت آزمائش و امتحان کے موقعہ پر "حق" کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی ہوتی ہے۔

پس! آج بھی جو انسان حق و صداقت کی راہ پر چلنا چاہے اور دنیا میں ہر طرف چھائی ہوئی گمراہیوں سے بچ کر سچائی کی منزل تک پہنچنا چاہے اُسے چاہئے کہ پہلے اپنے عزم و ہمت کو جانچ لے اور ہوشیار رہے کہ اس راہ میں اُسے "حق" کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینی پیش

کرنی ہوگی، سخت سے سخت آزمائش سے گذرنا ہوگا۔ اور وہ اپنے اعلیٰ مقصد کو تب ہی پا سکے گا جبکہ تسلیم و رضا کی کسوٹی پر کھرا ثابت ہو جائے۔

قرآنِ حکیم نے نظریۂ قربانی کی وضاحت کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی تبلایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ سنّت جو ملّت حنیف کا شعار قرار دی گئی ہے اور جو ہر سال دس ذی الحجہ کو ایک جانور کے ذبیحہ کی شکل میں ادا کی جاتی ہے وہ محض انسان کے جذبۂ حق پرستی اور تسلیم و رضا کی ایک آزمائش ہے جس کا عملی مظاہرہ کسی جانور کی قربانی کی صورت میں کیا جاتا ہے... یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کو کسی جانور کی جان لینا یا اُس کا خون بہانا ہی مقصود ہو بلکہ اصل مقصد انسان کے قول و عمل کی صداقت، نیت کی سچائی اور صفائی، اور حق و صداقت کی راہ میں اُس کے عزم و استقلال کا امتحان ہے۔

لیکن جس طرح ایک جاندار کی ہر حرکت و عمل درحقیقت اس کی روح یا جان ہی سے ہوتی ہے اور روح کے بغیر کسی جسم کا عدم و وجود برابر ہے۔ پھر بھی کسی روح یا جان کی حرکت و عمل ایک جسم ہی کی شکل میں ہو سکتی ہے اور جب تک روح کسی جسم کا لباس نہ اوڑھ لے۔ اُس کی کسی حرکت اور فعل کا مظاہرہ نہیں ہو سکتا، ٹھیک اسی طرح ایک انسان کے جذبۂ حق پرستی کی آزمائش کے لئے ایک ظاہری رسم بھی ضروری ہے۔ جس کے ذریعہ اُس آزمائش کا عملی مظاہرہ ہو سکے۔

اس لئے خداوند تعالیٰ نے کسی حیوان کے ذبیحہ کی رسم بطور شعار لازمی قرار دی۔ جو اپنی جگہ محض ایک جسم کی حیثیت رکھتی ہے اور اُس کی روح وہی آزمائش اور حق و سچائی کے ساتھ دلی لگاؤ کا امتحان ہے جس کا عملی مظاہرہ اس رسم کے ذریعہ ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے!

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ — یعنی تم جو ذبیحہ بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہو اللہ تک نہ اُس کا گوشت و پوست پہنچتا ہے اور

نہ خون و لہو! اللہ تک جو چیز پہنچتی ہے وہ
صرف تمہاری پرہیزگاری ہے۔ اخلاق و کردار
کی صفائی ہے۔ نیت کی سچائی اور "حق" کی
خاطر ایثار و جاں سپاری ہے۔

تو قربانی کی یہ سنت ادا کرتے وقت یہ نہ بھول جاؤ کہ یہ "رسم" محض ایک عملی مظاہرہ ہے جس سے مقصود تمہاری سچائی اور پرہیزگاری کا امتحان ہے اگر تمہارے اس عمل قربانی کی تہ میں یہ چیزیں موجود ہیں۔ تو تمہاری قربانی اللہ کے نزدیک مقبول اور اپنے مقصد میں کامیاب ہے ورنہ یہ بھی اسی طرح بیکار رہے جس طرح ایک جسم اپنی روح کے بغیر بیکار ہوتا ہے اور اس کا ہونا، نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اسلامی روایات کا تحفظ

(سید جمیل واسطی ایم۔اے (کینٹ))

قدرتی نظام اجتماع

(از جناب مولوی محمد ظفیر الدین صاحب پورہ نوڈیہا دی استاد دار العلوم معینیہ سانخہ)

(۳)

(سلسلہ کے لئے برہان ماہ ستمبر ملاحظہ فرمائیے)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق بیان ہے کہ آپ بازار میں تھے اتنے میں نماز کے لئے اقامت کہی گئی، بس دیکھا فوراً سبھوں نے دوکانیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہو گئے یہ منظر دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ انھی لوگوں کے باب میں یہ آیت نازل ہوئی ہے رجال لا تلھیھم تجارۃ الخ[۱]

سلف صالحین کا جماعت سے عشق ایک دفعہ میمون بن مہران مسجد پہنچے تو اُن کو معلوم ہوا کہ جماعت ہوچکی یہ سن کر آپ نے پڑھا انا للہ وانا الیہ راجعون پھر فرمایا جماعت کی نماز مجھ کو عراق کی گورنری سے زیادہ محبوب ہے[۲]۔

سلف صالحین جماعت کے جس قدر دلدادہ تھے، اس کی مثال اس دور میں ملنی مشکل ہے اگر کبھی ان کی تکبیر اولیٰ بھی فوت ہوجاتی تھی تو تین تین دن تک اس کا سوگ کرتے اور اگر اتفاق سے جماعت چھوٹ جاتی تب تو سات دن تک غم والم میں مبتلا رہتے[۳]۔

موجودہ دور میں علماء کا اہتمام جماعت یہ چند واقعات آپ کے سامنے ہیں ان کے پیش نظر بار بار غور کریں اور جماعت کی نماز کی اہمیت کا اندازہ لگائیں۔ جی چاہتا تھا کہ ہر دور کی چند مثالیں پیش کردی جائیں مگر تطویل کے خوف سے نظر انداز کرنا پڑ رہا ہے صرف موجودہ دور کے چند باخدا بزرگوں کے صحیح واقعات عبرت وبصیرت کے لئے لکھے جاتے ہیں۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۹۵ [۲] احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۰۹ [۳] احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۱۰

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب حج کے سلسلہ میں مکہ معظمہ اور پھر کسی وجہ سے طائف تشریف لے گئے تو وہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا، کافی شورش پھیلی ہوئی تھی ہر آن گولیاں چلتی رہتی تھیں، ورنہ خطرہ تو بہرحال تھا اس وقت بھی حضرت پنجوقتہ نماز باجماعت ادا کرتے تھے، اور جس طرح بن پڑتا مسجد پہونچنے کی کوشش کرتے، یہاں سے جب برطانیہ کے اشارہ پر شریف مکہ نے گرفتار کر لیا اور برطانیہ کی نگرانی میں مالٹا روانہ کئے گئے تو تمام راستہ حتی الوسع سنگین کے پہروں میں بھی باجماعت نماز ادا کرنے کی سعی جاری رکھی، گورے چمڑے والے فوجی چاروں طرف سے گھیرے میں لئے ہوئے ہوتے اور حضرت اپنے معتقدین کے ساتھ باجماعت نماز میں مشغول ہوتے مالٹا پہونچے تو وہاں سردی اپنے شباب پر تھی خیمہ سے سر نکالنا بھی مشکل ہوتا تھا اس زمانہ میں بھی حضرت اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ایک خیمہ میں جمع ہو کر باجماعت نماز ادا کرتے۔[1]

مولانا عبدالباری صاحبؒ فرنگی محلی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جماعت کی نماز کے اس قدر عاشق تھے کہ سفر میں بھی ان کو منفرد بن کر نماز پڑھنا گوارہ نہ تھا چنانچہ وہ غالباً اپنے خرچ سے دو آدمیوں کو اسی وجہ سے ساتھ لے کر چلتے، اور وقت پر ان کے ساتھ مل کر جماعت سے نماز ادا فرماتے تھے۔[2]

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کا انتقال ابھی حال ہی میں ہوا ہے، جماعت کی نماز پر کیسے بجان و دل فدا تھے اس کا تھوڑا بہت اندازہ ان اقتباسات سے لگا لیجئے جو مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے "مولانا الیاسؒ اور انکی دینی دعوت" نامی کتاب میں مرض الموت کے واقعات کے سلسلہ میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"مارچ ۱۹۴۴ء میں ضعف بہت بڑھ چکا تھا، نماز بھی پڑھانے سے معذور تھے لیکن جماعت میں دو آدمیوں کے سہارے تشریف لاتے تھے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے" (ص ۱۴۹)

"اخیر میں جب حالت نازک ہو گئی تو اس وقت بھی مولانا موصوف نے جماعت ترک نہ فرمائی

---

[1] دیکھئے سفرنامہ اسیر مالٹا ص ۸۰ و ۱۴۹ [2] بروایت مولانا مناظر احسن گیلانی مدظلہ

بلکہ ہوتا یہ تھا کہ آپ کی چارپائی صف کے کنارے لگادی جاتی تھی اور آپ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے تھے" (ص ۱۲۵)

حضرت مولانا بشارت کریم رحمۃ اللہ علیہ گڑھولوی جو ضلع مظفر پور (بہار) میں ایک بڑے باخدا بزرگ[1] گذرے ہیں، آپ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو پاؤں کی کوئی ایسی بیماری تھی جس کی وجہ سے چلنے سے بڑی حد تک مجبور تھے مگر مولانا علیہ الرحمۃ کے شیفتگیٔ جماعت کا یہ حال تھا کہ آپ نے ایک گاڑی لبطور رکشا بنوا رکھی تھی جس سے پنجوقتہ مسجد حاضر ہوکر باجماعت نماز پڑھتے تھے

مولانا منظور نعمانی اپنے پدر بزرگوار کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"نماز باجماعت کا اہتمام جیسا میں نے اپنے والد ماجد میں دیکھا، ایسا بہت ہی خاص بندگان خدا میں دیکھا گیا ہے اور یہ صرف اپنے ہی حق میں نہ تھا بلکہ ان کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ گھر کا ایک ایک آدمی بلکہ ہر صاحب شعور بچہ بھی جماعت کے وقت مسجد پہنچ چکا ہو نماز کا وقت شروع ہوتے ہی تقاضا فرمانا شروع کر دیتے تھے، پھر جب مسجد کو جاتے، تو راستہ کے لوگوں کو یاد دلاتے جاتے، ادھر چند مہینوں سے آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا اور بینائی قریباً معدوم ہوگئی تھی جس کی وجہ سے خود وقت کا اندازہ نہ فرما سکتے تھے تو ظہر اور عصر میں بہت پہلے سے دریافت فرمانا شروع کر دیتے تھے کہ بتلاؤ دروازہ کے سامنے سایہ کہاں تک گیا۔

(الفرقان رمضان المبارک ۶۲ھ)

میں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں، جب میں مفتاح العلوم میں پڑھتا تھا حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ کے والد مرحوم کو دیکھا کہ باوجود اپنے مختلف مشاغل اور ضعف و کبر سنی کے ہمیشہ اپنے محلہ کی مسجد میں باجماعت نماز پڑھتے تھے خود حضرت مولانا مدظلہ کو جب وہ مطالعہ میں مشغول رہتے کسی لڑکے سے بلواتے تھے اسی طرح مولانا مدظلہ کے بچوں کو صبح تک کی نماز میں اپنے ساتھ مسجد لے جاتے،

---

[1] روایت حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب دربھنگوی

ضلع پورنیہ (بہار) کے مولانا ظفر صاحب کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تو خود جماعت کے عاشق تھے ہی ساتھ ہی یہ جذبہ اور جماعت کی ایسی اہمیت تھی کہ وہ عوام کو ترغیباً یہ مسئلہ بتاتے تھے کہ منفرد کی فرض نماز، نماز ہی نہیں ہوتی، بغیر عذر شرعی مسجد کی غیر حاضری پر بہت خفا ہوتے، کوئی ان سے تعویذ لینے آتا تو اس سے باجماعت نماز کے متعلق دستاویز لکھوا کر دیتے تھے۔

نظم جماعت کی وجہ اور اس کے فضائل | اب تک نظم جماعت کی اہمیت ثابت کی گئی، اب یہ بتانا ہے کہ آخر یہ اہتمام باجماعت تھا کیوں؟ اس سلسلہ میں اختصار کے ساتھ چند حدیثیں ذکر کی جائیں گی جس سے امید کی جاتی ہے کہ نظم جماعت کے فضائل ذہن نشین ہو جائیں گے شرعی طور پر بھی اور بڑی حد تک عقلی طور پر بھی انشاء اللہ تعالیٰ ——— ارشاد نبوی ہے۔

صلوٰۃ الرجل فی الجماعۃ تضعف علی صلاتہ فی بیتہ وفی سوقہ خمساً وعشرین ضعفاً وذلک انہ اذا توضأ فاحسن الوضوء ثم خرج الی المسجد لایخرجہ الا الصلوٰۃ لم یخط خطوۃ الا رفعت لہ بہا درجۃ وحط عنہ بہا خطیئۃ فاذا صلی لم تزل الملٰئکۃ تصلی علیہ مادام فی مصلاہ اللہم صل علیہ اللہم ارحمہ ولا یزال احدکم فی صلاۃ ما انتظر الصلاۃ (بخاری)	مرد کی باجماعت نماز اس کی انفرادی نماز سے ثواب میں پچیس گونہ بڑھی ہوئی ہے جو وہ اپنے گھر یا بازار میں پڑھے مگر یہ اس وقت کہ وہ باقاعدہ وضو کرے پھر اخلاص کے ساتھ مسجد آئے، مسجد آنے میں جو قدم بھی اس کا اٹھے گا ہر قدم کے بدلہ ایک درجہ بلند ہوگا اور ایک گناہ معاف ہوگا، جب تک وہ اپنے مصلے پر نماز وغیرہ میں مشغول رہیگا اس کے لئے ہمیشہ فرشتے دعائے مغفرت کریں گے کہ اے اللہ اس کو بخشدے اے اللہ اس پر رحم فرما اور جب تک کوئی نماز کے انتظار میں ہوتا ہے تو گویا وہ نماز ہی میں ہوتا ہے

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ منفرد کی نماز سے جماعت کی نماز ستائیس درجہ زیادہ

عہ مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک جماعت سنت موکدہ از زیادہ سے زیادہ واجب ہے ۱۲

فضیلت رکھتی ہے ان حدیثوں سے یہ بات نمایاں طور پر معلوم ہوئی کہ اکیلا اکیلا منفرد جو نماز پڑھی جاتی ہے اس میں اور جماعت میں جو نماز پڑھی جاتی ہے اس میں بلحاظ اجر و ثواب اور فضیلت بہت تفاوت ہے، پھر جماعتی کا ہر قدم ایک گناہ کو مٹاتا اور ایک درجہ بلند کرتا ہے، مزید برآں جب تک وہ مسجد میں ہوتا ہے فرشتے اس کے لئے دعائے رحمت و مغفرت کرتے ہیں۔

الفاظ حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ثواب کی زیادتی میں جگہ اور مکان کو بڑا دخل ہے جو ثواب مسجد کی جماعت کا ہے وہ گھر کی جماعت کا نہیں اور جتنا ثواب گھر کی نماز با جماعت کا ہے بازار کی با جماعت نماز کا نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ منفرد کی نماز بھی ہو جاتی ہے اور اس طرح فرضیت بھی ذمہ سے ساقط ہو جاتی ہے مگر ثواب میں ان دونوں (با جماعت اور انفرادی) نماز میں بڑا فرق ہے قلب و جگر پر اثرات کے ترتب میں ایک کو جو درجہ حاصل ہے وہ دوسری (منفرد کی نماز) کو نہیں، اجتماع کو اس باب میں بڑا دخل ہے، یہی وجہ ہے کہ جماعت جس قدر بڑی ہوتی ہے اسی اندازہ سے فضیلت بڑھتی جاتی ہے، حدیث میں ہے

ان صلوۃ الرجل مع الرجل ازکی من	مرد کی نماز ایک شخص کے ساتھ اس کی تنہا نماز
صلاتہ وحدہ و صلاتہ مع الرجلین	سے پاکیزہ تر ہے اور اس کی نماز دو شخصوں کے
ازکی من صلاتہ مع رجل و ما کثر	ساتھ ایک شخص کے ساتھ والی نماز سے افضل
فھو احب الی اللہ۔	ہے اور جماعت میں جس قدر زیادتی ہو اللہ تعالیٰ
(ابو داؤد باب ما جاء فی فضل الجماعۃ)	کو وہ اور بھی محبوب ہے۔

نظم جماعت میں ثواب کی زیادتی کی تفصیل | ابھی ابھی جو ایک حدیث میں پچیس اور دوسری میں ستائیس گونہ کا ہندسہ آیا یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں کہ خواہ مخواہ اس کے کرید میں لگ جائیں، یہ دو کا فرق محض حسن عمل، حسن نیت مسجد کے قرب و بُعد، خضوع و خشوع اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کی وجہ سے ممکن ہے، یا

لہ مسلم باب صلاۃ الجماعۃ والتشدید فی التخلف عنہا ص ۲۳۱ ج ۱

صرف زیادتی ثواب بتانا ہے عدد تعیین کے لئے نہ ہو، اور بھی وجہ نکل سکتی ہے چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے ان دونوں حدیثوں میں تطبیق کی بہت سی شکلیں لکھی ہیں مگر ان میں راجح انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق اس صورت کو دیا ہے کہ یہ فرق سرّی اور جہری نماز کا ہے . . . .
کہ سری میں دو کم یعنی پچیس گونہ اور جہری میں دو زیادہ یعنی ستائیس گونہ، پھر اس کی تفصیل بیان کرکے اپنے اس قول کو مدلل فرمایا ہے تفصیل اہل علم کے لئے قابل مطالعہ ہے، ملاحظہ فرمایا جائے۔

(۱) مؤذن کی دعوت جماعت کی نماز کی نیت سے قبول کرنا۔

(۲) اذان سنتے ہی نماز کے لئے جلدی کرنا اور اول وقت میں چلنا۔

(۳) باوقار مسجد کو روانہ ہونا

(۴) مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دعائے ماثورہ پڑھنا۔

(۵) مسجد میں پہنچکر دو رکعت تحیۃ المسجد کی نماز پڑھنا۔

(۶) جماعت کا انتظار کرنا (جو نماز پڑھنے کے حکم میں ہے)۔

(۷) فرشتوں کا جماعت کی نماز پڑھنے والوں کے لئے دعائے رحمت ومغفرت کرنا۔

(۸) ان کے حق میں فرشتوں کی شہادت۔

(۹) تکبیر کے الفاظ کے جواب دینا۔

(۱۰) تکبیر کے وقت شیطانی وسوسہ سے محفوظ رہنا (کیونکہ وہ بھاگ جاتا ہے)

(۱۱) امام کے تحریمہ کے انتظار میں توقف کرنا یا امام کے ساتھ اس کو جس حالت میں پائے مل جانا

(۱۲) تکبیر تحریمہ کا پالینا۔

(۱۳) صفوں کو درست کرنا اور اس کی کشادگی کو بند کرنا۔

(۱۴) امام کے "سمع اللہ لمن حمدہ" کے جواب میں "ربنا لک الحمد" کہنا۔

(۱۵) بھول چوک سے محفوظ رہنا اور امام سے بھول ہونے لگے تو اس کو سبحان اللہ کہکر خبردار کرنا۔

(۱۶) حالت جماعت میں خشوع وخضوع کا حصول اور غافل کرنے والی چیزوں سے عموماً سلامتی

(۱۷) عادۃً جماعت کے موقع پر حسن ھیئت کا خیال رکھنا۔

(۱۸) فرشتوں کا جماعت کو چھا لینا۔

(۱۹) (امام کی وساطت سے) تجوید وارکان صلوۃ سے واقفیت۔

(۲۰) (قیام جماعت میں) شعار اسلام کا اظہار۔

(۲۱) اجتماعی طور پر عبادت اور تعاون علی الطاعۃ کے ذریعہ شیطان کی رسوائی اور سست وکاہل افراد میں جوش ونشاط پیدا کرنا۔

(۲۲) نفاق کی زد سے بچنا جو جماعت سے کترانے والے کی نشانی ہے اور اس الزام سے مامون رہنا کہ فلاں نے نماز ہی نہیں پڑھی۔

(۲۳) امام کے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کا جو دعا ہے دعا سے جواب دینا۔

(۲۴) یکجا بطور اجتماعی دعا وذکر میں مشغول ہوکر برکت سے منتفع ہونا۔

(۲۵) ایک گھر میں جمع ہوکر پڑوسیوں کا رات دن ملنا اور اس نظام کے ذریعہ ہر ایک کے حالات سے باخبر ہونا۔

یہ پچیس فائدے جماعت کی نماز کے ایسے ہیں جن سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی اور ان میں ہر ایک اپنی مخصوص فضیلت کی وجہ سے مستقل عبادت کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے پیش نظر ماننا پڑتا ہے کہ اجر کا دو چند اور زیادہ سے زیادہ ہونا مسجد کے نظام سے جکڑا ہوا ہے۔ بہرحال یہ وہ فائدے ہیں جو ہر جماعت کی نماز میں پائے جاتے ہیں وہ سری نماز (آہستہ قرأت والی) ہو یا جہری (کہ جس میں بلند آواز سے قرأت کی جائے) باقی دو فائدے ایسے ہیں جو جہری نماز کے ساتھ مختص ہیں، ایک امام کے پڑھتے وقت خموشی سے بغور سننا اور دوسرے امام کے آمین کہتے وقت مقتدی کا بھی آمین کہنا تاکہ فرشتوں کے آمین کہنے کی موافقت ممکن ہو سکے[1]

دلوں پر قبضہ | اسلام نے جبر وتشدد کی راہ چھوڑ کر حتی الامکان دلوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی ہے

---

[1] یہ تفصیل فتح الباری جلد ثانی صفحہ ۹۶ سے لی گئی ہے ۱۲۔

وہ نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی عبادت کرے جس میں دل کو ارتباط نہ ہو، بلکہ اُس نے یہ بھی پسند نہیں کیا کہ کسی درجہ میں انسان کا دل گرانی محسوس کرے، چنانچہ آپ احکام اسلام میں غور و فکر سے کام لیں گے تو معلوم ہوگا ہر ہر قدم پر ترغیب کی راہ اختیار کی گئی ہے، اور حتی الوسع جبر و اکراہ کو ترک کر کے تالیف قلوب سے کام لیا گیا ہے، ایک دفعہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

اعظم الناس اجرا فی الصلاۃ ابعدھم فابعدھم ممشی والذی ینتظر الصلاۃ حتی یصلیھا مع الامام اعظم اجرا من الذی یصلی ثم ینام۔

(بخاری باب فضل صلوۃ الفجر فی جماعۃ)

نماز میں اس شخص کو زیادہ ثواب ملتا ہے جو جس قدر دور سے چل کر آتا ہے اور جماعت کے انتظار میں جو شخص بیٹھا رہتا ہے اور امام کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے وہ ثواب میں اس سے بڑھا ہوا ہے جو جماعت کا انتظار نہیں کرتا اور نماز پڑھ کر سو رہتا ہے۔

لب ولہجہ پر بار بار غور کیجئے کس قدر شیریں اور دل نشیں ہے، کلام میں درشتی اور سختی کا کہیں پتہ نہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی موقعہ پر بھی سختی سے کام نہیں لیا گیا ہے، چونکہ اسلام میں ایک مستقل گروہ منافقین کا تھا جو مسلمانوں میں اپنے طرز عمل سے تساہل اور کاہلی کا پرچار کرتا تھا اس لئے موقع موقع سے ایسی صورت بھی عمل میں لانی پڑی ہے کہ ان کے کیف و نشاط میں فرق نہ آنے پائے، اور مومن کامل کے لئے تازیانہ کا کام دیتا رہے سُستی، بے رغبتی جب کبھی ان میں قدم جمانے لگے۔ تو اس طرح کی حدیثیں ان کو جھنجھوڑ دیں، چنانچہ فرمایا گیا۔

لیس صلاۃ اثقل علی المنافقین من الفجر والعشاء ولو یعلمون ما فیھما لاتوھما ولو حبوا ولقد ھممت ان آمر المؤذن فیقیم ثم امر رجلا یؤم الناس ثم اخذ شعلا من نار فاحرق علی من

فجر اور عشاء کی نماز سے بڑھ کر منافقوں پر اور کوئی نماز شاق نہیں ہے حالانکہ اگر ان کو ان نمازوں کی اہمیت کا علم ہو جائے تو جیسے بن پڑے دوڑے آئیں جی میں آتا ہے کہ مؤذن کو اقامت کا حکم کر دوں اور کسی سے کہوں کہ وہ لوگوں کی

لایخرج الی الصلاۃ لعد　　امامت کرے اور خود آگ کا شعلہ لیکر نکل پڑوں

(بخاری باب فضل صلوۃ العشاء فی الجماعۃ)　　اور ان کو پھونک ڈالوں جو اب تک جماعت کی نماز کے لئے نہیں نکلے ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔

والمراد لاتوا الی المحل الذی یصلیان　　مراد یہ ہے کہ وہ اس جگہ آئیں جہاں یہ دونوں نمازیں

فیہ وھو المسجد (فتح الباری ص۹۷ ج۲)　　پڑھی جاتی ہیں اور وہ جگہ مسجد ہے

نظم وارتباط، باہمی اتحاد، اور دلوں کے ملاپ کے لئے ضروری ہے کہ اجتماع کا مرکزی گھر ایسا ہو جہاں ہر خاص و عام بغیر کسی حیلہ بہانہ کے بآسانی اکھٹے سکیں اور اس کے لئے مسجدوں سے بڑھ کر اور کونسی جگہ ہو سکتی ہے جو خالص خدا کی ملکیت کہی جاتی ہے۔

مخصوص وقتوں کی فضیلت | اس میں شبہ نہیں کہ نسبتاً فجر، عشاء اور ظہر میں زیادہ دقتیں پیش آتی ہیں سردی کے موسم میں عشاء اور فجر کی نماز کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ نفس پر کتنا دباؤ ڈالنا پڑتا ہے، ٹھنڈی ہوا کا جھونکا، پانی کی بڑھی ہوئی سردی، راستہ کی تاریکی اور نفس کی ایسے موقع پر آرام طلبی، یہ ساری باتیں مل ملا کر حوصلہ کو زیر کرنا چاہتی ہیں، گرمی کے موسم میں صبح کی میٹھی نیند برسات کی کالی رات اور دوسرے عوارض فجر و عشاء میں رُہ دٹ بن کر سامنے آتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح کم و بیش ظہر کی نماز بہت کٹھن ہو جاتی ہے جبکہ دھوپ کی تمازت چہرہ کو جھلس رہی ہو، آسمان انگارے برسا رہا ہو، اور ہوا آگ لئے پھر رہی ہو، انسان طبعاً اس طرح کے موقع پر سُستی و کاہل بن جاتا ہے خطرہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ مرد مومن ان وقتوں میں مسجد جانے سے ہچکچائے اور جماعت کی نماز ترک کر بیٹھے، اس لئے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اہمیت کو ادق... پیرایہ میں ذہن نشین فرمایا اور سمجھایا کہ میٹھی نیند، تیز دھوپ، سخت تاریکی، اور گرمی و سردی تم کو دھوکہ نہ دے جائے، یہ نمازیں گو منافقین پر شاق ہیں کہ ان کو لذت ایمان میسر نہیں لیکن اگر ان کو ایمان کی شیرینی نصیب ہوتی اور پھر ان مشکل طلب وقتوں میں نماز باجماعت کے فضائل اور ان کے منافع کا علم و یقین

ہو جاتا تو پھر ہزار مجبوری ہوتی، یہ گھر میں بیٹھے نہیں رہتے، بلکہ جس طرح بھی یہ مسجد پہنچ سکتے، پہنچنے کی سعی پیہم کرتے۔

عشاء فجر اور ظہر کی نمازوں کے اوقات جیسا عرض کیا گیا ور النفس کے لئے تکلیف دہ ہیں اس لئے شریعت نے ان کے فضائل نسبتاً بڑھ کر بیان کئے اور گرانی طبع کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی گئی، ایک موقع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان وقتوں کی نماز باجماعت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا

لو یعلم الناس ما فی النداء والصف الاول ثم لم یجدوا الا ان یستھموا علیہ لاستھموا علیہ ولو یعلمون ما فی التہجیر لاستبقوا الیہ ولو یعلمون ما فی العتمۃ والصبح لاتوھما ولو حبواً	لوگوں کو اگر علم ہو جائے کہ اذان پکارنے اور صف اول کی نماز میں کیا اجر اور فضیلت ہے پھر وہ نہ پائیں تو قرعہ اندازی پر اتر آئیں اور اگر ان کو دوپہر (ظہر) کی نماز باجماعت کا علم ولقین حاصل ہو جائے اور پتہ لگ جائے کہ اس کا کیا ثواب ہے تو اس کے لئے دوڑ پڑیں اسی طرح صبح اور عشاء کی نماز کا جو درجہ ہے وہ معلوم ہو جائے تو یہ کھسکتے ہوں تب بھی آئیں۔
(بخاری باب فضل التہجیر الی الظہر)	

فضائل واجر کی کثرت | ان حدیثوں میں جس قدر ہم غور کرتے ہیں فضائل واجر کی کثرت کا اور بھی یقین ہوتا ہے، ستائیس گونہ ثواب کی تو وضاحت ہے مگر الفاظ حدیث کے ساتھ طرز بیان پر بھی نظر کیجئے تو معلوم ہو کہ اس متعینہ ثواب سے زیادہ بھی اور کوئی چیز ہے جس کو ہم نہیں سمجھتے یا وہ چیز ہماری عقل سے ماوری ہے۔ مگر ہے گرانقدر چیز جس کو حدیثوں میں "لو یعلمون ما فی" جیسے جملوں سے بیان کیا گیا ہے اور ذخیرۂ احادیث کے پیش نظر تو یہ فیصلہ بڑی حد تک ناگزیر معلوم ہوتا ہے، پھر یہ حدیث "صحیح مسلم" میں موجود ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بیان فرمایا۔

من صلی العشاء فی جماعۃ فکانما قام	جس نے عشاء کی نماز جماعت سے پڑھی تو گویا وہ
نصف اللیل ومن صلی الصبح فی جماعۃ	آدھی رات نماز میں کھڑا رہا، اور جس نے جماعت
فکانما صلی اللیل کلہ (مسلم باب فضل صلوۃ الجماعۃ)	سے صبح کی نماز پڑھی تو گویا اس نے پوری رات
	نماز میں گذاری ۔

اس حدیث کا اس کے سوا اور کیا منشا ہے کہ ان دو وقتوں کی جماعت کی نماز کا اجر آدھی اور پوری رات کی عبادت اور نوافل کے برابر ہے، اگر ایک طرف ان نمازوں کے لئے بندوں کے دلوں پر قبضہ کرنا مقصد ہے اور ان کو ساری دشواریوں سے گذار کر کیف وانبساط کے ساتھ جماعت میں لا کھڑا کرنا ہے تو دوسری طرف یہ بھی مقصد ہے کہ جماعت کی نماز کا ثواب ستائیس گونہ سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے جو مخلص بندہ کو درگاہ الٰہی سے ملتا ہے،

سختی اور نرمی کا معیار | ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھ لیا کہ اذان کے بعد وہ مسجد سے نکلا جارہا ہے تو آپ نے کس سختی سے فرمایا " اما ھذا فقد عصی ابا القاسم صلی اللہ علیہ وسلم " بلاشبہ اس نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی (مسلم باب فضل صلوۃ الجماعۃ)

پھر اسلام کی دلدہی پر قربان جایئے اس نے اس شخص کو بھی جماعت کے ثواب سے محروم نہیں رکھا جو گھر سے جماعت کی نیت سے نکلا مگر اس کو جماعت نہ ملی بلکہ اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمادی کہ جو شخص باضابطہ باوضو مسجد آیا اور اس کو جماعت نہ مل سکی تو بھی اس کو جماعت کا پورا پورا اجر ملے گا کوئی کمی نہ کی جائے گی ۔

(ابوداؤد باب فمین خرج یرید الصلوۃ فسبق بہا)

اس سے بڑھ کر یہ کہ معذورین کو رخصت بھی دی گئی ہے کہ اگر کسی کو عذر شرعی درپیش آجائے تو وہ جماعت سے غیر حاضر بھی ہوسکتا ہے گو عزیمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ خوشی خوشی مسجد کی حاضری اپنے اوپر لازم جانے۔

نظم جماعت کی حکمتیں | یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ شریعت نے جن باتوں کی جتنی تاکید کی ہے ان میں اسی

اندازہ سے مصالح اور حکم بھی پنہاں ہوتے ہیں جہاں تک ہر شخص کی نگاہ نہیں پہنچتی ہے، ہاں کچھ علماء راسخین فی العلم ہیں جو ایک حد تک حکمتوں کو پالیتے ہیں اور پھر ان کے ذریعہ اور لوگ بھی ان مصلحتوں اور حکمتوں کو جان لیتے ہیں۔

بلا شبہ جماعت کی نماز جس کی اس قدر اہمیت ہے بلا وجہ نہیں ہے خیر و برکت اور اجر و ثواب کی زیادتی اپنی جگہ، علاوہ ازیں اس میں بیش بہا فوائد، وقیع منافع اور ان گنت حکمتوں کا خزینہ پوشیدہ ہے، یہاں ان میں سے چند کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

"نماز کی جماعت" کے نام سے جو اجتماع ہوتا ہے، وہ ایسے گھر میں ترتیب پاتا ہے، جہاں ہر مسلمان کو برابر کا حق پہنچتا ہے، اصولی طور پر اس میں شرکت کی عام اجازت ہوتی ہے، دیہاتی، شہری، بڑے، چھوٹے، عالم اور غیر عالم سب مساوی درجہ رکھتے ہیں، پھر یہ کہ اس اجتماع کی شرکت باعث فخر و مباہات ہوتی ہے اور اس کثرت سے یہ اجتماع ہوتا ہے کہ لوگوں میں ایک رسم عام کی حیثیت قبول کر لیتا ہے، کوئی اپنی ہستی، کاہلی اور بے رغبتی سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہے تو یہ کوئی آسان بات نہیں، اس لئے کہ غیر حاضری کی شکل میں تلاش اور جستجو ہوگی۔ وجہ دریافت کی جائیگی اور معقول عذر نہ ہونے کی صورت میں لوگوں کی نگاہ میں وہ معتوب سمجھا جائیگا

کاہلی کا انسداد | اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کاہل، سست اور بے رغبت مسلمان کے اندر چستی پیدا ہوگی اور وہ بڑی حد تک اپنے کو مجبور پائے گا کہ مسجد آئے، جماعت میں شریک ہو، کیونکہ یہ امتحان گاہ ہے کہ کون لوگ ہیں جو دعوئی اسلام کے ساتھ ساتھ اپنے دلوں میں اسلام کی محبت و وقعت بھی رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت برضاء و رغبت بجالاتے ہیں اور کتنے وہ ہیں جو صرف ادعائے اسلام ہے اور در حقیقت ان کا دل دین کی محبت سے خالی اور ویران ہے اور رب العالمین کے ساتھ ان کا تعلق بے دلی، بے رغبتی اور دوری کا ہے

عالمانِ دین کا امتحان | اس اجتماع دینی میں چونکہ دین کے جاننے والے اور اس کے ماہر بھی ہوتے ہیں اور دین سے ناواقف اور جاہل لوگ بھی ہیں اس لئے عالمانِ دین اور احکام دین سے واقف

کاروں کا بھی امتحان ہے کہ یہ اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں یا نہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ان کو کس قدر احساس ہے۔

قبولیت دعا | یکجا ایک دو نہیں، پورے محلہ کے مسلمان کم از کم جمع ہوئے ہیں اور سب مل کر ایک عظیم الشان عبادت میں مشغول ہیں اور پھر اس طرح امید و بیم کے ساتھ ایک ہی مقصد کے لیے دل کی پوری گہرائی کے ساتھ پروردگار عالم سے دعا کرتے ہیں اور نماز کے ذریعہ اپنے خدا سے بہت قریب ہو کر کرتے ہیں، اس لئے توقع کامل ہے کہ رب العالمین دعا کو شرف قبولیت بخشے گا اور ان کو اجتماعی مقاصد میں کامیاب فرمائیگا۔

اعلائے کلمۃ اللہ | اللہ تعالیٰ کا امت محمدیہ سے جو یہ مقصد ہے کہ اس کا کلمہ بلند ہو، اسی کا بول بالا رہے اور دین اسلام اور ادیان باطلہ پر غالب ہو کر رہے تاکہ سارے انسانوں کو حقیقی امن و راحت میسر ہو تو بلا شبہ اس مقصد کی تکمیل بھی یک گونہ ہوتی ہے کیونکہ یہ ایک ایسی دستوری عبادت ہے جس کو دین سے بڑا گہرا تعلق ہے اور اس طرح یہ عبادت علی الاعلان ادا ہوتی ہے اور اعلائے کلمۃ اللہ کا ایک شعبہ انجام پذیر ہوتا ہے۔

شیطان کی رسوائی | شیطان جو بندۂ مومن کا کھلا ہوا دشمن ہے اور اُن کے آپس میں بُعد و تفرقہ ڈال کر اُن کو کمزور کرنا چاہتا ہے اور اُن کو ٹولیوں میں بانٹ کر اپنے قابو کا متمنی ہوتا ہے اس یکجائی عبادت سے اُس کی بھی پوری رسوائی ہوتی ہے اور اس طرح اس کا داؤ پیچ بنا بنایا ختم ہو جاتا ہے جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پاکیزہ اشارہ فرمایا تھا۔

ما من ثلثة فی قریة ولا بدو لا تقام فیھم	کوئی آبادی ہو یا جنگل جس میں تین آدمی رہتے ہوں
الصلوٰة الا قد استحوذ علیھم الشیطان	جب اس میں نماز قائم نہیں کی جاتی ہے تو شیطان اُن پر قابو پا لیتا ہے۔

ماحصل یہ تھا کہ جہاں جماعت ہو سکتی ہے وہاں جماعت ہرگز ترک نہ کی جائے کہ اس طرح شیطان کو موقع مل جائیگا اور پھر دین میں سستی کا دروازہ کھل جائیگا اور جماعت کا اہتمام جب خود مدسے

باقی رہیگا تو پھر شیطان کی رسوائی ضروری ہے۔

ترکیہ اور تالیف قلوب ابن العربی مالکیؒ نے مسجد ضرار والی آیت کے ضمن میں لکھا ہے اور جماعت کے ایک پہلو تزکیہ و تصفیہ اور تالیف قلوب پر کافی روشنی ڈالی ہے ان کے الفاظ چونکہ چھچے تلے ہیں اس لیے خود اس عبارت کو بھی ملاحظہ فرمائیں

یعنی انھم کانوا جماعۃ واحدۃ فی مسجد واحد فارادوا ان یفرقوا شملھم فی الطاعۃ وینفردوا عنھم للکفر والمعصیۃ وھذا یدلک علی ان المقصد الاکبر والغرض الاظھر من وضع الجماعۃ تالیف القلوب والکلمۃ علی الطاعۃ وعقد الذمام والحرمۃ بفعل الدیانۃ حتی یقع الانس بالمخالطۃ وتصفو القلوب من وضر الاحقاد والحسادۃ ولھذا المعنی تفطن مالکؒ حتی انہ قال لا یصلی جماعتان فی مسجد واحد لا بامامین ولا بامام واحد . . . . حتی کان ذلک تشتیتا للکلمۃ وابطالا لھذہ الحکمۃ وذریعۃ ان تقول من اراد الانفراد عن الجماعۃ کان لہ عذر فیقیم جماعۃ ویقدم امامہ فیقع الخلاف ویبطل النظام

(احکام القرآن ج۱ ص۱۳۲ و ج۱ ص۱۵۱)

سارے (مسلمان) ایک جماعت تھے اور ایک مسجد میں نماز پڑھتے تھے، منافقین نے چاہا کہ طاعت میں ان کا شیرازہ منتشر کردیں اور ان سے علیحدہ رہ کر کفر و معصیت کو فروغ دیں اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ خدائی نظم جماعت کی غرض و غایت یہ ہے کہ دلوں میں ارتباط، طاعت میں یکجہتی اور شیرازہ بندی قایم رہے تاکہ باہم انس و محبت پیدا ہو اور کینہ و کپٹ اور دنائت سے دل روشن اور پاک رہے اور اس معنی کو امام مالکؒ نے خوب سمجھا تا آنکہ انھوں نے یہ فرمایا کہ ایک مسجد میں دو جماعتیں نماز نہیں پڑھ سکتی ہیں نہ دو امام کے ساتھ اور نہ ایک امام کے ساتھ کہ یہ کلمہ کے تشتت اور اس کی حکمت بالغہ کے ابطال کا سبب بن جاتے اور تاکہ یہ اس بات کا ذریعہ ہو جاتے کہ ہم جماعت سے علیحدگی کے خواہاں کا اس کو عذر بنالیں کہ وہ ایک اور جماعت قایم کرے اور ایک دوسرا امام بنالے . . .

لہ یہ تفصیل حجۃ اللہ البالغۃ باب الجماعۃ جلد ثانی سے ماخوذ ہے ۱۲

(باقی آئندہ)

مسز سروجنی نائیڈو کی شاعری

(جناب حمیدہ سلطان صاحبہ)

آہ "سروجنی نائیڈو" جس کا نام لے کر جن کا ذکر کر کے میں بہت فخر محسوس کرتی تھی جنھوں نے اپنی ہمہ صفت موصوف ذات سے یہ واضح کر دیا تھا کہ "عورت" صرف مسند عیش کی زینت ہی نہیں ایوان ادب و سیاست میں بھی اونچی جگہ لے سکتی ہے۔

اب وہ اس دنیا میں نہیں لیکن اُن کے ادبی و سیاسی کارنامے اُن کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے بقول حافظ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ہم میں سے کون ایسا ہے کہ سروجنی دیوی کے نام اور اُس کے کاموں سے واقف نہ ہوگا اُن کی ایک ذات میں قدرت نے اتنی صفات جمع کر دی تھیں اور اس قدر اہم کام اُنھوں نے کئے ہیں کہ ان سب کاموں کی ہلکی سی جھلکی بھی دکھانی مشکل ہے

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

اُن کی مثال ایسی شمع کے مانند تھی جس کا اُجالا ایوان ادب اور ایوان سیاست میں یکساں تھا ایک جانب اُن کی والہانہ شاعری پر اہل دل سر دُھنتے تھے دوسری جانب سیاست داں اُن کے سیاسی شعور کے معترف تھے قدرت نے پوری فیاضی سے کام لے کر اُن کو شاعرانہ سوز سے لبریز دل بھی عطا کیا تھا اور ایسا بے مثل دماغ بھی جس کا

---

[۱] یہ مقالہ ۲۷ مارچ ۱۹۴۹ء میں ہارڈنگ لائبریری کے سالانہ زنانہ جلسہ میں پڑھا گیا تھا جس کو تھوڑی ترمیم کے بعد میں پھر پیش کر رہی ہوں۔

مقابلہ مرد بھی نہیں کر سکے صرف ہندوستان کے دلوں پر ہی سروجنی نائیڈو کا سکہ نہیں جما ہے بلکہ مدبرین یورپ کا تدبر بھی سروجنی کی بارگاہ نازمیں سربسجود ہے اس مایۂ ناز ہستی پر ہم عورتیں جتنا فخر کریں بجا ہے میں اس وقت صرف مسز سروجنی نائیڈو کی شاعری کا ہلکا سا خاکہ پیش کر رہی ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ ہند کی اس بلبل ہزار داستاں نے کیسے کیسے مدھر نغمے الاپے ہیں سروجنی نائیڈو ۱۸۷۹ء میں بنگال کے ایک معزز و باوقار خاندان میں بمقام حیدر آباد دکن پیدا ہوئیں ان کے والد کا نام رگھوناتھ چٹو پادھیائے ہے وہ ایک روشن خیال وعلم دوست بزرگ تھے نظام کالج کی بنیاد رگھوناتھ چٹوپادھیائے کے مقدس ہاتھوں نے رکھی اور تمام عمر وہ تعلیمی ترقی میں کوشاں رہے سروجنی دیوی کا اصلی وطن بنگال ہے لیکن حیدر آباد دکن میں ہر وقت مسلمانوں کے ساتھ میل جول رہنے کے باعث اُن کا تمام خاندان اُردو پر پورا عبور رکھتا ہے خصوصاً اُن کے مکرم والد کو تو اُردو سے عشق تھا اسی لئے اُردو سروجنی دیوی کے لئے بمنزلہ مادری زبان کے تھی اگر وہ چاہتیں تو اردو میں شعر کہہ سکتی تھیں لیکن جس زمانہ میں انھوں نے ہوش سنبھالا وہ دور ہندوستان کے ذہنی اور دماغی غلامی کا پرشباب زمانہ تھا اور اردو کو انگریزی کے مقابلہ میں کمتر سمجھا جاتا تھا اسی لئے سروجنی دیوی نے اپنے اظہار خیال کے لئے انگریزی زبان کو رہبر بنایا۔

اُن کی تعلیم ابتداءً میں انگریزی مدارس میں ہوئی وہ پورے ۱۲ سال کی بھی نہ تھیں کہ مدراس یونیورسٹی سے میٹریکولیشن کے امتحان میں کامیابی حاصل کی یہ سروجنی دیوی کی ذہانت وجودت کا پہلا کارنامہ تھا۔

سولہ سال کی عمر میں سروجنی دیوی کو سرکار نظام کی طرف سے وظیفہ دے کر انگلستان بھیجا گیا جہاں انھوں نے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کنگسی کالج میں حاصل کی اور اپنی غیر معمولی زبان سے اسی اجنبی زبان پر ایسا قابو حاصل کیا کہ انگریزی ان کی غیر ملکی لونڈی بن کر رہ گئی ہے۔

یہ حقیقت کسی دور میں بھی غلط ثابت نہیں ہوئی کہ شاعر انسان محض دل سے بن سکتا ہے مگر محض دماغ سے نہیں قدرت نے سروجنی کو دل سے بہتر دماغ اور دماغ سے بہتر دل عطا کیا تھا

اگر ان کے پہلو میں الوہیت کی ایک لافانی شمع روشن نہ ہوتی اگر ان کا دل نازک احساسات کا چھلکتا ہوا پیمانہ نہ ہوتا تو ان کا دماغ شعروں کی یہ مئے ناب نہ ڈھال سکتا سروجنی دیوی کی شاعرانہ حس نے ان کی علمی قابلیت کو ذوق اظہار بخشا اور عنفوان شباب میں ہی ان کی حسین و دلکش نظموں نے ہر صاحب ذوق انسان کو مسحور کر لیا ۱۸۹۸ء میں سروجنی دیوی کے شوہر ہونے کا فخر ڈاکٹر نایڈو کو حاصل ہوا اس غیر خاندانی رشتہ مناکحت سے سروجنی دیوی کی آزاد خیالی "بلندی" اور شاعرانہ اسپرٹ کا پتہ چلتا ہے۔

مسز سروجنی نایڈو نے اپنی عمر کی ۲۰ بہاریں دیکھنے سے قبل ہی اپنی نظموں کا ایک حسین مجموعہ "گولڈن تھریس" جس کا ترجمہ اردو میں "فرشی دہلیز" یا "آستان طلائی" ہو سکتا ہے شائع کیا یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا۔ نو عمر شاعرہ کو انگلستان کے شعرا کی صف اول میں جگہ دی گئی اس لئے پانچ سال بعد دوسرا اور پھر تیسرا مجموعہ "شکستہ پر" اور طائر وقت نکلا۔

"آستان طلائی" چونکہ سروجنی دیوی کی اس عمر کی تصنیف ہے جب زندگی کے نشیب فراز سے وہ زیادہ واقف نہ تھیں العز شباب کی کارفرمائیوں سے شاعرہ کو تمام عالم رنگین اور کائنات میخانہ بدوش نظر آتی تھی اس لیے اس مجموعہ کی تمام نظمیں ایک گاتی ہوئی جوانی کی دھڑکنیں ہیں خوشی و مسرت سے بھرپور!

لیکن یہی دھڑکنیں "شکستہ پر" اور "طائر وقت" میں سوز میں ڈوبی ہوئی ہیں کیونکہ شاعرہ کے سامنے اب دنیا کے تلخ حقائق آ چکے ہیں اور یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ زندگی رنگین و دلکش ہی نہیں بھیانک اور ویران بھی ہے عمر کے ساتھ ان کی نظر گہری ہوتی گئی قدرت نے قوت بیان حیرت انگیز طور پر سروجنی دیوی کو عطا کی تھی یہی وہ کمال ہے جو خدا ہر شاعر کو عطا نہیں کرتا ان کے افکار میں حرکت و تنوع ہے اور ساتھ ہی ساتھ بلندی اور جوش کا جذبہ بھی۔ اُن کا مشاہدہ بہت تیز ہے اور تخیل بہت بلند و رنگین زندگی سے سروجنی دیوی کی شاعری کا بہت گہرا ربط ہے اور یہ ان کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے اُن کے اس کلام میں بھی جو بالکل نو عمری کا ہے ہم کو

ایک لافانی جوش ایک دلی تڑپ ملتی ہے۔

گو ان کی شاعری کا چولا انگریزی ہے لیکن روح خالص ہندی ہے جیسے کسی راجپوت کلیانے بجائے ساڑی کے گون پہن لیا ہے وہی لجائی ہوئی کیفیت ہے اور وہی پیاری پیاری چھب ہے جو ہندی شاعری کے لئے مخصوص ہے۔

دیہاتی گانے نظم کرنے میں اس بے مثل شاعرہ کو کمال حاصل تھا اور ان گیتوں میں عوام کے جذبات کی عکاسی کرنے میں انھوں نے پوری فن کارانہ مہارت دکھائی ہے

بہت بڑی مشکل اُردو دنیا کے لئے سروجنی نائیڈو کی شاعرانہ خوبیوں کے سمجھنے میں یہ ہے کہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے اکثر شاعرانہ لطافتوں کا خون ہو جاتا ہے اور محدود واں طبقہ اصلی روح شاعری کو معلوم نہیں کرسکتا آفاقیت سروجنی نائیڈو کی نظموں کی بڑی خصوصیت ہے اور وہ رسیلا مدھر ترنم جو ایک شاعر نہیں شاعرہ ہی کے کلام میں ہوسکتا ہے سروجنی نائیڈو کی ہر نظم میں پایا جاتا ہے۔

یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ محبت شاعری کے تحرک کے لئے سب سے قوی جذبہ ہے اگرچہ اور جذبات بھی شعر کا لباس پہن سکتے ہیں لیکن جیسا یہ لباس محبت کے جسم پر موزوں ہوتا ہے اور کسی جذبے پر نہیں کھلتا محبت کے ایک سے زیادہ رنگ ہیں لیکن اپنا اصلی رنگ وہ ہندی شاعری یعنی ہندی گیتوں میں دکھاتی ہے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ مسز سروجنی نائیڈو کی زبان انگریزی لیکن خیال ہندی ہے ان کا دل حب وطن سے سرشار ہے ہندی شاعری میں محبت کا اظہار ہمیشہ عورت کی جانب سے ہوتا ہے اور یہ نسوانی محبت مجازی صورتوں میں اسی روحانی جذبے سے بھرپور نظر آتی ہے جو اور زبانوں میں صرف مذہبی شاعری میں دکھائی دیتی ہے۔ سروجنی نائیڈو کی شاعری میں جس محبت کی جھلک ہے وہ وہی محبت ہے جو مجازی سے روحانی کی طرف لے جاتی ہے جس میں روحانی رفعت اور مذہبی جوش دونوں موجود ہیں جو ہمیشہ اخلاق کے دائرے میں محصور اور مذہب کے احکام کے تابع رہتی ہے جس میں محبت کرنے

والی اپنے کو محبوب کی پجارن تصور کرتی ہے لیکن یہ نہ سمجھ لیجئے کہ مسز سروجنی نائیڈو کی شاعری محض ایک پریم بھگتی میں ڈوبی ہوئی سرشار عورت کی پکار ہے محبت کے علاوہ شفقت مادری حب وطنی، انسانی ہمدردی غرضکہ ہر قابل قدر جذبے پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔

ہر طبقے اور ہر نوع کے انسانوں کے خیالات کو اپنے شعروں میں ادا کرنے کا ہماری شاعرہ کو کمال حاصل ہے۔ ان کی نظموں میں پجاری کے بھجن سے لے کر بھکاریوں کے گیت سب نغمے موجود ہیں چند لفظوں میں پورے منظر یا واقعے کی تصویر وہ ہمارے سامنے کھینچ دیتی ہیں دس لالہ نفس بلبل کی زمزمہ سنجیوں پر اہل ہند اور اہل یورپ یکساں جھومتے تھے۔

ہندوستانی عورتوں کے متعلق کبھی طنزیہ اور کبھی حسرت بھرے لہجے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی زندگی صرف تین اہم واقعات پر مشتمل ہے یعنی پیدا ہوئیں بیاہ ہوا اور مرگئیں لیکن اس مقولے کو سروجنی دیوی کی بے مثل ذات نے غلط کر دکھایا وہ شاعرہ تھیں اور اس پایہ کی کہ جسکے مضمون کی بھر تانوں نے اپنوں اور بیگانوں کو یکساں مسحور کر لیا تھا۔ وہ خطیبہ تھیں اور ایسی جن کی تقاریر نے ایک عالم کو زیر و زبر کر دیا وہ سیاست داں تھیں اور اتنی بڑی کہ ان کے سیاسی شعور نے ایوان سیاست برطانیہ کے ستونوں کو ہلا ڈالا تھا۔

غالب کا یہ شعر سروجنی نائیڈو کی شاعری کی صحیح تعریف ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا ۔۔۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

بیان اللسان یعنی مکمل عربی اردو ڈکشنری۔

= مرتبہ :-

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی رسابق رفیق ندوۃ المصنفین) پچیس ہزار عربی لغات کا جامع ذخیرہ جسے جدید انگریزی ڈکشنریوں کے طرز پر ترتیب دیا گیا ہے اور ہر لغت سے متعلق وحدت و جمعیت تذکیر و تانیث باب وصلہ وغیرہ کی توضیح کی گئی ہے۔ ممالک عربیہ میں مستعمل جدید عربی الفاظ بھی اس میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور طلبہ مدارس عربیہ کے لیے خصوصیت کے ساتھ مفید ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات نوسو۔ مجلد قیمت آٹھ روپے۔ مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

امیر الامراء نواب نجیب الدولہ ثابت جنگ

اور

جنگ پانی پت

(از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی)

"در اندک زماں اسپ بہم رسانیدہ و در عرصہ یک سال جمعدار شدہ داسپاں و خیمہ و اسباب جمعداری پیدا کردہ[1]۔"

"مرد صاحب جوہر بود اگرچہ ناخواندہ مطلق لاکن عقل بسیار و اقبال داشت[2]"

نواب علی محمد خاں کو بادشاہ دہلی کی طرف سے سرہند کی صوبہ داری عطا ہوئی یہ اس پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے تو فوج کے سرداروں میں نجیب خاں بھی تھے چنانچہ سرکشان صوبہ سرہند بہادر ال زمیندار راٹھور جو بارہ ہزار ہتھیار بند سوار و پیادہ رکھتا تھا اس سے مقابلہ پڑا نواب کے ہمراہیوں میں نواب دوندے خاں بھی تھے انھوں نے نجیب خاں کی مردانگی اور شجاعت کے جوہر دیکھے فریفتہ ہو گئے آخرش نجیب خاں نے سرکشوں پر فتح پائی۔

نواب علی محمد خاں نے بھی ان کا عہدہ بڑھا دیا۔ ایک ہزار سوار و پیادہ کے افسر ہو گئے۔ اس کے بعد جو کٹھیر پر دوبارہ قبضہ نواب نے کیا تو اس میں بھی کارگذاری نجیب خاں نے دکھائی ۱۱۶۱ھ میں والدہ ضابطہ خاں کا انتقال ہو گیا تو نواب دوندے خاں رئیس بسولی نے اپنی دختر دُر بیگم سے اُن کی شادی کردی اور گھر داماد بنالیا اس تقریب پر ۱۴ محال ضلع بجنور نواب علی محمد خاں سے دوندے خاں نے کہہ سُن کر دلوائی اور ایک محال خود نواب علی محمد خاں نے پرگنہ جلال آباد عطا کی نواب دوندے خاں نے کچھ عرصہ بعد ان کو اپنی فوج کا رسالدار مقرر کر دیا اور دارانگر

---

[1] احوال نجیب خاں نجیب الدولہ بہادر مصنفہ سید نور الدین حسین خاں بہادر فخری (قلمی)، [2] سرگذشت نجیب الدولہ از نواب عبد السلام خاں رام پوری۔

کی تحصیل بھی سپرد کردی۔"

نجیب خاں نے اپنے رسالہ کے لئے کچی گڑھی اس جگہ بنوائی جو نجیب آباد کے شمال میں واقع ہے

دارانگر | نجیب خاں نے دارانگر (نزد امروہہ) کو اپنا مستقر قرار دیا اور تھوڑے عرصہ میں اپنے حسن لیاقت سے اس حصہ ملک کو ایسا بنایا کہ قرب وجوار کے لوگ کثرت سے وہاں آآکر آباد ہونے لگے۔ جب آبادی معقول ہوگئی تو حملہ رفاہِ عام کے کام انجام دینے کی طرف توجہ کی۔

تعلیمی حالت | جس دارانگر کے لوگ علم سے ناواقف تھے اُن کی اولاد کے لئے مکاتب اور درس گاہ کا انتظام کیا گیا۔"

برہان الملک محمد امین سعادت خاں نیشاپوری اور اس کے ہمشیر زادہ و داماد صفدر جنگ نے اودھ اور الہ آباد کے صوبوں میں خاندانی علماء کی جاگیریں شاہجہاں اور عالمگیر کے زمانہ کے مقرر شدہ مدارس اور مدرسین کے روزینہ بند کئے ضبطی جائداد سے اودھ کے علمی خاندان بے خانماں ہوکر سرگرداں پھر رہے تھے۔ چنانچہ اس کیفیت کو غلام علی آزاد بلگرامی ماثر الکرام میں یوں لکھتے ہیں۔

برہان الملک سعادت یار خاں نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبہ اودھ شد واکثر بلاد عمدہ صوبہ الہ آباد و نیز دارانگر جون پور و بنارس و غازی پور و کڑہ مانک پور و کوڑہ جہاں آباد وغیرہا ضمیمۂ حکومت گردید و وظائف و سیورغالات خانوادہائے قدیم و جدید یک قلم ضبط شد و کار شرفاء و نجباء بہ پریشان کشید و اضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم باز داشتہ در پیشہ سپاہ گری انداخت و رواج تدریس و تحصیل بہ آں درجہ نماند و مدارسے کہ از عہد قدیم معدن علم و فضل بود یک قلم خراب افتاد و انجمن ہائے ارباب کمال بیشتر برہم خورد۔[1]

---

[1] ماثر الکرام

غرضنکہ خانماں برباد گھرانے کے علماء نجیب خاں کی علم پروری کا شہرہ سن کر دارانگر پہنچے چنانچہ نجیب خاں نے درسگاہ میں اکثر کو لگا دیا ان میں سے زیادہ تر علمائے فرنگی محل کے شاگرد تھے[1]۔ غرضنکہ دارانگر روہیلکھنڈ میں قابل ذکر قصبہ بن گیا اس کا اثر یہ ہوا تمام روہیلکھنڈ میں مدارس و مکاتب نوابان روہیلکھنڈ نے قائم کردئے حافظ الملک حافظ رحمت خاں چچا خسر نجیب الدولہ نے عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا اس کے صدر مدرس بحر العلوم علامہ عبدالعلی فرنگی محلی تھے۔

علامہ شبلی لکھتے ہیں۔

"نجیب الدولہ نے دارانگر میں جو امروہہ کے قریب ہے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں نہایت کثرت سے طلباء نے تعلیم پائی۔ اس مدرسہ کے اکثر مدرسین (فرنگی محلی) خاندان کے شاگرد تھے[2]"

مغلیہ سلطنت | یہ وہ زمانہ تھا کہ حکومت مغلیہ اپنے ارکان سلطنت اور صوبہ داروں کے ہاتھوں تباہی کی راہ لگ چکی تھی۔ پیش پیش ابو المنصور خاں صفدر جنگ تھا ادھر وہ پٹھان جن کے باپ دادے کی حکومت ایک عرصہ تک ہندوستان پر رہی اور اس کی بنیادوں پر مغلیہ حکومت قائم ہوئی تھی باوجودیکہ کئی صدی تک مغلوں کے ہاتھوں پامال رہے مگر جوہر مردانگی پھر بھی باقی رہے موجودہ حالات کے پیش نظر انھوں نے پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور وقار کو دوبارہ برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

نوابان روہیلکھنڈ | روہیلکھنڈ کے علاقہ میں اودھ سے آئے ہوئے سردار افاغنہ سردار داؤد خاں کے متبنی نواب سید علی محمد خاں بہادر نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہادر نواب دوندے خاں بہادر نواب محمد خاں بنگش وغیرہ نے چھوٹی چھوٹی حکومتیں اپنے حسن تدبیر اور شجاعت کے بل بوتے پر قائم کرلیں صوبہ داروں کی طرح غداری نہیں کی بلکہ حکومت سے نوابی کے پروانہ حاصل کئے۔ نواب محمد خاں بنگش زیادہ علاقہ کا فرمانروا تھا فرخ آباد اس کا مستقر تھا اور اس کی زبردست حکومت تھی۔

---

[1] مضمون درس نظامیہ اور خاندانی فرنگی محل مولانا شبلی نعمانی۔ [2] درس نظامیہ اور فرنگی محل

کثیر التعداد روہیلوں کی آمد | نادر شاہ کے حملہ کے بعد سے روہیلکھنڈ میں سرداران افاغنہ کا زیادہ زور بندھ گیا تھا کثرت سے روہیلہ آ جمع ہوئے تھے۔

صفدر جنگ کو خلش | صفدر جنگ صوبہ دار اودھ نے اپنے پہلو میں نوابان روہیلکھنڈ کی طاقت بڑھتے ہوئے دیکھ کر اپنے وقار کے لئے خطرہ محسوس کیا اور ان کے تخریب کے درپے ہوا۔

صفدر جنگ اور نواب محمد خاں بنگش | اودھ سے دلی ہوتے ہوئے صفدر جنگ نانامئو گھاٹ واقع پرگنہ بلہور ضلع کانپور سے کشتیوں کا پل بنوا کر گنگا کو عبور کر رہے تھے نواب محمد خاں والی فرخ آباد کی طرف سے شمشیر خاں چیلہ گھٹہ بلہور کا عامل تھا اس نے کہا کہ جب تک اس نقصان کا جو فصل کو پہنچے گا معاوضہ نہ دیا جائے گا تب تک میری عملداری کے حدود میں صفدر جنگ کے خیمے نہ کھڑے ہونگے شمشیر خاں کا یہ حکم صفدر جنگ کی آتش رشک و حسد کو بھڑکانے کا اور زیادہ سبب ہوا پیچ و تاب کھا کر ایک سانڈنی سوار اس مضمون کا خط لکھ کر فرخ آباد کو بھیجا۔

"نواب نامدار سلامت شمشیر خود را در میان بکن دگر نہ آب نخواہد ماند"

نواب محمد خاں بنگش نے اپنے دیوان صاحب رائے کو جواب ترکی بہ ترکی لکھنے کا حکم دیا۔ منشی نے اس خط کی پشت پر لکھا۔

"نواب نامدار سلامت، ایں شمشیر مرداں در معرکہ میدان بے خون چشیدہ بہ میاں نمی آید"

صفدر جنگ نے چاہا کہ شمشیر خاں کا مقابلہ کرے لیکن اس کے مشیروں نے سمجھایا کہ اگر آپ لڑے اور فتحیاب ہوئے تو کہا جائے گا کہ چیلہ کے ساتھ لڑے اور اگر خدانخواستہ معاملہ نوعدگر ہو تو سخت رسوائی ہوگی چنانچہ صفدر جنگ لڑنے سے باز رہے مگر بنگشوں کا کانٹا ان کے دل میں کھٹکتا رہا پہلے تو فرخ آباد اور روہیلکھنڈ کے پٹھانوں کو آپس میں لڑا دینا چاہا مگر یہ داؤں زیادہ کامیاب نہ ہوا

۳ شوال ۱۱۶۱ھ کو نواب علی محمد خاں فرمانروائے روہیلکھنڈ اور ۲ ذیقعدہ ۱۱۵۶ھ کو محمد خاں بنگش انتقال کر گئے۔ صفدر جنگ نے میدان خالی دیکھ کر کہ پٹھانوں کے بڑے سردار دنیا سے رخصت ہو چکے ان کے پسماندوں کو ٹھکانہ لگا دینے کا موقعہ اس سے بہتر نہ ملے گا چنانچہ

اس نے قطب الدین محمد خاں نبیرۂ عظمت اللہ خاں سابق ملازم نواب سید علی محمد خاں کو کٹھیر کی سند حکومت دے کر اس لئے بھیجا کہ وہ بقیہ نوابان روہیلکھنڈ کی اٹھتی ہوئی طاقت کو پامال کر دے چنانچہ قطب الدین محمد خاں دہام پور کے قریب نجیب خاں اور دوندے خاں سے مقابل ہوا جس میں خود مارا گیا اس کے بعد صفدر جنگ نے محمد خاں بنگش کے صاحبزادے قائم خاں کو ہموار کر کے لالچ دے کر روہیلکھنڈ پر حملہ کرا دیا سیدھے سادھے پٹھان بہکاوے میں آ گئے اور اپنے بھائیوں کے خلاف قائم خاں صف آرا ہوئے مگر وہ بھی نواب دوندے خاں وغیرہ کے ہاتھوں بدایوں کے قریب کام آئے ان کے پسماندوں کے ساتھ صفدر جنگ نے یہ سلوک کیا کہ ان کے ملک پر خود قبضہ کر لیا۔ اور اپنی طرف سے فرخ آباد کا حاکم نول رائے کایستھ کو مقرر کیا۔ جس نے اپنا دارالصدر قنوج کو بنایا بجائے آشتی کے ظالمانہ طریقہ اختیار کیا پٹھان برافروختہ ہو گئے تو قائم خاں مرحوم کے بھائی احمد خاں بنگش نے اپنے ہم قوم پٹھانوں کی امداد سے نول رائے پر ایسا حملہ کیا کہ وہ ۱۱۶۳ھ میں بمقام سمدھن پرگنہ تالگرام میں شکست کھائی اور جان کو بھی کھو بیٹھا کسی نے تاریخ کہی[1]

روان کرد خون یلاں جو بہ جو ادا کرد حق نمک مو بہ مو

نزیزداں رسید ندو رد ملک بیارد بردے نول سرخ رو[۱۱۶۳]

راجہ نول رائے کے مرنے کے بعد صفدر جنگ نے سورج مل جاٹ رئیس بھرت پور کو اپنا ہمنوا و مددگار بنا کر فرخ آباد پر حملہ آور ہونا چاہا مگر روہیلکھنڈ کے نوابوں نے احمد خاں کی امداد کی اور ماہرہ کے قریب صفدر جنگ اور سورج مل نے منہ کی کھائی شکست خوردہ دلی لوٹے مگر احمد خاں بنگش نے مفرور صفدر جنگ کے علاقہ پر حملہ بول دیا۔ لکھنؤ پر محمود خاں ابن احمد خاں قابض ہو گیا الہ آباد کا خود احمد خاں نے محاصرہ کیا صفدر جنگ کو اپنے صوبہ کے جانے کے لالے پڑ گئے تو اس نے مرہٹوں سے خط و کتابت شروع کی اور سندھیا ملکر کو ۳ ہزار روپیہ روزانہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے اپنی امداد پر بلایا اور سورج مل کو ۲ ہزار روپیہ یومیہ کے بھاڑے پر ہمراہ لیا۔ سعد آباد اور جلیسر میں یہ لشکر

---

[1] تاریخ اودھ حکیم الغنی رام پوری

جمع ہو گئے اور احمد خاں بنگش کے عامل شادل خاں ان سے تاب مقابلہ نہ لا سکا شکست کھا گیا اس واقعہ کی خبر سن کر نواب احمد خان بنگش الہ آباد سے فرخ آباد آیا اور نوابان روہیلکھنڈ نواب حافظ رحمت خاں نواب دوندے خاں نواب سعد اللہ خاں خلف نواب علی محمد خان سے امداد کا طالب ہوا دوندے خاں کی طرف سے رسالدار نجیب خاں لسبولی کی فوج لے کر نواب فرخ آباد کی امداد کے لئے پہنچا اور لشکر عظیم کے مقابل ہوا نجیب خاں نے وہ داد شجاعت دی کہ نقشہ جنگ ہی پلٹ گیا صفدر جنگ نے منہ کی کھا کر نواب سے صلح کر لی [1]

وقائع | محمد شاہ بادشاہ دہلی کے مرنے پر اُس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ احمد شاہ شاہ درانی سے معرکہ طے کر کے واپس آرہا تھا راہ میں باپ کے مرنے کی خبر ملی دہیں اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا

احمد شاہ درانی نے پہلی مرتبہ ہندوستان پر یہ حملہ کیا تو بمقام لاہور صفدر جنگ احمد شاہ بادشاہ کے ساتھ شریک معرکہ رہا۔

جاوید خاں خواجہ سرا مخاطب بہ نواب بہادر نے مشورہ دیا تھا کہ شاہ دُرانی سے جنگ مول لینے کے بجائے صلح کر لینا مناسب ہے چنانچہ بادشاہ دہلی نے ملتان اور لاہور دونوں صوبہ احمد شاہ دُرانی کو دے کر صلح کر لی شاہ درانی اپنی طرف سے معین الملک میر منو پسر قمرالدین خان کو ان دونوں صوبوں کا حاکم بنا کر افغانستان کو روانہ ہو گیا۔ صفدر جنگ نے شاہ دہلی کو اس مبارک موقعہ پر نذر پیش کی تو فرط مسرت میں بادشاہ نے فرمایا۔

" سلطنت بہ ما وزارت بہ شما مبارک "

وزارت | صفدر جنگ وزارت پر سرفراز ہوئے مگر ملہار راؤ ہلکر کو یہ کہہ کر اپنے ہمراہ کیا تھا کہ شاہ دُرانی کو پنجاب سے خارج کرنے کے بعد پنجاب کے علاقہ پر تم ہم اپنا تسلط جما لیں گے یہ منصوبہ جاوید خاں کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ ہلکر کو کچھ پٹی پڑھا کر نظام الملک آصف جاہ کا بیٹا فیروز جنگ اپنے ہمراہ دکن کو لے گیا ادھر صفدر جنگ نے جاوید خاں کو ضیافت کے بہانے اپنے یہاں بُلا کر علی بیگ خاں

---

[1] اخبار الصنادید جلد اول

شتاب جنگ کے ہاتھوں کام تمام کرا دیا بادشاہ نے یہ حال سنا اُس کو سخت ناگوار گذرا اور بھی اس کے علاوہ صفدر جنگ سے حرکتیں ظہور میں آئی تھیں آخر ش ان کو وزارت سے معزول ہی کر دیا گیا اور فیروز جنگ کے بیٹے غازی الدین نے خفیہ ریشہ دوانی کرنی شروع کی بادشاہ نے انتظام الدولہ جو قمر الدین خاں کا داماد اور بھانجا تھا قلمدان وزارت اس کو سنہ ۱۷۵۳ء میں عنایت کیا۔ صفدر جنگ نے بادشاہ کے حضور میں درخواست پیش کی کہ مجھکو اودھ جانے کی اجازت دی جائے بادشاہ نے درخواست منظور کرلی صفدر جنگ چند روز تو دہلی کے ارد گرد پھرتا رہا کہ بادشاہ پھر مجھ کو بلا لے گر بادشاہ کو اس کی سفلہ پروری سے نفرت تھی اس نے جب دیکھا کہ شہر میں انتظام الدولہ اور غازی الدین کا پورا تسلط ہو گیا اور کوئی تدبیر کارگر ہوتی نظر نہیں آتی اور سب سے اندوہگیں صورت یہ پیش آئی کہ وزارت اُن سے چھن گئی پھر تو حکومت کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے لگے اور راجہ سورج مل اور صوبہ بادلی کھاری پور کا فوجدار اندرگشائیں وغیرہ کو اپنی حمایت کو بلوایا اور ملہار راؤ ہلکر اور جیا سندھیا کو مدد کے لئے طلب کیا اس کے ساتھ ہی نوابان اودھ کو بھی امداد کے لئے لکھا۔

فرمان شاہی | شاہ دہلی نے انتظام الدولہ کو حکم دیا شاہی فرمان اُمرا کو بھیجے جائیں چنانچہ نواب حافظ رحمت خاں اور نواب دوندے خاں کی طلبی و استعانت کے لئے حکم جاری کیا۔ دوندے خاں نے نجیب خاں سے کہا کہ جاٹ اور مرہٹے صفدر جنگ کے طرفدار ہیں اگر وہ ان دونوں کو ہمارے ملک کی طرف متوجہ کر دے تو بہت کچھ نقصان پہنچا سکتا ہے دوسری طرف بادشاہ اور انتظام الدولہ ہماری کوئی امداد و اعانت نہیں کر سکتے رسالدار نجیب خاں نے کہا نواب صاحب صفدر جنگ اور بادشاہ کا مقابلہ نوکر اور آقا کا مقابلہ ہے اس سے صفدر جنگ اگر راستی پر بھی ہو پھر بھی باغی اور نمک حرام کہلائیگا اور جو بھی اس کے شریک ہوں گے وہ بھی اس الزام سے نہیں بچ سکتے بس مناسب یہ ہے کہ شقہ شاہی کی تعظیم کی جائے اور صفدر جنگ کو نقصان رسانی پر آمادہ ہونے کا موقع نہ دیا جائے جس کی آسان تدبیر یہ ہے کہ میں تمام فوج کو لے کر دھرنہ دیتا ہوں اور دھرنہ کا باعث دو مہینے سے تنخواہ نہ ملنے کا بہانہ ٹھہراتا ہوں جب اس دھرنہ کی خبر دور دور مشہور ہو گی تو صفدر جنگ

کو پھر آپ سے کوئی وجہ شکایت نہ ہوگی کیونکہ جب تمام فوج ہی خود مختار ہوگئی تو پھر کسی کی مدد یا مخالفت کیا کر سکتے ہیں چنانچہ اس مشورہ پر عملدرآمد ہوا اور نجیب خاں قلعہ سے باہر نکل کر توہین سر کرتے رہے اسی اثناء میں صفدر جنگ کا خط پہنچا ایلچی کو روک لیا گیا اور نہ نواب دوندے خاں کے پاس قلعہ میں جانے دیا اور نہ خود اس کی طرف التفات کی بلکہ وہ یہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر اُلٹا واپس چلا گیا۔

شقہ شاہی | مردمان بادشاہ معہ علماء برائے طلب افغانان رفتند و از طرف بادشاہ پیغامہائے امید و بیم رسانیدند[۱]۔

غرضکہ میر مناقب شاہی شقہ لے کر پہنچا۔ نجیب خاں تعظیم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شاہی مراسلہ کو سر پر رکھا اور میر مناقب سے کہا کہ تمام فوج میرے قبضہ میں ہے لہذا اس فرمان شاہی کا میں ہی صحیح مخاطب ہوں اور تعمیل حکم کے لئے بسر و چشم حاضر۔ یہاں سے اس کو احترام و اکرام سے سرداران روہیلہ کی مجلس میں پہنچایا جہاں حافظ الملک اور دوندے خاں وغیرہ جمع تھے پھر خود نجیب خاں پہنچ گئے میر مناقب شاہی سے حافظ رحمت خاں نے کہا مولوی صاحب ہم صفدر جنگ سے معاہدہ کر چکے ہیں کیسے عہد شکنی کریں مگر نجیب خاں بول اُٹھے میں جو کچھ کہہ چکا ہوں وہی ہوگا۔

سید نورالدین حسین خاں بہادر فخری لکھتا ہے کہ

"دریں اثنا نجیب خاں کہ دراں مجلس حاضر بود آہستہ بہ مولوی گفت کہ مرا می بری من بہ یک ہزار نفر شریک می شوم مولوی بہ بانگ بلند گفت جزاک اللہ و رحمت خدا بر پدر تو باد[۲]۔"

دہلی کی روانگی | حافظ الملک اور دوندے خاں نجیب خاں کا ارادہ حتمی دیکھ کر خاموش ہو گئے دوسرے دن بسولی کے کئی ہزار نفوس نجیب خاں لے کر دہلی روانہ ہوگئے راہ میں جس قدر خانماں برباد لوگ ملتے گئے ان کو فوج میں نوکر رکھتے ہوتے دہلی پہنچے تو ان کے جھنڈے تلے بیس ہزار کا مجمع تھا[۳]۔

شعبان ۱۱۶۶ھ کو دربار شاہی میں اطلاع پہنچی کہ بسولی کا رسالدار نجیب خاں مع کثیر التعداد جاں نثاروں کے حاضر خدمت ہوا ہے۔

---

[۱] احوال نجیب خاں فخری، [۲] احوال نجیب الدولہ (قلمی)، [۳] نجیب الدولہ از مولانا محمد شاہ خاں

ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل

(۶)

(از جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف دہلے)

نواب صاحب کا تحمل اور ضبط ضرب المثل ہے۔ اپنے بھائی تاباں کی گالیاں کھاتے تھے اور ہمیشہ باپ کی جگہ سمجھتے تھے اور بے حد احترام کرتے تھے۔ مرزا جمیل الدین عالی بیان کرتے ہیں کہ ایک نوجوان شاعر نے نواب صاحب سے ملاقات کی نواب صاحب نے فرمایا کہ بیٹا کچھ سناؤ۔ صاحبزادے فرمانے لگے کہ میں اس وقت موڈ میں نہیں ہوں فرمایا کہ بیٹا میرا مکان لال دروازے میں ہے اور مجھے سائل کہتے ہیں جب موڈ میں ہو تو میرے غریب خانے پر آکر کچھ سنا دینا۔

بیباک شاہجہاں پوری جو حضرت داغ کے ارشد تلامذہ تھے اور شاہجہاں پور کے محترم بزرگ اور سجادہ نشین تھے یہ سائل صاحب سے پہلے گروہ میں تھے ان کے ایک شاگرد محبی شمس الدین خاں شمس شاہجہاں پوری نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ جناب بیباک مرحوم سائل صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا اس طرح ذکر کرتے تھے کہ میں دارالعلوم دیوبند جاتے ہوئے۔ سائل صاحب کی ملاقات کی نیت سے دہلی اُترا۔ سرائے میں قیام کیا۔ اس کے بعد نواب صاحب کے مکان پر گیا۔ میری سج دھج بالکل طالبعلمانہ تھی اور نواب صاحب نہایت وجیہ و شکیل ہونے کے ساتھ رئیسانہ ٹھاٹھ رکھتے تھے۔ میں ان کے سامنے جاکر خاموش بیٹھ گیا۔ نواب صاحب نے دیگر حاضرین واحباب سے فارغ ہوکر مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے آپ کا شہرہ سُنا تھا۔ مگر کبھی زیارت کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ دیوبند جارہا ہوں آپ کی زیارت کی غرض سے دہلی اُترا ہوں اور آپ کا کلام سُننے کا بیحد مشتاق ہے۔ نواب صاحب نے گھر میں سے بیاض منگائی اور ایک غزل سنائی بیباک صاحب ساری غزل سن گئے اور قصداً داد نہ دی بالکل خاموش رہے۔ اس کے بعد نواب صاحب نے فرمایا

نواب آپ اپنا کلام سنائیے۔ بیباک صاحب نے کہا میں تو ایک طالب علم ہوں شعر کہنا کیا جانوں۔
نواب صاحب نے ملازم سے کہا کہ پھاٹک بند کر دو۔ یہ اب شعر سنائے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتے
اللہ رے جوہر شناسی! نواب صاحب فرماتے ہیں کہ یہ نا ممکن ہے کہ تم شاعر نہ ہو۔ تم کو اپنا کلام سنانا پڑیگا
بیباکؔ صاحب نے کہا کہ تعمیل حکم کے لئے کچھ عرض کرتا ہوں میں پانچ رنگ میں کہتا ہوں۔ غالبؔ میرؔ وغیرہ
جس رنگ کا کلام آپ سننا چاہیں عرض کر دوں نواب صاحب نے غالبؔ کے رنگ کی فرمائش کی انھوں
نے غزل پڑھی مقطع نہیں پڑھا۔ اسی طرح نواب صاحب نے پانچ رنگ کی پانچ غزلیں سُنیں اور
داد دیتے رہے۔ بیباک صاحب نے پانچویں غزل میں جب مقطع پڑھا تو نواب صاحب کھڑے ہوکر
لپٹ گئے اور فرمایا کہ میرے بھائی ہو کر تم نے مجھ پر یہ ظلم کیا۔ بتاؤ کہاں ٹھیرے ہو اور ساتھ ہی ملازم کو حکم
دیا کہ گاڑی لاؤ۔ گاڑی تیار ہوئی۔ خود ساتھ جاکر سرائے سے سامان اٹھوا کر لائے اور بڑی گرم جوشی سے
میزبانی کی۔

سندیلہ ضلع ہردوئی میں سید التفات رسول صاحب ہاشمیؔ کے اہتمام سے نہایت پر شکوہ
سالانہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا اس میں تمام ہندوستان کے شعرا شریک ہوتے تھے۔ لکھنؤ کا قرب ہونے کی
وجہ سے بالخصوص شعراء لکھنؤ بہت زیادہ شریک ہوتے تھے۔ سائلؔ مرحوم بھی کئی مرتبہ تشریف لے گئے
اور ہر مرتبہ صدارت کی کرسی پر جلوہ افروز ہوئے سندیلہ کی شرکت مشاعرہ کے بارے میں خمخانۂ جاوید
کے مؤلف نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے کہ:-

"سندیلہ کی بزم سخن یعنی مشاعرہ جناب ہاشمیؔ اس بات پر شاہد ہے کہ اُدھر تمام شعرائے لکھنؤ
کی ٹولی اُدھر صرف ایک مرد میدان سخن جناب سائلؔ تھے۔ لیکن پالا آپ ہی کے ہاتھ رہا اور
جماعت بندی کے ہوتے ہوتے بھی آپ ہی کی غزل پر بے اختیار ہو کر ہر مخالف اور موافق نے
داد دی۔"

بیباکؔ مرحوم اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اسم با مسمّٰی تھے نہایت مغلوب الغضب اور بیباک
تھے ایک مرتبہ سندیلہ کے مشاعرے میں انھوں نے سائلؔ صاحب کو کچھ ایسے الفاظ کہہ دیئے جو برادرانہ نقطۂ نظر

سے نامناسب تھے مگر سائل صاحب نے ان کی پیرزادگی اور تقدم تلمذ کی وجہ سے سر جھکا لیا اور خاموشی کے ساتھ پی گئے حالانکہ سائل صاحب کی وجاہت اور شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ جب جناب نوح ناروی کی صاحبزادی کی شادی ۱۹۱۹ء میں ہوئی اور یہ بھی اس تقریب میں شریک ہونے کے لئے نارہ ضلع الہ آباد تشریف لے گئے تو تفریحاً بازار جاتے وقت جناب نوح اور دیگر حضرات ان کے ساتھ مؤدب چلتے تھے جس طرف چلے جاتے تھے لوگ کھڑے ہو جاتے تھے اور ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے تھے تعجب کے ساتھ آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے کہ یہ کوئی بہت بڑا حاکم ہے جس کے ساتھ ہمارا تعلقہ دار رئیس بھی مؤدب ہو کر چلتا ہے۔[1]

قاری عباس حسین صاحب کا ایک مضمون رسالہ چمنستان دہلی نومبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا ہے اس میں سے کچھ اخذ کر کے درج ذیل کرتا ہوں:-

"مغلئی خدوخال۔ میدا شہاب رنگ۔ دراز قد مگر موزوں۔ سڈول بدن۔ کسرتی ہاتھ پاؤں سر بڑا۔ سر پر چوگوشیہ لیسدار ٹوپی۔ پیشانی بلند۔ سینہ چوڑا۔ سفید ڈن کا انگرکھا۔ آڑا پاجامہ پاؤں میں کامدار سلیم شاہی جوتی۔ حد درجہ وجیہ و شکیل۔ اطوار میں شرافت گفتار میں شیرینی یہ تھا آج سے چالیس سال قبل اُن کا حلیہ۔ میرا بچپن تھا اور نواب صاحب کی جوانی۔ والد ماجد

---

[1] بروایت جناب نوح ناروی

اس تقریب کی شرکت سے قبل حضرت سائل مرحوم نے پٹنہ سے جناب نوح ناروی کو جو خط لکھا تھا وہ مؤخر الذکر نے اپنی خاص عنایت سے مجھے مرحمت فرمایا ہے اس کی نقل درج ذیل کرتا ہوں۔

درگاہ ارزاں شاہ ۱۲ر اپریل ۱۹۱۹ء

نوح بھائی۔ تسلیم۔ میں اسی وقت مع الخیر پٹنہ پہنچا ہوں۔ بھائی احسن صاحب کو یہاں موجود پایا۔ الحمد للہ کہ صعوبت سفر کا اثر کچھ طبیعت پر ہنوز گراں نہیں پایا حالانکہ تکلیف شب کو غل سا ئے ہیں اُٹھائی ہے یہاں کی کیفیت مفصل آپ سے انشاء اللہ تعالیٰ زبانی عرض کی جائیگی غالباً پرسوں میں اور احسن بھائی ساتھ ہی یہاں سے روانہ ہوں۔ ۱۵ر تاریخ سراتھو کے اسٹیشن پر سواری کا انتظام آپ کر دیں یہ نہیں کہا جا تا کہ کس ٹرین سے پہنچنا ہوگا۔ باقی خیریت

آثم ابوالمعظم سراج الدین احمد خاں سائل

قاری سرفراز حسین صاحب عزمی کے ساتھ نواب صاحب کی محلسرا میں حاضر ہوا۔ دربار لگا ہوا تھا بیچ میں ایک آرام کرسی تھی۔ اردگرد مونڈھے۔ دوست احباب بیٹھے ہوئے تھے نواب صاحب کے آگے پیچوان لگا ہوا تھا۔ نوکر پیچھے کھڑے تھے نواب صاحب مرحوم شاعر تو تھے ہی لیکن وہ شاعر سے زیادہ ایک انسان تھے وہ دہلی کی تہذیب و تمدن کا آخری نمونہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دہلی میں اب مجھے شاہانہ عز و وقار، پرانی تہذیب و تمدن کا علمبردار پرانی وضعداریوں کا حامل کوئی نظر نہیں آتا۔ بے مثل خطاط اور خوشنویس تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صفحۂ قرطاس پر موتی بکھرے ہوتے ہیں۔ کڑھائی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ پتنگ بازی بھی کی ہے۔ بے مثل تکل بناتے اور ڈور سونتتے تھے۔ اچھا کھانا کھاتے اور خوب پکاتے تھے اور کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ ان میں وہ تمام کمالات تھے جو اس دور کے رؤسا کے طرۂ امتیاز تھے۔ جس شخص کی نعش پر ہم نے ۱۲ ستمبر ۱۹۴۵ء کو قبل دوپہر منوں مٹی ڈالی ہے وہ کون تھا۔ پھولوں کی سیج پر سونے والا۔ اطلس و دیبا کا لباس پہننے والا۔ باشکوہ و پُر وقار الشان جب کبھی کسی مشاعرے کسی مجلس کسی صحبت میں گیا اپنی سج دھج اپنے رکھ رکھاؤ اور اپنی خوش بیانی کی وجہ سے سب میں ممتاز رہا۔

راقم الحروف غم نصیب واصف کے بزرگوں سے نواب صاحب مرحوم کے مراسم قدیم تھے مگر تلمذ کے ارادے سے جنوری ۱۹۲۶ء میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا کہ بیٹا میں تو خود اس قابل ہوں کہ تمہارے باپ سے اصلاح لوں تم مجھ سے اصلاح لینے آتے ہو۔ اس زمانے میں نواب صاحب کی عمر ۶۲ سال کے قریب تھی۔ ڈاڑھی کے بال بھورے مائل بہ سرخی تھے۔ وجاہت اور شوکت جسمانی میں ان کے ہم پلہ بہت کم لوگ دیکھے گئے ہیں۔

باوقار اور پُرشوکت چہرہ۔ سرخ و سفید رنگ۔ بھری ہوئی سنہری ڈاڑھی۔ چوڑا چکلا سینہ۔ اونچا قد۔ بڑے بڑے ہاتھ۔ سر بڑا اور چوڑے چکلے چہرے کی مناسبت سے بڑے بڑے کان۔ آنکھوں میں کشش لہجے میں نرمی اور گفتگو میں انتہائی مٹھاس۔ شاگردوں کو بالعموم بیٹا! کہہ کر

خطاب کرتے تھے۔

اکثر سبز اور کبھی سرخ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی جس پر طلائی لیس ہوتی تھی استعمال فرمایا کرتے تھے قدیم تراش کا ململ، تن زیب، چکن وغیرہ کا انگرکھا اور چست دوہرے لٹھے کا آڑا پاجامہ ان کے ڈیل ڈول پر نہایت زیب دیتا تھا ایک مرتبہ فرمایا کہ بیٹا! تمکو معلوم ہے کہ میں دوہرے لٹھے کا پاجامہ کیوں پہنتا ہوں اس میں ایک فائدہ تو یہ ہے کہ سرد موسم میں کچھ خنکی سے امن رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کہیں بارش وغیرہ میں کپڑے بھیگ جائیں تو اکہرے لٹھے میں سے بھیگ جانے کی وجہ سے جسم کا رنگ ظاہر ہوتا ہے اور ستر محفوظ نہیں رہتا۔ تیسرے یہ کہ اگر اوپر سے ایک نہ کھونچ لگنے کی وجہ سے کہیں پھٹ جاتے تو بے ستری نہ ہو۔ اللہ اللہ شرم وحیا اور ستر کا لحاظ ہمارے اسلاف میں کس قدر تھا! آج کے انسان کی انسانیت اتنی دردمند اور ناتوان ہو چکی ہے کہ ناتمام اور ادھورا لباس بھی بار معلوم ہونے لگا ہے۔

فراخدل عالی ظرف اور انتہا درجے کے متحمل مزاج انسان تھے۔ علم عروض کے ماہر تھے شعر وسخن کی تمام اصناف پر قادر تھے۔ چوگان اور شہسواری میں بھی مشہور تھے۔ کڑھائی کی بے مثل مہارت تھی۔ چنانچہ آخر زمانے میں اکثر اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں کاڑھ کر پہنا کرتے تھے تپیچی کے طرز پر رنگین تاگے سے بغیر خاکے کے بہت عمدہ پھول بنایا کرتے تھے۔ معذور ہو جانے کے بعد جب تک نظر قایم رہی کتب خانہ رحیمیہ کے سامنے رکھشا میں یہی مشغلہ رہتا تھا۔

سائل صاحب سے پہلے بالعموم مشاعروں میں ترنم سے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ یہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مشاعروں میں ترنم کی ابتدا کی۔ نہایت بلند بااثر آواز تھی اور آواز میں ایک خاص دردانگیزی تھی آج تک ان کا طرز ترنم کوئی پیدا نہ کرسکا جس مشاعرے میں سائل صاحب ہوتے تھے صدر انھیں کو بنایا جاتا تھا چنانچہ ہندوستان کے آل انڈیا مشاعرے زیادہ تر انھیں کی صدارت میں ہوئے ہیں۔ قدرتی طور پر ان کے حسن وجمال اور شان وشوکت کا رُعب مجمع پر ایسا پڑتا تھا کہ سناٹا چھا جاتا تھا۔ اور غزل پڑھتے تھے تو ہر طرف سے صدائے تحسین بلند ہوتی تھی۔ بڑے بڑے

معرکے کے مشاعروں میں خراج تحسین حاصل کر لینا سائل صاحب ہی کا حق تھا۔

خوش نصیب واصف کی آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھا ہے کہ مدرسۂ امینیہ دہلی کے سالانہ جلسے منعقدہ ۲۵ محرم ۱۳۳۶ھ م ۱۲ نومبر ۱۹۱۷ء میں سائل صاحب شیر کی طرح گرجدار آواز میں کھڑے ہوئے نظم پڑھ رہے ہیں۔ مدرسہ کے در و دیوار گونج رہے ہیں۔ ہزاروں کا اجتماع۔ آواز کی بلندی اور ترنم سے مسحور ہے۔ چہرہ پر عجیب و غریب حسن و جمال اور شگفتگی ہے۔ وہ ترکیب بند مندرجہ ذیل ہے:-

حمد خدا کو چاہیئے تیری مدد قلم　　خدمت سپرد ہے، یہ ترے تا ابد قلم
اول خدائے پاک نے پیدا کیا تجھے　　مرقوم صدر لوح پہ ہے یہ سند قلم
اتنوں کے سامنے نہ مجھے کر ذلیل و خوار　　درخواست میری چاہیئے کرنی نہ رد قلم
حمد خدائے پاک ہے توشہ معاد کا　　یہ لکھ سوائے اس کے نہ لکھ نیک و بد قلم
حق حمد کا تو جب بھی نہ ہوگا ادا اگر　　لکھنے کو بیٹھے بندۂ عاجز بصد قلم
لیکن ہے اقتضائے عباد نکو شعار　　راقم کو جد رقم میں ہو اور تجھ کو کد قلم
السعی منی کہہ کے نگوں سر ہو لوح پر　　اللہ کا نام لے کے ذرا کھینچ مد قلم
تو دیکھتا ہے دیکھ رہے ہیں تجھی کو سب　　چاروں طرف سے پڑتی ہے نظر کی زد قلم
حمد خدائے عز و جل کے لئے مدام　　سر در سجود ہو کبھی ہو سرو قد قلم
امکان تک تو چاہیئے اظہار بندگی　　تحمید حق ضرور ہے تا وسع و حد قلم
تحمید حق میں چاہیئے ہونا فنا تجھے　　گس دے طراز حمد میں اپنا جسد قلم
مخلوق تجھ کو حق نے کیا دو زبان سے　　میری زباں کو تجھ سے نہ کیوں ہو حسد قلم
اس کے سوا ہے رشک و حسد کا سبب اک اور　　قول اس کا ہے سچ۔ فعل ترا مستند قلم
بسم اللہ کا ہو ترانہ صریر میں　　ہو مد میں ہر کشش کی رقم یا صمد قلم

معبود حمد عبد سے گو بے نیاز ہے
بندہ ثنائے حق سے مگر سرفراز ہے

محبوب حق کی نعت میں کھل اے زبان کلک
ایسے عمل ہیں موجب ہستیٔ شان کلک

نعت حبیب پاک خدا میں کھپا دے جاں
کر تذہی کہ تجھ کو کہیں سب روان کلک

ایسی تو لکھ ثنائے محمد کہ سن کے سب
صل علیٰ کے تحت میں ہوں مدح خوان کلک

از بس وسیع تو کہ ہے میدان حمد و نعت
جولانیوں سے کھول دے تاب و توان کلک

سن کر صریر کلک کو بن جائیں حاضرین
تاثیر نعت پاک سے رطب اللسان کلک

دنیا و دین کے حال کے لکھنے سے کب چھپے
نفع و مضار خامۂ و سود و زبان کلک

وہ نعت لکھ کہ جس کو کہیں سن کے حاضرین
لاریب فیہ راست ہے یہ داستان کلک

مقبول ایسی نعت رقم کر حبیب کی
بہر بیاض نظم ہو تا ارمغان کلک

فصل بہار خامہ نمیقت ہے نعت کی
دنیا کی مدح ساری ہی عہد خزان کلک

کاغذ وہ جس پہ لکھی ہو نعت محمدی
رتبے میں وہ زمین بنے آسمان کلک

جائے ادب ہے نعت بھی ہم رنگ حمد رب
واجب یہاں بھی ہے کہ جھکے فرقدان کلک

سب منتظر ہیں نغمہ و صوت صریر کے
بیٹھے ہیں سب کے سب پئے امتحان کلک

مدحت سرائے حضرت محبوب کبریا
بن جائے تا نے کلک تو ہو امتنان کلک

بلبل سے کم نہیں ہے نوا سنج نعت پاک
طوبیٰ کی شاخ شجرہ سے ہے دودمان کلک

گلریزیاں یہ نعت نبی کی دکھائے گا
مل جائے گا جو وقت تو جی کی دکھلائے گا

لائی ہے اب تو کھینچ کے اک محترم طلب
آنا پڑا مجھے کہ تھی وہ پر کرم طلب

دعوت جو اہل علم و خرد آہنگاں کریں
کیوں کر نہ سمجھی جائے بھلا محتشم طلب

میری طلب یہ مایۂ صد فخر ہے مجھے
لیکن ہوئی بزمرۂ اہل قلم طلب

معقول عذر کرتا ہوں میں ضیق وقت کا
اک ہفتہ پہلے چاہیے تھی کم سے کم طلب

اب منفعل ہوں مجمع اہل کمال میں
کہدوں کرم طلب نہیں ہے یہ ستم طلب

نیت کو جانتا ہوں صفا باطنوں کی میں — یہ بھی مری طلب ہے یہ لطف اتم طلب

اس کا بھی ہے یقین مجھے ان کی ذات سے — ہو گی گناہگار کی اب دم بدم طلب

سر کو قدم بنا کے یہاں آؤں گا مدام — کھاؤں قسم کبھی آپ کریں گر قسم طلب

بھیجا نہ جائے نامہ و پیغامبر و قسیح — سائل ہوں میں نہیں ہوں میں جاہ و حشم طلب

قربان اس طلب کے نثار اس طلب کے میں — ہوں مجھ سے بد بزمرۂ خیر الامم طلب

میری طلب میں اب رہے اس امر کا خیال — یعنی مری طلب ہو بوجہ اتم طلب

میں حاضری کا حق بھی تو کچھ کر سکوں ادا — ہستی طلب کی میری بنے کیوں عدم طلب

اتنا تو وقت چاہئے دینا کہ بہر نظم — کاغذ طلب قلم ہو تو کاغذ قلم طلب

داعی سے کر رہا ہوں مکرر یہ التماس — ہو میری اس طرح سے نہ پھر ایکدم طلب

احضار کے لئے رہی ارشاد پر نظر — اک لمحہ بھی پڑی نہیں روداد پر نظر

تفصیل مدرسے کی دعا کے سوا ہو کیا — اس کی بقا کی آس خدا کے سوا ہو کیا

تعمیر کی یہ شکل توکل کی شرح ہے — کلمہ زباں پہ دیکھ کے جز مرحبا ہو کیا

کیسی لطیف اس کی عمارت کی شکل ہے — اس پر فضا فضا سے فزوں تر فضا ہو کیا

حضرت امین دین و کفایت کا دم رہے — تعریف قلب ان کے دلوں سے صفا ہو کیا

خدمت میں دین کی ہیں یہ دن رات منہمک — دینی وفا میں اس سے زیادہ وفا ہو کیا

کتنی بلند اس کی عمارت ہے شاندار — حیران ہوں اور معنی اوج و علا ہو کیا

سب حاضرین کو چاہئیں کرنی اعانتیں — درخواست اور کیا کروں اور التجا ہو کیا

دارین میں بھلا ہو جو حامیٔ دیں رہے — ایسی دعائے خیر سے بہتر دعا ہو کیا

روشن چراغ دین محمد ہے مدام — ضو پاش اس سے بڑھ کے کسی کی ضیا ہو کیا

جتنی کسی سے ہو سکے اس کی مدد کرو — کونین میں خبر نہیں اجر سخا ہو کیا

حرف سوال لب پہ یہاں آئے کس طرح — سائل یہ گھر خدا کا ہے اس میں صدا ہو کیا

"دوندے خاں نامہ"

(پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے، ال ال بی اُستاد شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

روہیلکھنڈ کی تاریخ میں نواب دوندے خاں کو جو عظمت و شہرت حاصل ہے اس سے تاریخ کا ہر طالب العلم واقف ہے۔ مدتوں تک روہیلکھنڈ ان کی جہانکشایانہ ہمت کا بازیچہ بنا رہا ہے اور اُن کی شجاعت و شہامت عدل گستری و معارف پروری کے قصّے زباں زد خاص و عام رہے ہیں۔ "دوندے خاں نامہ" عوام کے ان ہی جذبات عقیدت کا آئینہ دار ہے۔ یہ مثنوی اس زمانہ کے ایک مشہور عالم مولانا حاجی محمد مہدی صاحب مرحوم کی تصنیف ہے۔ حاجی صاحبؒ قصبہ موئی ضلع بریلی کے رہنے والے تھے۔ علم و فضل میں وحید عصر سمجھے جاتے تھے۔ اکبر شاہ نے اُن کو فصیح الشعرا، ملک العلماء کا خطاب دیا تھا پیش نظر مثنوی کا قلمی نسخہ، میرے جدامجد جناب قبلہ مولوی ارشاد علی صاحب فریدی مرحوم امروہوی نے مصنف کے اصل مسودہ سے سنہ ۱۲۷۵ھ میں نقل کیا تھا۔ مولوی ارشاد علی صاحب حاجی صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حاجی صاحب نے موئی سے امروہہ کا سفر خاص طور سے اُن کی تعلیم کے لئے فرمایا تھا۔

حالات نواب دوندے خاں نواب دوندے خاں سنہ ۱۷۰۰ء میں نورشہامت پور (افغانستان) میں پیدا ہوئے تھے جب ہندوستان میں سلطنت مغلیہ پر نزاع کا عالم طاری ہوا تو بیرون ہند سے چھوٹے چھوٹے قبائلی سردار، سیاسی ابتری سے فائدہ اُٹھانے اور قوت و اقتدار بڑھانے کے لئے ہندوستان میں آ گئے تھے۔ ان ہی میں ایک داؤد خاں نامی سردار تھا۔ جو بہادر شاہ ابن اورنگ زیب کے عہد میں ہندوستان آیا تھا اور اُس نے کٹھیر (روہیلکھنڈ) میں اپنا اقتدار قایم کر لیا تھا۔ اور روہیلوں کو وہاں جمع کر کے اُن کی قوت کا استحکام کرنے لگا تھا۔ دوندے خاں بھی اپنے وطن کو چھوڑ کر داؤد خاں سے آملے اور اُن کے شریک کار ہو گئے۔ روہیلکھنڈ کے زمینداروں اور جاگیرداروں سے عرصہ تک یہ دونوں معرکوں میں مصروف رہے اور بالآخر ایک حکومت کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ داؤد خاں نے ابھی اپنی طاقت کو پوری طرح نہیں جمایا تھا کہ کمایوں کے راجہ دیبی چند نے اُسے دھوکہ سے اپنے پاس بلا کر قتل کرا دیا۔ یہ سانحہ روہیلوں کی تاریخ کے اس ابتدائی دور میں نہایت سخت تھا اور ممکن تھا کہ

اُس وقت اُن کا شیرازہ ہمیشہ کے لئے منتشر ہو جاتا لیکن اس نازک موقع پر دوندے خاں نے افغان سرداروں میں نظم و ضبط قایم رکھا اور علی محمد خاں (بانی ریاست رام پور) کو داؤد خاں کا جانشین بنا کر اپنے اقتدار کو بڑھانا شروع کیا۔ اسی زمانہ میں دوندے خاں نے اپنے چچازاد بھائی حافظ رحمت خاں کو بھی بُلا لیا۔ نواب علی محمد خاں، حافظ رحمت خاں اور نواب دوندے خاں تینوں کی قیادت میں ضلع بریلی کا تقریباً تین چوتھائی حصہ روہیلوں کے قبضہ میں آگیا (تاریخ روہیلکھنڈ، مصنفہ نواب نیاز احمد خاں ہوش) اس زمانہ میں ایرانی پارٹی نے محمد شاہ کو روہیلوں کے استیصال پر آمادہ کر دیا۔ لیکن دوندے خاں کی شجاعت اور بہادری سے روہیلوں کو فتح پر فتح ہوتی رہی۔ شاہ آباد، مراد آباد، سنبھل، بیلی بھیت وغیرہ کا علاقہ روہیلوں کے قبضہ میں آگیا۔ اور روہیلکھنڈ کی ایسی سلطنت قایم ہوئی جس کے دبدبہ اور جلال کے ڈنکے ۱۷۶۱ء تک اقصائے ہند میں بجتے رہے جنگ پانی پت میں نواب دوندے خاں وغیرہ نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں

نواب دوندے خاں نے ۱۱۸۴ھ / ۱۷۷۰ء کو انتقال کیا وہ شجاعت و شہامت، فہم و فراست، بذل و سخا تمکنت و جلال میں عدیم النظیر تھا۔ مفصل حالات کے لئے جناب سید الطاف علی صاحب بریلوی کی مشہور کتاب حیات حافظ الملک حافظ رحمت خاں، ملاحظہ ہو مندرجہ ذیل مثنوی میں نواب دوندے خاں کے عدل و انصاف اور غربا پروری کا واقعہ نظم کیا گیا ہے۔

محمد مصطفیٰ مراد دلہائے عباد در بیان حال استغاثہ تاجرے بہ حضور نواب دوندے خاں مالک مراد آباد

سر آغاز کلام من بنامے ۔۔۔ کہ از وے ہر زباں فایز بکامے
سپس نام حبیبش بر زبان است ۔۔۔ کزاں شیریں تر از شہد م دہان است
ازیں پس آنچہ از وے ناگزیر است ۔۔۔ ز سینہ در سفینہ جائے گیر است
ز پیر سخنوری تعلیم کوشم ۔۔۔ بلطفے کرد نقلے جب بگویم
کہ در ملک کٹھیر نیک نامے ۔۔۔ قیامے داشت باجاہ تمامے
بہ دوندے خاں بعالم مشتہر بود ۔۔۔ جوانمردے سلیمے دادگر بود

مرادآباد را آباد می داشت — مراد خاطر خود داد[1] می داشت

بدامن پرورده آں فرخنده خوئے — ز نوابان عہد خویش گوئے

کف دستش[2] سحاب دُرفشاں بود — ز دستش ابر نیساں در فغاں[3] بود

بجرأت آں چناں بود آں قوی بال[4] — کہ رستم داشت پیشش رتبۂ زال[5]

اگر برزو[6] بدیدے در دو غالیش[7] — نہادے روئے خود بر پشت بالیش

وگر میدید روئیں تن[8] سنجوالش — تہی می کرد قالب چوں رکالش

بدیدی گر بایں جوشنده آبے — شدے افراسیاب[9] افراسیابے

بحکم خویشتن آں جاه پرور — ده و دو الف حملہ داشت لشکر

ولے ہر یک نہنگ بحر جنگے — بمیداں دلبری شیر پلنگے

سلحشورے[10]، یلے، کار آزمائے — پئے ہر بہمنے چوں اژدہائے

بروزے آں جوانمرد زمانے — بجرأت آفت شیر ژیانے[11]

بغایت داشت بایک دولت اندیش — بکارے اشتغال خاطر خویش

کہ ناگاه از در آمد دادخواہے — نشستہ در لحد از گرد راہے

کہ فریادم ز بیداد ستمگر — بغارت برد اموالم سراسر

بگوشش او فغانش چونکہ جا ساخت — باستقصائے کار او نپرداخت

کہ آندم فکر کار دیگرش بود — پئے نشستن او حکم فرمود

چو فارغ گشت از فکرے کہ بودش — بقرب خویشتن عزت فزودش

بمہرش گفت حال خود بیاں کن — نہفتہ راز خود بر من عیاں کن

بعرض حال چوں ماموُر[12] گردید — ز لب مُہر سکوتش دور گردید

---

[1] بخشش و انصاف [2] بخشش [3] فریاد [4] قوی بازو [5] پیرزن [6] نام پسر رستم [7] لڑائی [8] لقب اسفندیار است کہ بہ جلد بدن او تیغ و تیر کارگر نمی کرد [9] حباب [10] کسیکہ در ورزش و استعمال اسلاح بسیار کند [11] خشمناک [12] حکم کرده شد

که هستم تاجر شهر خراساں | گذارم گشت در ملک تلنگاں
در آنجا راجهٔ بیداد کام است | بظالم سنگھ مشهور انامش است
بود آں مردک بیداد پیشه | بملک خود سری شدّاد پیشه
بنا ترسی گرو برده ز شیطاں | بود چنگیز خاں یگ چاکر آں
بابغض می برد از جا فریبش | زلئیورستش سر نه به رکیبش
بداند خون مردم شیر مادر | بمال مردگاں کابین دختر
زاکواش است برتر پایهٔ او | گریزد دیو هم از سایهٔ او
سه لکه را نقد و جنسے پیش من بود | بغارت حمله برد آں دیو مردود
چوں نشنستم دریں روز سیاهے | نگشتم پیش هر کس دادخواهے
کسے پروائے احوالم نفرمود | کنوں آوردهٔ هیئت بخت مسعود
ز حال خود نمودم قصه خوانی | فسانه ختم شد، دیگر تو دانی
چو نواب ایں افسانه کرد در گوش | بگرداب تحیر خورد پاغوش
پس از دیرے سر آں گوهر ناب | چو نیلوفر بروں آمد ازاں آب
روانش فرمود تا آید دبیرے | برید مشک تر را بر حریرے
دبیر آمد بیادش داد گر داد | که تا کرد آں به نثرش عنبر آباد

نامه نواب دوندے خاں جرار بنام راجه ظالم سنگھ بهادر شعاری

بنام مالکے زیب مقال است | که، ملک او منزه از زوال است
ملیک مقتدر والاست شانش | زمین و آسمان فرماں کشانش
ملک جن و بشر را هستی از وے | بچرخ اوج و زمیں را پستی از وے
تمامی ملک ملکِ خاص آں است | ز مملوکان مکین و هم مکان است

---

[۱] خلق [۲] قاتل امصاران [۳] نام لیسر شیطان [۴] نام دیوے که رستم را در دریا انداخته بود [۵] جلد [۶] کاغذ [۷] رقم سیاه

بعادل می دہد فوق السما جا | بظالم میکند تحت الثریٰ جا
ز دل بخشیدن آں رب معبود | بعوضے بر دریدہ مغز نمرود
پرستو را چو حکمش گشت موصول | نمودہ لشکرے را عصف ماکول
سر سرکش بپائے پیل آرد | باتش خو بآب نیل آرد
یا ہدائے زرہ آوارگانے | فرستد ہادئے معجز بیانے
چو تحمیدش فزوں تر از بیانست | قلم در شرح مطلب تر زبانست
دریں ایام نصرت التیامم | کہ گردد چرخ بر حسب مرامم
بنام من نگین فتح را گوش | رکابم را ظفر وا کردہ آگوش
بہر جانب کہ آرد اخترم رو | سر خصمم بگردد کاسک او
رسیدہ داد خواہے پیشم از راہ | للبش تبخالہ دیدم وا معنیشاہ
کہ ہستم تاجرے خواہان دادے | ز دست ظالم آتش نہادے
تمامی آب خود برباد دادہ | بخاک خواری از ظلمش فتادہ
ز دست حاکم ملک تلنگاں | فتاد ایں آتشم در خرمن جاں
سہ لکھہ را نقد و جنسم یک قلم برد | بیک دم کرد محتاجم بیک خورد
بداں سال در گورم نشاندہ | کہ از بہر کفن تارم نماندہ
بہ پیش و پس جہان اختراں فوج | ببردم ز اختر بد نالہ بر اوج
کسے نہرے نگسترده بجالم | بروں ناوردہ اختر از دبالم
کنوں پیشت رسیدم گر توانی | ازاں سرشان عناق من رہانی
اگر دادم نہ بستانی دریں روز | ستانم داد خود در آخریں روز
بروز حشر ہستی آوری گر | بترس از داوریم پیش داور

۱؎ پشہ را گویند ۲؎ طائریست کوچک و سیاہ کہ باسم ابابیل شہرت دارد ۳؎ مانند گیاہ خوردہ شدہ ۴؎ مراد از فرعون ۵؎ مراد در مطلب ۶؎ ظرفیست کہ در و آب و شراب خورند (منتخب) ۷؎ فریاد ۸؎ گرگ درندہ ۹؎ بزغالہ مادہ ۱۰؎ از حین ولادت آں تا چہار ماہ

قیامت زادہائے آتھانیش | چو در آگوشش گوشم کرد جالیش
تف آں آہ آتش زن بجانم | گرفتہ گرد شمع استخوانم
ز بیم حرّ روز آتش انگیز | سنئ کلکم چنیں گردد شرر ریز
کہ اے در راجہائے دہر نامی | بجملہ چوں سر از اعضا گرامی
فلک یار تو و اختر بکامت | نزادہ جرأت و شیری زنامت
تو شیرانہ زخون گرگ بدکیش | گل سُرخ پکہّ[1] کن ناخن خویش
نکو نبود کہ جنگ خویشتن شیر | بیالاید بخون روبہ پیر
کجا پیلے بمور افگندہ زنجیر | کجا بازے بہ جدجد[2] کردہ نخچیر
مرادم اینکہ تاراج سراں کن | نہ دست خود بمال تاجیاں کن
ترکش[3] خود سوئے ملک دکن کن | جدا متکبراں را سر ز تن کن
دُر و مرجاں درانجا بیشمار است | پر از سیم و زر آں جملہ دیار است
اگر داری ہوس مال اینچنیں کن | ز مال ہیچو کوتہ آستیں کن
بعزم خود بلندی آشنا کن | گرفتی ہر چہ از تاجر رہا کن
بکن واپس ہمہ مال و منالش | بترس از انتقام تال و مالش
بنا دیدہ شمر از دوستانم | کہ از دست جزایت میرہانم
اگر ایں گفتہ را دادی بدل جا | ازیں احساں شوم احسنت پیرا
وگرنہ ما و سیلاب قیامت | برم یک لخت از خاک سلامت
سپہ رانم ہمہ زنجیر خانے | حریف خویش را چوں اژدہائے
دہ و دو الف گرچہ در شمار است | ولے ہر یک دلیر کارزار است
بگور مرگ جادہ ہر دلیرے | بیک دنداں گوسالہ[4] دو شیرے

---

[1] گل ڈھاک باشد مانند ناخن شیرے [2] جھینگر [3] تاخت و تاراج [4] تیر را گویند

بود ہر یک پلنگ بیشۂ جنگ | حنا بندے زخون نیلہ و رنگ
بصدہا صید حاصل کردہ سیرے | نبردہ برہ بند کار شیرے
بوقت نعرہ مثل رعد غراں | بود در تیر بازی تیر باراں
غرض چوں ابر رزم بر سر تو | دہم برباد آب گوہر تو
ہمہ خاکت پر از آتش نمایم | حیات تو بتو ناخوش نمایم
بزور از تو ستانم مال تاجر | مبندیش از مآل کار آخر
نباشد کز غرور جاہ و مردم | کنی خود را ز راہ راستی گم
بکثرتہائے فوج خود نتازی | کہ باشد در کفش نصرت طرازی
بحکم محکم آں فتح کن یار | بداں کم من فئۃ غالب بہ بسیار
چہ یابد امر مور ناتوانے | درد پیشانئ پیل دمانے
دہد دل گر ورا عاجز نوازے | براند صعوہ صید باز بازے
خدایم چوں ممد اہل داد است | ازیں رو خاطرم خورسند و شاد است
ہر لمحہا عناں سوئے تو تابد | باستقبال من نصرت شتابد
چو افشانم رکابے از پئے داد | رکابم را ظفر بوسہ تواں داد
وگر بالفرض دادم جان شیریں | بآخر دادہ باشم در رہ دیں
نگردم زیں ہمیں رسم است وراہم | سرت در پائے یا دستت کلاہم
مرا در ہر دو فن دست تمام است | بدستے تیغ و دیگر دست جام است
اگر از جام کوتے جم شمارم | بہر دم نشۂ حب تو دارم
وگر از تیغ رانی داستانے | دریں میداں منم رستم توانے
بہ بزم و رزم یکتائے جہانم | بخواہی ہر چہ تو خواہاں آنم

۱؎ بہادر ۲؎ ماہر کار

بہر چہ رائے تو آرد تقاضا — ز مہر و کیں بباید کرد انشا
کہ بعد از درک مضمون جوابے — نشینم یا نہم پا در رکابے
اگر مہر است بر جا چوں زمینم — وگر کین است مہر آتشینم
کنوں من بر کلامت گوش دارم — بیا در تا چہ داری انتظارم
چو مطلب یافت زیب اختتامے — دہن تیغ زباں را شد نیامے

فرستادن نواب رفیقے را بطریق رسالت در رسیدن نامہ راجہ صاحب۔

چو ختم نامہ با مہر و نشاں کرد — رسول را بآں خط رواں کرد
فرستادہ بشایانے کہ بالیست — بہ پشت باد آتش پائے بنشست
بروز و شب چو مہر و ماہ گردید — کہ تا در نصف شہر شہر اُو دید
خبر کردند کز ملک کٹیھر — رسید اینک پیام آرِ خرد ور
ز نوابے بدارد نامہ با خویش — بخواہد خود نہد در خدمت پیش
اجازت شد فرستادہ در آمد — بہ بزم راجہ صاحب فر آمد
نشست و کرد اول از دعا یاد — پس آں نامۂ سربستہ را داد
اشارت کرد تا خوانندہ آید — نقاب از چہرۂ معنی کشاید
سبک خوانندہ آمد نامہ بکشاد — بخواند و کرد گوشش اخگر آباد
ز ہر حرفے کہ از لب برے — بجانش شعلے از آتش نشاندے
سراسر حرف کار نیش می کرد — غلط گفتم چو نشتر ریش می کرد
رخش شد در شفق مہر فروزاں — بہم آغوشی پر نش رگ جاں
غضب گل کرد و رخ گلفام گردید — دو چشم او گل بادام گردید
ولے از راہ حلم و تجربہ ہا — نگہدار زباں شد از بدیہا

[1] قایم۔

ز جا برخاست و گفتا جوابے | تو نسیم سوئے آں جرأت مآبے
ہمیں از ہفتہ سرے آرائی رائے | بوالا ہمتی و نیک رائے
رسول نامہ آور را طلب کرد | بشیریں گفت گوشش پرطرب کرد
کلاہ گوہر منقش بہ سر آورد | تنش را در پرند پر زر آورد
وشاخ دُر چو گردش جا بگردن | رسیدش آب گوہر تا بگردن
ز نقد و اسلحہ دل شاد گردش | چہ میگویم کہ خانہ زاد گردش
گزیدہ از پئے نواب حرار | دو فیل کوہ پیکر ابر رفتار
بہ پشت ہر یکے زریں نگینے | دلے در آب گوہر تہ نشینے
دہ و دو کرہ تازی نژادے | بروتے آب رہ پیما چو بادے
خیال آسا بدم عالم نوردے | گہہ پویہ ندیدش وہم گردے
ظرائفہائے دیگر ہم فراواں | ز بحر و کان و معمور بیاباں
پئے نواب نامہ آور فرستاد | ہمہ بگرفتہ تاجر بہ بسیں داد
مختم نامہ دادش در جوابے | ہدیہ آورد یا اندر اکابے
صبا یکمک کشت آں گلگوں عنانش | کہ تا آورد در بستان جانش
چو بلبل اول از گلبوئے لرائے | حضور گلستاں شد نغمہ پیرائے
ہدایا پس و پیش آورد و نامہ | کہ نقشش میکشد نقاش خامہ

نامہ راجہ صاحب در جواب نامہ نواب آور -

بنامے می نمایم نامہ را سر | کزد کامم بود پر شہد و شکر
حکیمے فضل او حکمت قریں است | ز شکوہان او چرخ و زمیں است
ز نحل آورد شہد و قند از نے | نہ بردہ را نشئے در حکمتش پے

جمیل سہ پاکر

تفکر ہا ز ذاتش دور سیرے   صفائی مسجد و آدیں دیرے
بہر کس ہر چہ میبایست آں داد   یکے را صنعت و دیگر را تواں داد
چراغ ماہ کرد از نور آباد   چراغک[1] را بقدرش لمعہ داد
تواضع را بسر از وی کلاہے   تکبر را از و روے سیاہے
توانا حاکم محکوم کس نیست   ز حکم او بروں مور و مگس نیست
زباں یارائے تحمیدش ندارد   قلم تاوائے تسویدش ندارد
چو حمدش از زبان و خامہ دور است   بتحریر ضروری ناصبور است
شرارے کز زبان خامہ خویش   بیفگندی بجیب نامۂ خویش
بعین من بعینہ جائے خود ساخت   سموششں در دل دانا کیم انداخت
رقومے کز خودی خود نوشتے   بدل گر نیک بینی بد نوشتے
ہمیدانی تو لے از آگہی دور   کہ بہرامے نگردد عاجز گور
نتاند کرد تیہو[2] صید باز   نہ بنجشکی بمغز حبترہ بازے
نگردیدہ پلنگے رام آرام   نہ سہرے کردہ ہرگز صید ضرغام
محال است ایں کہ بینی مور پیلی   نہد از ترسنا کیہا تملیلی
بسیجنہ[3] کہ باشد خشمناکے   ز چاؤ چاؤ کنجشکاں چہ باکے
بایں بے مائگی ایں عزم خامت   بود از پختگی دور ایں کلامت
سپاہ تو اگر انجم حساب است   ز جبذم[4] ہر یکے چوں آفتاب است
دلیرت افگند بر خاک شیرے   دلیرم افگند شیر و دلیرے
بود ہر پیر دلت اسفندیارے   کمینہ چاکرم ز دل[5] سوارے
جوان لشکرت گر ہست بہمن   کہن اژدر بود ہر نوکر من

---

[1] کرم شب تاب [2] طائریست کوچکتر از کبک دری [3] باشہ [4] لشکر [5] رستم

اگر سہر گرد تو شیدہ بکار است | مرا ہر بندہ کیخسرو شعار است
کہ یارد کس نامم گیرد از کین | مگر تلخی طلب با جان شیرین
ندیدستی مگر بازوئے زورے | کہ می بندی بخود زنگیونہ شورے
غرض زیں گفتگوئے خامی آمود | دل با پختگی یارم براں بود
کہ اندازم جواب نامۂ تو | ز رونقہا برم ہنگامۂ تو
و لے شد جرأت بین دلیلم | کہ اندازی بخود در پائے پیلم
دلیرے کر خط تو جوش می زد | ترا بے شک بمرگ آغوش می زد
فتوتہا کہ از نامہ عیاں بود | پئے موتت قلم پیشت رواں بود
بسا التہائے تو پیدا ز مضموں | نشانیدن ترا میخواست در خوں
چو باور شد کہ آں عزم دلیرے | دہد لاریب جاں در جنگ شیرے
مروتہا ندیدم دشمن اینست | صفائی سینۂ بے کینم اینست
کہ جاں بیجا دہد جرأت تابے | بخواہد جاں دہم از من جوابے
حساب گفتہ چوں کردم بدل جا | بدل حب ترا کردیم ماوا
نظر بر امر مکتوبہ محبا | ہمہ مطلوبۂ تو بے محابا
روانہ ساختم اندر حضورت | کہ تا افزاید اندر دل سرورت
ہدایا را پذیر از نیک رائے | کہ ہست ایں موجب الفت فزائے
دگر خواہم کہ تا آ ماؤ تو مانیم | بدلہا ریشۂ الفت دوانیم
مدام از صرف الفت مست باشیم | بہر دستے بہم یک دست باشیم
دگر رائے تو باشد ہمچو رائیم | بوصلت نیز فرحتہا ربائیم
نہی یعنی کہ پایت بر سر من | کنی خاک قدومت افسر من

لہ سپہر افراسیاب

دگرنہ از حصول ایں مرادے نگردم در مرادآباد شادے
خوشا آں وقتے کہ یابم ایں تمنا ہمیں خواہد ہمیں خواہد دل ما
تمنا چوں ز دل در نامہ آمد بخاموشی زبان خامہ آمد

در بیان خاتمہ احوال

چو نواب جہاں جرأت آرائے بعالی ظرفئے رائے نکو رائے
شد آگہ آفریں خوانش بجاں شد شکار نیکخوہہائے آں شد
ہدایایش پذیرفت و ہدایا دو چندش بہر آں کان صفاہا
فرستاد و محبت را فزوں کرد محبت جائے در ہر دو دروں کرد
بہم تا زیست الفت درمیاں بود بوصل و ہجر الفت بر زباں بود
بتاجر جملہ اموالے کہ بودش بداد و خلعتی از خود فزودش
چو تاجر فائز کام خیاں شد دعاہا بر زباں راند و رواں شد
شد از حکم حبیبی نیکوئے گنج
زبان خامۂ مہدی سخن سنج

ادبیات

حسینؓ

(از عالی جناب کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی۔ سحرؔ۔ سٹی مجسٹریٹ دہلی)

تشنہ کامی۔ بیکسی، غربت فریبِ دشمناں	نوکِ خنجر بارشِ پیکاں گلوئے خونچکاں
ہے دمِ شمشیر سے بھی تیز تر راہِ جہاں	ہر قدم اک مرحلہ ہے ہر نفس اِک امتحاں

زندگی بھر اہلِ دل کی اور آسانی طلب
یہ وہ مے ہے جس کا ہر قطرہ ہے قربانی طلب

فطرتِ آدم کو کر دیتی ہے قربانی بلند	دل یہ کھل جاتی ہے اس کے نورسے ہر راہِ بند
مہر و مہ ہوتے ہیں اس کی خاکِ پاسے ارجمند	ہے فرشتوں کے گلوئے پاک میں اِس کی کمند

سر کہ جس میں ذوقِ قربانی ہو جھک سکتا نہیں
تنکوں سے بڑھتا ہوا سیلاب رُک سکتا نہیں

گلشنِ صدق و صفا کا لالۂ رنگیں حسینؓ	شمعِ عالم، مشعلِ دنیا، چراغِ دیں حسینؓ
سر سے پا تک سُرخیٔ افسانۂ خونیں حسینؓ	جس پہ شاہوں کی خوشی قرباں وہ غمگیں حسینؓ

مطلعِ نورِ مہ و پروین ہے پیشانی تری
باج لیتی ہے ہر اک مذہب سے قربانی تری

جادۂ عالم میں ہے رہبر ترا نقشِ قدم	سایۂ دامن ہے تیرا پرورش گاہِ ارم
بادۂ ہستی کا ہے تعبیر تجھ سے کیف و کم	اُٹھ نہیں سکتا ترے آگے سرِ لوح و قلم

تو نے بخشی ہے وہ رفعت ایک مُشتِ خاک کو
جو یہ اِیں سرکردگی حاصل نہیں افلاک کو

ساقیِ بزمِ حقیقت نغمہ سازِ مجاز — نازکے آئینہ روشن میں تصویرِ نیاز
دیدۂ حق بیں دلِ آگہ نگاہِ پاکباز — رونقِ شامِ عجم اے زینتِ صبحِ حجاز

تو نے بخشی ہر دلِ مردہ کو وہ شمعِ حیات
جس کے پرتو سے چمک اُٹھی جبینِ کائنات

بارشِ رحمت کا مژدہ بابِ حکمت کی کلید — روزِ روشن کی بشارت صبحِ رنگیں کی نوید
ہر نظامِ کہنہ کو پیغامِ آئینِ جدید — اے کہ ہے تیری شہادت اصل میں مرگِ یزید

تیری مظلومی نے ظالم کو کیا یوں بے نشاں
ڈھونڈھتا پھرتا ہے اس کی ہڈیوں کو آسماں

ہر گلِ رنگیں شہیدِ خنجرِ جورِ خزاں — ہر دلِ غمگیں ہلاکِ نشترِ آہ و فغاں
جاگزیں ہے اے سحر ہر شے میں وہ سوزِ نہاں — پھول پر شبنم چھڑکتا ہوں تو اُٹھتا ہے دھواں

خنجرِ آہن گلوئے مردِ تشنہ کام ہے
چھُٹ نہیں سکتا یہ وہ داغِ جبینِ شام ہے

تبصرے

زبان کا مسئلہ شائع کردہ انجمن پیام ادب (هند) بنارس | تقطیع خورد ضخامت ۴۸ صفحات کتابت و طباعت عمدہ قیمت درج نہیں

اس میں پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے ہندو مسلمان ارباب قلم کے مقالات ہند کی مشترکہ زبان کے مسئلہ پر ہیں۔ مقالہ نگار حضرات نے لسانی، ادبی، تاریخی،۔ اور دوسرے پہلوؤں سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے لیکن حاصل سب کا ایک ہی ہے یعنی یہ کہ ہند کی ریاستی زبان ہندی کے نام سے پکاری جائے یا ہندوستانی کے نام سے بہرحال وہ ہی زبان ہونی چاہئے جو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جو اس ملک کے مشترک رہن سہن کا سب سے بڑا قیمتی سرمایہ ہے لیکن اب یہ سب مضامین خارج از بحث ہیں اور ان کا فائدہ بس یہی ہے کہ آئندہ مورخ کے غور و فکر کے لئے حقایق و معلومات کا مواد بہم پہنچا سکیں۔!

اسلامی نظمیں | از شفیع الدین صاحب نیر۔ شائع کردہ حالی پبلشنگ ہاؤس اردو بازار دہلی۔

نیر صاحب بچوں کے شاعر کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں یہ کتاب ان کی چوبیس نظموں کا مجموعہ ہے جو حمد و نعت۔ اسلامی تہواروں یا بعض مفید اخلاقی امور پر لکھی گئی ہیں۔ زبان سب کی صاف سلیس شستہ اور رواں۔ پڑھنے میں دلچسپ اور یاد کر کے عمل کے لائق ہیں۔ بچوں کے علاوہ بڑی عمر کے لوگ بھی انھیں پڑھ کر لطف اٹھا سکتے ہیں۔

سرور عالم | از خالد صاحب تقطیع جیبی ضخامت ۴۸ صفحات قیمت درج نہیں پتہ علوی برقی پریس بھوپال جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے قبل کے مختصر حالات اور پھر آپ کی ولادت باسعادت سے لے کر وفات تک کے حالات مختصر

طور پر مگر صحیح صحیح آسان اُردو میں لکھے گئے ہیں درمیان میں جگہ جگہ موقع کے مناسب نظمیں بھی آگئی ہیں جن سے کتاب کی دلچسپی اور بڑھ گئی ہے۔

نماز | یہ رسالچہ بھی خالد صاحب کا لکھا ہوا ہے قیمت ۲ر ضخامت ۲۳ صفحات۔

اس میں نماز کے فضائل، ارکان و شرائط اور اس کی دعاؤں وغیرہ کا بیان ہے۔ فرائض و واجبات اور مستحبات و نوافل کو نقشہ کی شکل میں لکھا گیا ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ بچے انھیں آسانی سے یاد کر سکتے ہیں!!

رحمۃ للعالمین | ہندی ایڈیشن شائع کردہ ہندوستانی کتاب گھر۔ ناظر باغ کانپور۔ سائز ۲۰×۳۰ بڑی تقطیع قیمت درج نہیں۔

مولانا قاضی محمد سلیمان صاحب مرحوم کی مشہور کتاب "رحمۃ للعالمین" (سوانح حیات حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) تین ضخیم جلدوں میں شائع ہو کر کافی مقبول ہو چکی ہے ضرورت تھی کہ ملک کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہوتے۔

جمعیۃ تبلیغ الاسلام انبالہ (قبل از تقسیم ہند) نے اس ضرورت کو محسوس کر کے اس کا ہندی ترجمہ شروع کرایا تھا اور اب اس مقصد کی تکمیل انڈین یونین کی "جمعیۃ تبلیغ الاسلام کانپور" نے کی اور پہلی جلد کا ترجمہ شائع کیا ہے ہندی نوازی کے اس دور میں کتاب کے اس ہندی ایڈیشن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اخلاق و عادات اور پاکیزہ زندگی سے ابنائے وطن کے مستفیض ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے البتہ ترجمہ میں جو زبان اختیار کی گئی ہے وہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے تو مفید ہو سکتی ہے عام پڑھے لکھے لوگ اس سے کم فائدہ اٹھا سکیں گے۔

اس قسم کی اہم کتابوں کے ہندی میں منتقل کرنے کے ساتھ یہ ضرورت ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ہندی عام فہم ہندی رہے سنسکرتی ہندی یا سنسکرت آمیز ہندی مقصد کے لئے مفید نہیں ہو سکتی اس سے تو صرف ایک مخصوص طبقہ ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے بقیہ دو جلدیں بھی جس قدر جلد شائع ہوں اچھا ہے۔

۱۹۵۲ء: مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول
لغت قرآن پر بے مثل کتاب طبع دوم قیمت للعہ، مجلد صہ
سرمایہ - کارل مارکس کی کتاب "کیپٹل" کا ملخص شستہ
و رفتہ ترجمہ، جدید ایڈیشن - قیمت عہ

اسلام کا نظام حکومت - اسلام کے ضابطۂ
حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث زیر طبع
خلافت بنی امیہ - تاریخ ملت کا تیسرا حصہ قیمت [illegible]
مجلد [illegible] مضبوط اور عمدہ جلد [illegible]

۱۹۵۳ء: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم
و تربیت - جلد اول اپنے موضوع میں بالکل جدید
کتاب قیمت للعہ، مجلد صہ

نظام تعلیم و تربیت جلد ثانی جس میں تحقیق و تفصیل
کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ قطب الدین ایبک کے وقت
سے اب تک ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و
تربیت کیا رہا ہے قیمت للعہ، مجلد صہ

قصص القرآن جلد سوم - انبیاء علیہم السلام کے واقعات
کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت صہ، مجلد ستے

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی
قیمت للعہ، مجلد صہ

۱۹۵۴ء: قرآن اور تصوف - حقیقی اسلامی تصوف
اور مباحث تصوف پر جدید اور محققانہ کتاب قیمت
عا، مجلد ستے

قصص القرآن جلد چہارم - حضرت عیسیٰ اور رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات
کا بیان ——— زیر طبع

انقلاب روس - انقلاب روس پر بلند پایہ تاریخی
کتاب قیمت ستے

۱۹۵۵ء: ترجمان السنۃ - ارشادات نبوی کا جامع
اور مستند ذخیرہ صفحات ۶۰۰ تقطیع ۲۲×۲۹ جلد اول
قیمت [illegible] مجلد [illegible]

تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ مع تنقید و تحقیق
از مترجم و نقشہائے سفر قیمت ستے

جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو - یوگوسلاویہ
کی آزادی اور انقلاب پر نہایت خیز و دلچسپ کتاب قیمت [illegible]

۱۹۵۶ء مسلمانوں کا نظم مملکت - مصر کے مشہور مصنف
ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم اے پی ایچ ڈی کی محققانہ کتاب
"النظم الاسلامیہ" کا ترجمہ قیمت [illegible] مجلد صہ

مسلمانوں کا عروج و زوال طبع دوم قیمت [illegible] مجلد [illegible]

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم
قیمت للعہ، مجلد صہ

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی - قیمت ۶ر

مفصل فہرست دفتر سے طلب فرمائیے جس سے
آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

منیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۸ء: اسلام میں غلامی کی حقیقت - جدید اڈیشن جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت سے مجلد [illegible]

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ زیر طبع

سوشلزم کی بنیادی حقیقت - اشتراکیت کے متعلق جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ معہ مقدمہ از مترجم — زیر طبع

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

۱۹۳۹ء: نبی عربی صلعم - تاریخ ملت کا حصہ اول - جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے - جدید اڈیشن جس میں اخلاق نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے قیمت [illegible] مجلد [illegible]

فہم قرآن - جدید اڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے قیمت [illegible] مجلد [illegible]

غلامانِ اسلام - اسی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید اڈیشن قیمت [illegible] مجلد [illegible]

اخلاق اور فلسفہ اخلاق - علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید اڈیشن جس میں حک و فک کے بعد غیر معمولی اضافے کیے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین اور سہل کیا گیا ہے - زیر طبع -

۱۹۴۰ء: قصص القرآن جلد اول - جدید اڈیشن حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات و واقعات تک - قیمت [illegible] مجلد [illegible]

وحی الٰہی - مسئلہ وحی پر جدید محققانہ کتاب زیر طبع

بین الاقوامی سیاسی معلومات - یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے کے لائق ہے ہماری زبان میں بالکل جدید کتاب - قیمت [illegible]

تاریخ انقلاب روس - ٹراٹسکی کی کتاب تاریخ انقلاب روس کا مستند و مکمل خلاصہ - جدید اڈیشن [illegible] (زیر طبع)

۱۹۴۱ء: قصص القرآن جلد دوم حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ کے حالات تک دوسرا اڈیشن [illegible] مجلد [illegible]

اسلام کا اقتصادی نظام: وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے تیسرا اڈیشن [illegible] مجلد [illegible]

مسلمانوں کا عروج و زوال - صفحات ۵۰۰ جدید اڈیشن قیمت [illegible] مجلد [illegible]

خلافت راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) جدید اڈیشن قیمت [illegible] مجلد [illegible] مضبوط اور عمدہ جلد قیمت [illegible]

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - جدید اڈیشن جس میں نظرثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت سے مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ زیر طبع

سوشلزم کی بنیادی حقیقت - اشتراکیت کے متعلق جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ مع مقدمہ از مترجم — زیر طبع

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

۱۹۳۹ء نبی عربی صلعم - تاریخِ ملت کا حصہ اول - جس میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے۔ جدید اڈیشن جس میں اخلاقِ نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے قیمت عہ مجلد عہ

فہم قرآن - جدید اڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد عہ

غلامانِ اسلام - اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید اڈیشن قیمت عہ مجلد عہ

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق - علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید اڈیشن جس میں حک و فک کے بعد غیر معمولی اضافے کیے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین اور سہل کیا گیا ہے - زیر طبع -

۱۹۴۰ء قصص القرآن جلد اول - جدید اڈیشن حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارونؑ کے حالات و واقعات تک - قیمت عہ مجلد عہ

وحی الٰہی - مسئلہ وحی پر جدید محققانہ کتاب زیر طبع

بین الاقوامی سیاسی معلومات - یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے کے لائق ہے ہماری زبان میں بالکل جدید کتاب - قیمت عہ

تاریخ انقلاب روس - ٹراٹسکی کی کتاب تاریخ انقلاب روس کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید اڈیشن عہ (زیر طبع)

۱۹۴۱ء: قصص القرآن جلد دوم حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ کے حالات تک، دوسرا اڈیشن عہ مجلد عہ

اسلام کا اقتصادی نظام: وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے تیسرا اڈیشن عہ مجلد عہ

مسلمانوں کا عروج و زوال - صفحات ۳۵۰ جدید اڈیشن قیمت عہ مجلد عہ

خلافتِ راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) جدید اڈیشن قیمت عہ مجلد عہ، مضبوط اور عمدہ جلد قیمت عہ

برہان

جلد بست و سوم　　شمارہ (۶)

دسمبر ۱۹۴۹ء مطابق صفر المظفر ۱۳۶۹ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

مہامہو پادھیا ڈاکٹر لچھمی دھر ایم۔ اے پی۔ ایچ ڈی دہلی یونیورسٹی میں شعبہ سنسکرت و ہندی کے صدر ہیں۔ ان دونوں مضامین میں ہمہ گیر شہرت کے ساتھ عام علم و فضل کا یہ عالم ہے کہ انگریزی میں تقریر کرتے ہیں تو اس زبان کے اچھے اچھے ماہر اور ادیب جھومتے اور وجد کرتے ہیں، اردو دہلی کی ٹکسالی بولتے اور لکھتے ہیں۔ فارسی ادب کے ذوق کا یہ حال ہے کہ سنائی، رومی عطار اور دوسرے صوفی شاعروں کے سینکڑوں اشعار برنوکِ زباں ہیں عربی سے بھی واقف ہیں قرآن مجید کی جستہ جستہ آیتیں یاد ہیں، انگریزی اور ہندی میں متعدد وقیع اور بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں فیلالوجی اور تصوف محبوب ترین مضامین ہیں عرب و ہند کے تعلقات پر عرصہ دراز سے ریسیرچ کر رہے ہیں۔ نسلاً کشمیری پنڈت ہیں اس لئے ہر شخص انھیں پنڈت جی ہی کہہ کر پکارتا ہے ہم خاندانی اور مذہبی زعامت کی وجہ سے پنڈت جواہر لال نہرو کے خاندان میں جب کبھی شادی بیاہ کی یا کوئی اور مذہبی تقریب ہوتی ہے تو مہامہو پادھیا ہی اسے سرانجام دیتے ہیں مجھ کو اگرچہ ایک عرصہ تک کالج اور یونیورسٹی میں پنڈت جی کے ساتھ ایک رفیق کار کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا ہے لیکن سن و سال اور علم و فضل کے تفاوت کے باعث میں نے ہمیشہ ایک بزرگ کی طرح ان کا ادب و احترام کیا اور انھوں نے میرے ساتھ شفقت و کرم کا وہی برتاؤ کیا جو بڑے چھوٹوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

ستمبر ۱۹۴۷ء کی ۳ تاریخ تھی، وقت کوئی نو اور دس بجے صبح کے درمیان کا، ہم چند پروفیسر جن میں پنڈت جی بھی تھے ایک کمرہ میں بیٹھے چاء پی رہے تھے، یہ وہ وقت تھا جب کہ پنجاب کے دونوں حصوں کو فتنہ و فساد کی آگ نے جلا کر بھسم کر دیا تھا۔ اور دہلی میں بھی اکا دکا واقعات ایک

طوفانِ عظیم کی آمد کا الارم بجا رہے تھے اس لئے موضوعِ گفتگو اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں ہر شخص اپنے اپنے تاثرات اور احساسات و خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ کوئی ہندوستان کی فرقہ وارانہ سیاست کو رو رہا تھا۔ کوئی لیگ پر برس رہا تھا اور کوئی کانگرس کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ اسے آزادی بطور خیرات قبول نہیں کرنی چاہئے تھی بلکہ انقلابی جدوجہد کی راہ سے انگریزوں کو یہاں سے نکالنا چاہتے تھا میں اور پنڈت جی دونوں چپ بیٹھے ہر ایک کی بات سن رہے تھے جب گفتگو ذرا دراز ہو گئی تو پنڈت جی نے حسب معمول اپنا سر اونچا کیا اور عینک کے شیشوں کے پیچھے اپنی بڑی بڑی اور خوبصورت آنکھوں میں ایک چمک پیدا کرتے ہوتے ——— ایسی چمک جو ان کے قلبی سوز و گداز کا پتہ دے رہی تھی ———

موضوعِ سخن پر اپنے تاثرات بیان کرنے شروع کئے پنڈت جی اس مجمع کے سب لوگوں کے بزرگ تھے اور ان کے علم و فضل کی یوں بھی سب پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی اس لئے انھوں نے بولنا شروع کیا تو سب خاموش ہو گئے اور ہمہ تن متوجہ ہو کر ان کی تقریر سننے لگے چاء کی پیالی جس کے ہاتھ میں جس پوزیشن میں تھی اسی میں رہ گئی۔

پنڈت جی شروع میں آہستہ اور رک رک کر بولتے ہیں ایک جملہ کہہ کر سر نیچا کر لیتے ہیں کہ گویا کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے ہیں پھر سر اٹھا کر گردن ذرا ٹیڑھی کرتے ہیں اور بولنا شروع کرتے ہیں یہاں تک کہ سلسلۂ تقریر کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کا لہجہ بھی بلند ہوتا جاتا ہے الفاظ کی روانی بڑھتی جاتی ہے اور پھر تو یہ عالم ہوتا ہے کہ فقرہ فقرہ پر فصاحت بلائیں لیتی ہے بلاغت حسن قبول کے پھول نچھاور کرتی ہے اور سننے والے ہمہ تن گوش ہو کر انھیں کی طرف متوجہ رہتے ہیں اب اپنے اسی خاص انداز میں بولتے بولتے پنڈت جی ایک بیک مجھ سے مخاطب ہوتے اور بولے "سعید صاحب! ہندوستان کی تقسیم سے مسلمانوں کو فائدہ ہوا یا نقصان اس کو بحیثیت مسلمان کے آپ اچھی طرح جان سکتے ہیں لیکن میں تو ایک ہندو ہونے کی حیثیت

سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس تقسیم نے ہندوؤں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیا، اس خیال میں کوئی خاص ندرت نہیں تھی اس لئے میں کسی قدر بے توجہی سے بولا "آپ کی مراد سیاسی نقصان ہے؟" پنڈت جی نے فوراً کہا "میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اس لئے مجھ کو اس سے کیا واسطہ" میں نے پھر کہا "تو کیا آپ کی مراد سماجی اور معاشرتی نقصان ہے؟ پنڈت جی نے زور دیتے ہوئے کہا "جی! یہ نقصان تو ہے ہی۔ ہر شخص اسے جانتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے باعث ہندوؤں کو بہت سے معاشرتی اور سماجی فائدے پہنچے۔ مثلاً عورتوں کے حقوق۔ بیوہ عورتوں کی شادی۔ عورتوں کی وراثت۔ چھوت چھات کا قلع قمع۔ لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مذہبی اعتبار سے بھی بڑا نقصان پہنچ گیا" پنڈت جی نے مذہب کا نام لیا تو میں خاص طور پر اور ہمارے سب رفیق عموماً بڑے چونکنے ہوئے۔ اور میں نے گھبرا کر بڑے تعجب سے پوچھا "یہ کیوں کر؟ ہندو کو تقسیم ہند سے مذہبی نقصان پہنچ گیا! یہ بڑی عجیب سی بات ہے، ذرا تفصیل سے بیان فرمایئے پنڈت جی نے جھک کر اور آنکھوں کو ایک کیفیت رقص دیتے ہوئے کہنا شروع کیا "سنیئے! ہمارے مقدس ویدوں میں بھی خدا کی توحید ذات وصفات کا وہی عقیدہ پایا جاتا ہے جو قرآن مجید میں ہے لیکن جس طرح ایک مدت کے بعد اسلام کی توحید خالص مشرکانہ اعمال وافعال سے داغدار ہو گئی یعنی مسلمان پیر پرستی، قبر پرستی اور مزار پرستی کرنے لگے ٹھیک اسی طرح مقدس ویدوں کے ماننے والے شروع شروع میں شخصیت پرستی کا شکار ہوئے اور اسی چیز نے آگے چل کر مورتی پوجا کی شکل اختیار کر لی جو ویدوں کی تعلیم کے بالکل خلاف تھی اور اس میں اس درجہ غلو ہوا کہ توحید کا عقیدہ قریب قریب فنا ہو گیا اور مورتی پوجا ہی مذہب ہو گئی۔ پھر ہندوستان میں مسلمان علما اور صوفیا نے توحید کا پرچار کیا اور بڑے زور شور سے کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو دماغ بھی متاثر ہوئے اور انھوں نے اب سوسائٹی کے مروجہ رسوم و عوائد سے ہٹ کر اپنی مذہبی کتابوں کی طرف رجوع کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ دراصل ان کا مذہب بھی خدا کی توحید کا وہی عقیدہ رکھتا ہے جو اسلام کا عقیدہ ہے۔ چنانچہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج ہندوستان میں ۷۵ فیصدی تعلیم یافتہ

ہندو خدا کی توحید کا ہی عقیدہ رکھتے ہیں اور مورتی پوجا کے قائل نہیں ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے ساتھ رہن سہن سے ہندو کو بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ وہ اپنے مذہب کی اصل تعلیم سے باخبر ہو گیا اور اس نے خدا کے متعلق اپنا عقیدہ درست کر لیا" یہ سن کر میں نے عرض کیا "پنڈت جی یہی تو وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنی نسبت اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اس سے پہلے آئی ہوئی آسمانی کتابوں کا مُصدِّق ہے اور یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جن میں خدا کا کوئی پیغمبر نازل نہ ہوا ہو لیکن چونکہ بہت قدیم مذاہب وادیان کی کتابیں مختلف تاریخی اسباب کی بنا پر اپنی اصل شکل وصورت میں قایم نہیں رہ سکی ہیں اس لئے قرآن میں اور ان میں تضاد نظر آتا ہے ورنہ اگر ایک محقق کتبِ سابقہ کی اصل وضع وہیئت تک رسائی حاصل کر سکے تو وہ صاف طور پر معلوم کر لیگا کہ ان کتابوں میں خدا۔ اس کی ذات وصفات۔ ایمان بالرسل۔ اور عقیدۂ آخرت اور جزا وسزا اور اعمال نیک وبد کے متعلق بعینہٖ وہی تعلیمات ہیں جو قرآن میں ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لئے اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے علاوہ کتب سابقہ اور گذشتہ پیغمبروں پر بھی ایمان لانے کو کیوں ضروری قرار دیا جاتا"، میں نے پھر کہا" پنڈت جی! مجھ کو ہمیشہ رونا تو اسی کا رہا ہے کہ ہمارے علماء کرام نے اسلام کے لئے کیا کچھ نہ کیا۔ لیکن ایک کام جو کرنے کا تھا اور نہایت ضروری تھا وہ چند ایک کو مستثنیٰ کر کے کسی نے بھی نہیں کیا یعنی علماء کا یہ فرض تھا کہ وہ سنسکرت اور عبرانی وغیرہ دوسری زبانیں جن میں مختلف مذہبوں کی آسمانی کتابیں نازل ہوئی ہیں اُن کو سیکھتے اور ان کے ذریعہ ان کتابوں کا براہ راست مطالعہ کرتے اور ان میں اگر کچھ تحریف ہوئی ہے تو اس کا سراغ لگا کر اصل حقیقت کا پتہ چلاتے تاکہ وہ قرآن مجید کے "مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ" ہونے کے دعویٰ کو دنیا پر ثابت کر سکتے۔ اگر علما حدیث وفقہ پر ہزاروں کتابیں لکھنے کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی کرتے تو آپ دیکھتے کہ آج دنیا کی تاریخ یکسر کچھ سے کچھ ہوتی۔ مذہب کے نام پر جو خونریزیاں ہوئیں وہ نہ ہوتیں اور یا تو سب کا مذہب ہی ایک ہوتا اور اگر یہ نہیں تو کم از کم ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کے لوگوں سے ایسا متنفر نہ ہوتا جیسا کہ آج

نظر آتا ہے ہمارے علما کو سوچنا چاہیئے تھا کہ آخر قرآن میں جگہ جگہ جو دوسرے مذاہب وادیان اور اُن کے پیغمبروں کا ذکر اور خود اپنے متعلق ان سب کے مصدق ہونے کا دعویٰ مذکور ہے اور پھر اسلام کی شرط منجملہ اور چیزوں کے ایمان بالکتب والرسل بھی لازمی اور ضروری ہے تو یہ سب کچھ یوں ہی اور بغیر کسی خاص اور اہم مقصد کے نہیں ہو سکتا۔ لیکن صد حیف! علماء نے قرآن کی تعلیمات کے اس اہم گوشہ کو ایسا نظر انداز کر دیا کہ گویا وہ قرآن کا کوئی جز ہی نہیں تھا۔ کچھ علماء اس طرف متوجہ ہوئے بھی تو انھوں نے اپنے کتب قدیمہ کے علم سے مناظرہ و مجادلہ میں کام لیا جس کی وجہ سے بعد وافتراق کی خلیج کم ہونے کے بجائے اور وسیع سے وسیع تر ہو گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مذہب کا پیرو اسلام کو اپنا دشمن سمجھنے لگا حالانکہ اسلام کسی کا دشمن نہیں وہ ہر ایک کا خیر خواہ اور اس کا دوست ہے وہ ہر مذہب کے متعلق یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس میں خدائی روشنی موجود ہے۔ البتہ وہ یہ کہتا ہے کہ آسمان پر سورج نہیں چمکتا تو چاند اور ستارے جگمگاتے ہیں اور اس وقت ہر متنفس کا حق ہے کہ وہ ان کی روشنی سے کسب فیض کرے لیکن جب سورج نکل آتا ہے اور وہ تمام ستاروں اور چاند کی روشنیوں کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے اپنی کرنیں کارگاہ ہست و بود کے ہر ہر ذرہ پر بکھیر دیتا ہے تو پھر اس وقت یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ لوگ اندھیری کوٹھریوں میں بند ہو کر سورج کی کرنوں سے کسب فیض کرنے سے انکار کر دیں اور رات کا انتظار اس لئے کریں کہ چاند اور ستاروں سے ہی روشنی حاصل کریں گے۔

یہاں پہنچ کر میں نے اپنی تقریر کا رخ پلٹتے ہوتے کہا " دیکھئے پنڈت جی! آپ نے فرمایا کہ مقدس دیدوں میں بھی خدا کی توحید کی تعلیم ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہمارے محققین صوفیا بھی اس سے بے خبر نہیں تھے چنانچہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات " الکلمات الطیبات " میں صاف لکھا ہے کہ ہمارے ملک کے ہندو اہل کتاب ہیں کیونکہ ان کے اصل مذہب میں خدا کی وحدانیت کا ہی عقیدہ پایا جاتا ہے اور ان کی کتاب آسمانی کتاب ہے" ان کے علاوہ

علماء کے ایک بڑے طبقہ کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں جن مشرکین کا ذکر ہے ہندوستان کے ہندو ان کا مصداق نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے مراد مکہ کے مشرکین ہیں جو کوئی کتاب نہیں رکھتے تھے اور بتوں کو شریک خدائی سمجھ کر اور حوادث دہر میں موثر بالذات وفعال مان کر ان کی پوجا کرتے تھے

اتنا کہہ کر میں نے عرض کیا " مگر پنڈت جی! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر تعلیم یافتہ اور صحیح الفکر ہندو خدا کی توحید کے قائل ہیں۔ تو اگرچہ آپ کے ارشاد کے مطابق اس میں مسلمانوں کے ساتھ رہن سہن کو بڑا دخل ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اب ہندوستان کی تقسیم سے ان کے اس عقیدہ کو کیوں نقصان پہنچے گا کیونکہ انھوں نے یہ عقیدہ تو اس کو حق سمجھ کر اور اپنے مذہب کا عقیدہ جانکر قبول کیا ہے نہ کہ مسلمانوں کے جبر یا اُن کے دباؤ سے " اب پنڈت جی نے پھر اپنا سر اُٹھایا اور فرمانے لگے کہ " جی ہاں! اس عقیدہ کو قبول تو انھوں نے اپنا مذہبی اور سچا عقیدہ جان کر ہی کیا ہے۔ لیکن شعوری یا غیر شعوری طور پر تعلیم یافتہ ہندو یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ اس عقیدہ سے بہت دور جا پڑنے کے بعد ان کا اب پھر ادھر رجوع زیادہ تر اسلامی کلچر سے آشنا ہونے کا نتیجہ ہے اس بناء پر اب جب کہ ملک کی تقسیم انتہائی نفرت۔ دشمنی اور بغض وعناد کی وجہ سے ہوئی ہے اس لئے ہو گا یہ کہ ہندو نفرت اور دشمنی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر ہر اُس چیز کو خواہ اس سے اس کا کتنا ہی گہرا تعلق رہا ہو اور اس میں کیسا ہی اس کا اپنا فائدہ ہو، یک قلم چھوڑ دے گا جس کو مسلمانوں کے ساتھ نسبت ہو چنانچہ اب تک ہندو بھی شیروانی اور آڑا پاجامہ پہنتے تھے اور وہ کیا بھلا لگتا تھا لیکن اب آئندہ ہندو محض اس لئے اس کو نہیں پہنیں گے کہ مسلمان اس کو پہنتے ہیں! اردو ہندو بھی بولتے اور لکھتے تھے لیکن اب محض اس بناء پر نہ اسے بولیں گے اور نہ پڑھیں گے کہ اس کو مسلمانوں سے قریبی تعلق ہے " میں نے عرض کیا " یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ اگر آپ کا دشمن کپڑے پہنے ہوئے ہے تو آپ اس کی مخالفت میں خواہ مخواہ ننگے ہو جائیں اور اگر وہ پھولوں کا ہار پہنے ہوئے ہے تو آپ اس کو چڑانے کے لئے کانٹوں کی مالا اپنی گردن میں ڈال لیں " ارشاد ہوا " کہ ہاں عقل کی بات

تو یہی ہے کہ ایسا نہ ہونا چاہئے۔ لیکن غصہ میں جب انسان کی عقل ٹھکانہ سے نہیں ہوتی تو وہ اکثر اوقات اپنے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر۔ یا زہر کی پھنکی مار کر اپنا کام ہی تمام کر لیتا ہے۔“

پنڈت جی کی اور میری یہ گفتگو ہنگامۂ دہلی سے پہلے کے زمانۂ امن کی آخری گفتگو تھی۔ پھر تین ماہ بعد ان سے ملاقات ہوئی تو اس عالم میں کہ قرول باغ میں میرا گھر لٹ چکا تھا۔ اور میں اور بچے گھر اور اس کے سب سامان سے بے دخل ہو کر خانماں خراب زندگی بسر کر رہے تھے اور دوسری جانب ستیارام کے بازار میں پنڈت جی کے گھر اور اس کے سامان کو دستبرد کیا جا چکا تھا۔

تفسیر مظہری

امام ابراھیم نخعی

(۲)

(مولانا ابو محفوظ الکریم صاحب معصومی اُستاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

امام نخعی کے جمیع مراسیل صحیح ہیں، سوائے دو حدیثوں کے، ایک تاجر البحرین والی حدیث اور دوسری حدیث[1] الضحک

بہ قول ابن معین[2] حضرت سعید بن المسیب کے مراسیل دیگر ائمہ کے مراسیل سے زیادہ صحیح ہیں۔ حضرت امام شافعی فرماتے ہیں:۔

"وإنما قبلت[3] مراسيل سعيد بن المسيب لأني تتبعتها فوجدتها مسانيد وأكثر ما رواه مرسلا إنما سمعه عن عمر رضي الله عنه	میں نے سعید بن المسیب کے مراسیل کو قبول کیا، اس لئے کہ تلاش و تتبع کے بعد میں نے ان کو مسند پایا، اور اکثر روایت جسے انھوں نے مرسلاً روایت کی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مسموع ہے۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:۔

مرسلات[4] سعيد أصح المرسلات	سعید کی مرسل روایتیں اصح المرسلات ہیں

امام نخعی کے مراسیل کے متعلق امام احمد بن[5] حنبل کا خیال حسب ذیل ہے:۔

ومرسلات[6] إبراهيم لا بأس بها	اور ابراہیم کے مراسیل میں کوئی حرج نہیں

---

[1] البیہقی فی السنن ج ۱ ص ۱۴۸، الطحاوی فی شرح معانی الآثار ج ۱ ص ۱۳۳، الزیلعی فی النصب ج ۱ ص ۴۶ عن ابی معین [2] تدریب ص ۷۰، تہذیب: ج ۱ ص ۷۰۱ [3] کتاب التحقیق، عبد العزیز بخاری ص ۱۴۸ [4] تدریب: ص ۶۹ [5] تدریب: ص ۶۹ [6] امام نخعی کے متعلق امام احمد بن حنبل کا مزید خیال ابوزرعہ عبد الرحمٰن بن عمرو بن صفوان دمشقی (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کوفہ میں امام نخعی کے ہمسر امام شعبی تھے، وہ بھی کثیر الارسال تھے، فنِ جرح و تعدیل کے مشہور امام ابن معین، امام نخعی کے مراسیل کو امام شعبی کے مراسیل پر ترجیح دیتے ہوتے کہتے ہیں:-

مراسیل ابراھیم أحب الی من مراسیل الشعبیؒ	ابراہیم کے مراسیل میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہیں شعبی کے مراسیل سے۔

مراسیل نخعی کے متعلق امام ابن معین ہی کا قول ہے:

أعجبُ الیّ من مرسلات سالم بن عبداللہ والقاسم وسعید بن المسیب	نخعی کے مراسیل، سالم بن عبداللہ، قاسم اور سعید بن المسیب کے مراسیل سے زیادہ پسندیدہ ہیں

امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) نے امام نخعی کے ان مراسیل کو قابل قبول ٹھہرایا ہے جن کا تعلق حضرت ابن مسعودؓ سے ہے۔

ایک دفعہ امام نخعی سے ان کے شاگرد ابو ہاشم نے پوچھا کہ کیا آپ کو کوئی مسند حدیث نہیں ملی ہے؟ تو امام موصوف نے کہا ضرور ملی ہے لیکن قال عبداللہ، قال علقمہ، قال الاسود کہنے میں زیادہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے مندرجہ ذیل بیان سے ظاہر ہوتا ہے:-

"قال سمعت احمد بن حنبل یسأل عن سفیان ومالك اذا اختلفا فی الروایة فقال مالك اکبر فی قلبی، قلت فمالك والاوزاعی اذا اختلفا، فقال مالك احب الی وان کان الاوزاعی من الائمة قیل لہ فمالك وابراھیم النخعی فقال ھذا ـــ کأنہ شنعہ ـــ ضعہ مع أھل زمانہ"	"امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا، کہ سفیان اور مالک میں جب اختلاف ہو تو کس کو ترجیح دی جائے گی؟ کہا میرے دل میں مالکؒ کی وقعت زیادہ ہے میں (ابوزرعہ) نے کہا اور جب مالک و اوزاعی میں اختلاف ہو؟ تو کہا مالک کو میں زیادہ پسند کرتا ہوں گرچہ اوزاعی ائمہ میں سے ہیں۔ پھر سوال کیا گیا اگر مالک اور ابراہیم نخعی میں اختلاف ہو؟ تو کہا ان کو اپنے معاصرین کے ساتھ رکھو، گویا امام موصوف نے تشنیع کی"۔

(الانتقاء لابن عبد البر القرطبی ص ۳۰)

[1] تدریب: ص ۷۰، تہذیب: ج ۱ ص ۱۷۷ [2] تدریب: ص ۷۰ [3] تہذیب: ج ۱ ص ۱۷۷
[4] طبقات ابن سعد ج ۶ (نخعی)

آسانی ہوتی ہے۔

اعمش نے امام نخعی سے کہا کہ ابن مسعود کی روایت سند کے ساتھ بیان کیجئے تو نخعی نے کہا۔

اذا حدثتکم عن رجل فھو الذی سمعت	جب کسی کا نام لے کر حدیث بیان کردوں تو سمجھو
واذا قلت قال عبد اللہ فھو عن غیر	کہ صرف اسی سے میں نے سنا اور جب کہوں کہا
واحد عن عبد اللہ	عبداللہ نے تو سمجھ لو کہ عبداللہ سے روایت کرنے والے ایک سے زائد ہیں۔

گویا نخعی نے اعمش کو اپنا اصول بتادیا ہے جس کا خلاصہ امام طحاوی کی زبانی سنیئے:

قال ابو جعفر فاخبرنی ان ما ارسلہ	ابو جعفر نے کہا: ہمیں (امام) نخعی نے یہ بتادیا کہ ان
عن عبد اللہ فمخرجہ عندہ اصح من	کی وہ روایت جو ابن مسعود سے مرسلاً مروی ہوگی
مخرج ما ذکر عن رجل بعینہ عن	اس روایت سے اصح ہوگی جو کسی معین شخص کے
عبد اللہ	واسطے سے ابن مسعود سے مروی ہوگی۔

اس بنا پر ارباب علم کا یہ فیصلہ ہے کہ امام نخعی، حضرت ابن مسعود سے جو مرسل روایت کرتے ہیں وہ اصح ہے اور گویا حضرت ابن مسعود سے علی التواتر مروی ہے۔

مقاطیع نخعی | وہ تابعین جو صحابہ کرام کے عہد میں مقدمات فیصل کرنے لگے تھے اور فتاوی صادر کیا کرتے تھے، ان کے اقاویل حجت سمجھے جاتے ہیں۔ محدثین کرام ان کے اقوال کو مقطوع کہتے ہیں عطاء بن ابی رباح، سعید بن المسیب، امام نخعی وامثالھم اصحاب مقاطیع ہیں۔ اور ان کے اقوال حجت ہیں، امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں فرماتے ہیں:-

وکان سعید بن المسیب لسان فقھاء	سعید بن المسیب فقہائے مدینہ کی زبان تھے، حضرت
المدینۃ وکان احفظھم لقضایا عمر	عمر کے فیصلے اور ابوہریرہ کی حدیثیں ان کو خوب یاد

لہ تہذیب: ۱/۱۷۷ ایضاً کتاب التحقیق ص۱۴۹ ؎ معانی الآثار: ج ۱ ص ۱۲۳ ؎ معانی الآثار: ص۔ ؎ التوضیح، اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۳۲ ؎ سنن دارقطنی، اعلام الموقعین ج ۱ ص ۷، ص ۹ ؎ ج ۱ ص ۱۵۱ طبع مصر

لحدیث ابی ھریرۃ، وابراھیم لسان فقھاء الکوفۃ فاذا الکلما الشئی ولم ینسباہ الی احد فانہ فی الاکثر منسوب الی احد من السلف صریحا او ایماء

تھیں اور ابراہیم فقہائے کوفہ کی زبان تھے یہ دونوں جب کسی مسئلہ میں بولیں اور اپنے قول کو کسی کی طرف منسوب نہ کریں تو بھی ان کے اکثر اقوال سلف میں سے کسی کی طرف صریحاً یا ایماءً منسوب ہوتے ہیں

تحریر حدیث اور تقئید علم | خود آنحضرت کے عہدِ میمون میں تحریرِ حدیث اور تقئیدِ علم کی مثالیں ملتی ہیں، حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو آں حضرت نے خطبہ ارشاد فرمایا، ایک یمنی ابوشاہ نامی نے آپ سے درخواست کی کہ خطبہ لکھ دیا جائے تو آپ نے فرمایا ابوشاہ کے لئے لکھ دو[۱]، عمرو بن حزم کے لئے آپ نے دیات، صدقات، اور فرائض و سنن کے مسائل لکھوائے[۲]، ابوجعفر محمد بن علی کہتے ہیں کہ سرورِ کائنات کی تلوار کی کاٹھی سے ایک صحیفہ برآمد ہوا جس میں لکھا تھا۔

ملعون[۳] من اضل اعمی عن سبیل ملعون من سرق تخوم الارض ملعون من تولی غیر موالیہ اوقال ملعون من جحد نعمۃ من انعم علیہ

وہ شخص ملعون ہے جس نے کسی اندھے کو راستہ سے بھٹکا دیا۔ ملعون ہے وہ جس نے زمین کے حدود چوری کیئے، ملعون ہے وہ جو بلاحق تولیت متولی بن بیٹھا، یا کہا، ملعون ہے وہ جس نے انعام کرنے والے کی نعمت کا انکار کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کا مشہور مجموعۂ احادیث خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، اس کا نام "الصادقہ" تھا، اس کی روایت عمرو بن شعیب اپنے والد سے، اور وہ حضرت عبداللہ سے کرتے تھے، بعض ائمہ اہل حدیث نے اس کو ایوب عن نافع عن ابن عمر کا درجہ دیا ہے اس مجموعہ سے ائمہ اربعہ وغیرہ نے احتجاج بھی کیا ہے[۴]

حضرت عبداللہ بن عمرو کو بارگاہ نبوت سے کتابت کی اجازت ملی تھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

[۱] ابوداؤد مع عون المعبود ج ۳ ص ۳۵۷، ترمذی ج ۲ ص ۳۸۳ [۲] مفتاح السنۃ، عبدالعزیز الخولی ص
[۳] عبدالعزیز الخولی، مفتاح السنۃ [۴] ایضاً مفتاح السنۃ۔

فإني[1] أعي بقلبي وكان يعي بقلبه ويكتب بيده واستأذن النبي صلى الله عليه وسلم فأذن له

میں دل سے یاد کرتا ہوں اور وہ (عبداللہ بن عمرو) دل سے یاد کرتے تھے، اور ہاتھ سے لکھتے تھے، انھوں نے آں حضرت سے کتابت کی اجازت چاہی تو آپ نے اجازت دی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو آں حضرت کا فرمان نقل کرتے ہیں:۔

أكتب[2] فو الذي نفسي بيده ما خرج منه إلا حق

لکھو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ اس (دہان مبارک) سے حق ہی نکلتا ہے

حضرت رافع بن خدیج فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں نے آں حضرت سے کتابتِ حدیث کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے فرمایا۔

اكتبوا[3] ولا حرج

لکھو، کوئی حرج نہیں ہے

حضرت ابوبکر[4] صدیق رضؓ حضرت علی کرم اللہ وجہہ[5]، حضرت انس رضؓ، حضرت ابن عباس[6] رضؓ، حضرت ابوہریرہ[7]، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ، سمرۃ بن جندب رضوان اللہ علیہم اجمعین سے تحریر حدیث ثابت ہے اور ان میں سے اکثر کے پاس صحیفے[8] بھی تھے

تابعین میں سے سالم (م ۱۰۶ھ) صالح بن کیسان، ابوالزناد، رجاء بن حیوۃ[9] (م ۱۱۲ھ) حسن بصری[10] وغیرہ کے شاگرد حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے، حضرت سعید[11] بن جبیر بسا اوقات حضرت ابن عباس سے روایتیں سن کر بقید تحریر لے آتے تھے

---

[1] سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۷۷، طحاوی ج ۲ ص ۳۸۵، ترمذی ج ۲ ص ۳۸۲ [2] دارمی ص ۶۷ [3] مجمع بحوالہ طبرانی ج ۱ ص ۱۵۱ [4] کنزالعمال: ۵/۲۳۷ [5] جامع بیان العلم وفضلہ لابی عمر یوسف بن عبدالبر بحوالہ مفتاح السنۃ للخولی ص ۷ [6] ترمذی ۲/۲۳۸، طحاوی ۲/۳۸۴ [7] طحاوی ۲/۳۸۵، ابن سعد ۵/۲۱۶، فتح الباری ج ۱ ص ۱۸۴ [8] علم حدیث کے مبادیات مصنفہ مفتی سید عمیم الاحسان البرکتی، قلمی [9] ترمذی ۲/۲۳۸ [10] کنزالعمال ۵/۲۳۷ [11] تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۰۳ [12] دارمی ص ۱۱۹ [13] ترمذی ۲/۲۳۹ [14] ابن سعد ۶/۱۷۹

صحابہ وتابعین میں کچھ ایسے بزرگ بھی تھے جو کتابت وتحریر کو ناپسند کرتے تھے، مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوموسیٰ اشعری امام شعبی و امام نخعی وغیرہم۔

ایک دفعہ حضرت ابن مسعود کے پاس ان کے اصحاب لکھے ہوئے کاغذات بہ غرض تصحیح وتبیین لائے، حضرت ابن مسعود نے اوراق لے اور دھوکر واپس کر دیئے لیکن معن کا بیان ہے کہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود نے ان کو ایک کتاب دکھائی، اور حلفیہ کہا کہ یہ ان کے والد حضرت عبداللہ بن مسعود کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

امام محمدؒ نے جب تدوین وتصنیف کا آغاز کیا تو امام ابویوسف ناخوش ہوئے، اس پر امام محمدؒ نے کہا کہ علم کے مٹ جانے کا خوف ہے اسی لئے میں نے لکھنا شروع کیا ہے، کیونکہ اب ابویوسف جیسے قوی الحافظہ بچے پیدا نہیں ہوں گے۔

امام نخعی نے جو کچھ حاصل کیا کاغذی صفحات پر لکھنے کے بجائے صفحۂ دل پر نقش کر رکھا نہ خود کبھی لکھنے کی عادت ڈالی نہ اپنے شاگردوں کے لئے یہ پسند کیا کہ کاغذ وقلم کے محتاج بنیں اپنے متعلق خود فرماتے ہیں۔

ماکتبت شیئاً قط	میں نے کبھی کسی بات کو نہیں لکھا

ایک جگہ کتابت کو ناپسند کرنے کی وجہ خود بیان کرتے ہیں:

قلما کتب انسان الا اتکل علیہ	ایسا کم ہوتا ہے کہ انسان کچھ لکھے اور اس پر بھروسہ
وقلما طلب انسان علما الا آتاہ	نہ کرے اور ایسا کم ہوتا ہے کہ انسان علم طلب کرے اور
اللہ منہ مایکفیہ	اللہ اس کو کافی وافی نہیں دیتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نخعی کے مشہور شاگرد حماد کچھ دریافت طلب امور کے لئے آئے، ان کے

[1] علم حدیث کے مبادیات، قلمی [2] البستان لابی اللیث الفقیہ ص۵ طبع کلکتہ [3] مفتاح السنۃ خولی ص۷ [4] ایضاً حضرت علی کے صحیفہ کے لئے ملاحظہ ہو، مشکوٰۃ المصابیح ۲/۸۰ کتاب الصید والذبائح [5] کتاب البستان ص۵ [6] طبقات: ج۶ ص۱۸۹ [7] ایضاً طبقات [8] ایضاً طبقات

ساتھ اطراف (اوراق یادداشت) بھی تھے، نخعی نے پوچھا یہ کیا ہیں؟ کہا اطراف ہیں، نخعی نے برہم ہوکر کہا کیا میں نے تم کو ان سے منع نہیں کیا تھا!

اخیر عہد میں امام نخعی نے اپنا مسلک بدل دیا تھا، خود لکھتے اور کتابوں کی تحسین کرتے تھے، حماد تصریح کرتے ہیں:۔

عن[1] ابراھیم انہ کان یکرہ الکتب	ابراہیم سے منقول ہے کہ وہ کتابوں کو ناپسند
ثم حسنھا قال حماد ورأیت ابراھیم	کرتے تھے پھر انھوں نے ان کی تحسین کی، حماد
یکتب بعدہ	نے کہا کہ اس کے بعد میں نے ابراہیم کو لکھتے دیکھا

بعد میں جواز تحریر پر اجماع منعقد ہوگیا الفیہ عراقی[2] میں ہے:۔

واختلف الاصحاب والاتباع ۔ فی کتبۃ الحدیث والاجماع
علی الجواز بعدھم بالجزم لقولہ اکتبوا وکتب السھمی

نخعی اور ترتیب فقہ فقہ کی تدوین کا دور امام محمد کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے، لیکن اس کی ابتدائی ترتیب امام نخعی کے دور میں شروع ہو چکی تھی، مدینہ میں حضرت سعید بن المسیب اور کوفہ میں امام نخعی نے اس کام کو انجام دیا، امام نخعی کے پاس حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، ان کے اصحاب اور کوفہ کے فقہاء وقضاۃ کے فتاوے، قضایا اور فقہی اقوال تھے جن کی ترتیب سب سے پہلے امام نخعی کے ہاتھوں ہوئی، حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

وکان[3] سعید بن المسیب وابراھیم	سعید بن المسیب، ابراہیم (نخعی) اور ان کے
وامثالھما جمعوا ابواب الفقہ	امثال تمام فقہی ابواب کو جمع کر چکے تھے اور ہرباب
اجمعھا وکان لھم فی کل باب اصول	میں ان کے پاس وہ اصول تھے جو سلف سے
تلقوھا من السلف	ان کو ملے۔

علمائے احناف کا مشہور قول ہے:۔

---

[1] کتاب الآثار ص ۱۲۔ [2] علم حدیث کے مبادیات [3] حجۃ اللہ البالغہ: ج ۱ ص ۱۱۴ مصری

الفقه[1] زرعه ابن مسعود، وسقاه علقمة، وحصده ابراهيم، وداسه حماد، وطحنه ابوحنيفة، وعجنه ابو يوسف، وخبزه محمد، فسائر الناس اكلون من خبزه

ابن مسعود نے فقہ کی کھیتی کی، علقمہ نے آب پاشی کی، ابراہیم نے فصل کو کاٹا حماد نے دانے الگ کئے، ابوحنیفہ نے پیسا، ابویوسف نے آٹا گوندھا امام محمد نے روٹی پکائی، تب سب ان کی روٹی کھانے لگے۔

نخعی کے فصل کاٹنے کا مطلب بھی سن لیجئے:۔

ای جمع ما تفرق من فوائده ونوادره[2] وهياه للانتفاع به ابراهيم بن يزيد

یعنی ابراہیم بن یزید (نخعی) نے فقہی فوائد و نوادر کو جو منتشر تھے یکجا کر دیا، اور اس قابل بنا دیا کہ لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکیں

اسی مضمون کو کسی نے نظم میں ادا کیا ہے:۔

الفقه زرع ابن مسعود وعلقمة حصاده ابراهيم دوّاس

نعمان طاحنه يعقوب عاجنه محمد خابز والاكل الناس

لیکن شاعر ادا کرنے میں ناکام رہا ہے، چنانچہ حماد کو حذف کر دیا ہے، اور علقمہ کو حصاد، اور ابراہیم کو دواس بنا دینے پر مجبور ہوا ہے،

نخعی کے فقہ کا ماخذ | امام نخعی کا عمل زیادہ تر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اقوال و فتاویٰ پر تھا، بلکہ ان دونوں کے اقوال سے بہت کم تجاوز کرتے تھے اور اگر ان دونوں میں اختلاف ہوتا تو حضرت ابن مسعود کے قول کو ترجیح دیتے تھے، کیونکہ ان کا قول لطیف تر ہوتا تھا،[3]

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

واصل مذهبه فتاوى عبدالله بن

ان کے مذہب کا اصل عبداللہ بن مسعود کے فتاوے

[1] درمختار ج ۱ ص ۳۵ [2] رد المختار: ج ۱ ص ۳۵ [3] فجر الاسلام: ج ۱ ص ۲۸۹

مسعود و قضایا علیؓ و فتاواہ و قضایا شریح و غیرہ من قضاۃ الکوفۃ | حضرت علی کے قضایا، شریح اور دوسرے قضاۃ کوفہ کے فیصلے ہیں"

امام نخعی اور ان کے تلامیذ حضرت عبداللہ بن مسعود کو "اثبت الناس فی الفقہ" کہتے تھے،[1]

امام نخعی کے پاس جو فقہی مواد جمع تھے وہی بعد میں فقہ حنفی کے عناصر بنے، امام محمد کی کتاب الآثار ابوبکر بن ابی شیبہ کی مصنف اور جامع عبدالرزاق سے اگر امام نخعی کے اقاویل کی تلخیص کی جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ امام ابوحنیفہ، شاذ و نادر ہی امام نخعی کے مسلک سے اختلاف کرتے ہیں، اور اگر اختلاف بھی کرتے ہیں تو فقہائے کوفہ کے حلقہ سے باہر نہیں جاتے"[2]

امام نخعی کے چند اقوال | امام نخعی کے فقہی اقاویل، فتاوے اور اُن کے مراسیل و مقاطیع کا بہترین ذخیرہ امام محمد کی کتاب الآثار ہے، مصنف عبدالرزاق و مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ سے بھی ان کے اقاویل و مراسیل کی تلخیص اور ان کے مسلک کی تدوین کی جا سکتی ہے۔

یہاں امام موصوف کے چند کلمات نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

لا یستقیم رای الا بروایۃ ولا روایۃ الا برای[3] | بغیر دیکھے ہوئے رائے قائم کرنا صحیح نہیں اور نہ دیکھنا بغیر رائے قائم کئے صحیح ہے۔

اذا قلت فی الرجل ما فیہ فقد اغتبتہ وان قلت ما لیس فیہ فقد بہتہ[4] | اگر کسی کے متعلق تم نے وہ بات کہی جو اس میں ہے تو تم نے اس کی غیبت کی، اور اگر وہ بات اس میں نہیں ہے تو تم نے بہتان باندھا۔

البلاء مؤکل بالکلام[5] | بلاء الفاظ کے ساتھ بندھی ہے۔

اسروا ما شئتم واعلنوا ما شئتم ما من عبد یسر الا البسہ اللہ تعالیٰ رداء[6] | چھپاؤ جو چاہو اور ظاہر کرو جو چاہو جب بھی کوئی بندہ چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ایک چادر اوڑھا دیتا ہے۔

---

[1] الحجۃ، ص۱۵ [2] الحجۃ: ج ا ص۱۱۶ [3] البدایۃ، ابوالفداء: ج ۹ ص۱۴۱ [4] کتاب الآثار ص۱۱۵ [5] ایضاً ص۱۲۰ [6] ایضاً

اذا رایت الرجل یتھاون بالتکبیرۃ الاولی فاغسل یدیك من فلاحہ
جس کو دیکھو کہ تکبیرۂ اولی سے سستی برتتا ہے اس کے فلاح سے اپنے ہاتھ دھو بیٹھو

قرنِ صحابہ میں جو ہولناک خانہ جنگیاں ہوئیں ان کے متعلق امام عالی مقام نہایت حکیمانہ جملہ فرماتے ہیں

تلك دماء قد سلمت منھا ایدینا فلا نلطخ بھا السنتنا
اس خون سے ہمارے ہاتھ بچے رہے ہیں، لہذا اپنی زبان ہم اس سے ملوث نہیں کرتے۔

علامۂ ذہبی نے حسب ذیل قول بھی امام نخعی کی طرف منسوب کیا ہے:

ابوھریرۃ لیس بفقیہ　ابوہریرہ فقیہ نہیں ہیں

---

[۱] الہدایہ: ج ۹ ص ۱۴۱ [۲] کتاب البستان ص ۲۱۲ [۳] میزان الاعتدال: ج ۱ ص ۳۵، ذہبی کی عبارت یہ ہے: ونقموا علیہ قولہ: ابوھریرۃ لیس بفقیہ۔ ذہبی کا یہ بیان کسی محقق ذریعہ سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا، عمائد حنفیہ میں سے کسی کا یہ مسلک نہیں ہے، شیخ ابوالحسن کرخی اور ان کے اصحاب ہر عدل و ضابطہ کی روایت کو قیاس پر مقدم رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ روایت کتاب و سنت مشہورہ کے خلاف نہ ہو (کتاب التحقیق ص ۱۶۴) امام ابوحنیفہ و محققین حنفیہ کا مسلک حسب ذیل ہے:

فان محمدا رحمہ اللہ یحکی عن ابی حنیفۃ رضی اللہ عنہ فی غیر موضع انہ احتج بمذھب انس بن مالك رضی اللہ عنہ وقلدہ فما ظنك فی ابی ھریرۃ؟ حتی ان المذھب عند اصحابنا رحمھم اللہ فی ذلك انہ لا یرد حدیث امثالھم الا اذا انسد باب الرای والقیاس منہ اذا انسد صار الحدیث ناسخا للکتاب والحدیث المشھور معارضا للاجماع وذلك مثل حدیث ابی ھریرۃ

امام محمد امام ابوحنیفہ سے متعدد جگہ نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت انس کے مذہب سے احتجاج کیا، اور ان کی تقلید کی، تو ابوہریرہ کے متعلق تمہارا کیا گمان ہو سکتا ہے؟ اصحاب حنفیہ کا یہ مذہب ہے کہ انس و ابوہریرہ اور ان کے امثال کی حدیثیں اس وقت رد کی جائیں گی جبکہ ان پر عمل کرنے سے رائے و قیاس کا دروازہ بند ہونے لگے، ورنہ وہ کتاب و سنت مشہورہ کے لئے ناسخ اور اجماع کے معارض ہوں گی، اس کی مثال ابوہریرہ کی حدیث....

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اس قول کی نسبت امام نخعی کی طرف صحیح نہیں، البتہ اس کی نسبت علیسیٰ بن ابان اور قاضی ابوزید کی طرف کی جاتی ہے،

امام نخعی اور فرق مبتدعہ | امام نخعی امت کے داخلی فسادات سے بہت نالاں تھے، نئے نئے فرقے رونما ہو چکے تھے، جن کے شر سے عوام کا بچنا بہت مشکل تھا، ائمۂ حق ان فتنوں کو دیکھ رہے تھے اور بقدر طاقت ان سے بچے رہنے کی تاکید و تلقین کر رہے تھے، امام نخعی بھی اپنے اصحاب وحلقۂ معتقدین کو فرقِ مبتدعہ کی ریشہ دوانیوں سے بچنے کی ہدایت کرتے رہے۔

ایک شخص محمد نامی امام موصوف کی مجلس میں شریک ہوتا تھا، اس کے متعلق یہ معلوم ہوتے ہی کہ ارجاء کی باتیں کرتا ہے، آپ نے آنے سے منع کر دیا، محل کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنے شاگردوں کو مرجیہ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے منع کر دیا تھا، اعمش کہتے ہیں:

ذکر عند ابراھیم المرجئة فقال لھم البغض الیّ من اھل الکتاب

ابراہیم سے فرقۂ مرجیہ کا ذکر کیا گیا تو کہنے لگے کہ یہ لوگ میرے نزدیک اہل کتاب سے زیادہ برے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) فی المصراۃ انہ انسد فیہ باب الرای فصار ناسخا للکتاب والسنۃ المعروفۃ معارضا للاجماع فی ضمان العدوان الخ بزدوی، ص۲۴۹

..... (مصراۃ والی) ہے جو کتاب وسنت معروفہ کے لئے ناسخ اور اجماع فی ضمان العدوان کی معارض ہے۔

حضرت ابوہریرہ کی فقاہت ایک امر محقق ہے قرنِ صحابہ میں فتویٰ دینے کے لئے جس تو قد و تفقہ اور اجتہاد کی ضرورت تھی وہ ظاہر ہے سرورِ کائنات صلعم کی صحبت کی برکت سے صحابۂ کرام کو شرح صدر و بصیرت عامہ حاصل تھی، البتہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ خلفائے راشدین، حضرات عبادلہؓ، حضرت عائشہ و حضرت ابوموسیٰ اشعری وغیرہ کی معاملہ فہمی و فطانت بلاشبہ دیگر صحابہ سے بڑھی ہوئی تھی، صحابہ کرام میں باعتبار فہم و فراست جو اختلاف مراتب تھا اس کا اندازہ خود سرورِ کائنات روحی فداہ کے ارشاد گرامی سے ہو سکتا ہے کہ: لیلینی منکم اولو الاحلام والنھیٰ ثم الذین یلونھم الخ (نسائی مجتبائی: ج ۱ ص ۱۲۹، باب من یلی الامام ثم الذی یلی)

لہ کتاب التحقیق، ص۱۶۳، اس مذہب کی نسبت عیسیٰ بن ابان تمیذ امام محمد کی طرف بھی مشکوک ہے۔ ملاحظہ ہو فیض الباری: ج ۳ ص ۲۲۲ ایضاً العرف الشذی ص۲۲۹ ۔ ۲ طبقات ج ۶ ص۱۹۱ ۳ ایضاً ۴ ایضاً ۱۹۲

ابو معشر امام نخعی سے روایت کرتے ہیں:

لو کنت مستحلا قتال احد من اهل القبلة لاستحللت قتال هؤلاء الخشبية — اگر اہل قبلہ میں سے کسی سے جنگ کو میں جائز سمجھتا تو فرقہ خشبیہ کی جنگ کو جائز قرار دیتا۔[1]

آپ سے کسی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے متعلق سوال کیا تو کہا میں نہ سبائیہ سے ہوں نہ مرجیہ سے، ایک دفعہ ایک شخص بول اٹھا، حضرت علیؓ میرے نزدیک ابو بکر و عمر (رضی اللہ عنہما) سے بھی بڑھ کر ہیں، یہ سنا تو آپ نے برافروختہ ہو کر فرمایا۔

اما ان علیاً لو سمع کلامك لاوجع ظهرك اذا کنتم تجالسونا بهذا فلا تجالسونا — اگر علیؓ تیری بات سنتے تو ضرور تجھے پیٹتے، ایسی باتوں کے لئے میرے پاس بیٹھتے ہو تو نہ بیٹھا کرو۔[2]

ایک موقعہ پر امام نخعی خود اپنا طبعی رجحان بیان کرتے ہیں کہ علیؓ مجھ کو عثمانؓ سے زیادہ محبوب ہیں، اور مجھ کو آسمان سے گرنا زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ حضرت عثمانؓ کی تنقیص مقصود ہو[3] شاید اسی بناء پر ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں نخعی کو شیعہ میں شمار کیا ہے۔[4]

ازدواجی زندگی | امام نخعی کے خانگی حالات بہت کم معلوم ہیں، اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کی دو شادیاں ہوئی تھیں، ابو الہیثم نے آپ کی وصیت جن لفظوں میں بیان کی ہے ان سے صاف مترشح ہے کہ امام نخعی کی دو بیویاں تھیں، ان کے الفاظ یہ ہیں:

اوصی الیّ ابراهیم وکان لامرأته الاولی شیئ الخ — ابراہیم نے مجھے وصیت کی، اور ان کی پہلی بیوی کی کوئی چیز تھی۔[5]

ان میں سے ایک کا نام ہنیدۃ تھا جو امام نخعی کی وفات کے بعد تک زندہ رہیں، چنانچہ شعیب بن الحجاب کہتے ہیں

حدثتنی هنیدة امرأة ابراهیم ان ابراهیم کان یصوم یوما ویفطر یوما — مجھ سے ابراہیم کی بیوی ہنیدہ نے بیان کیا کہ ابراہیم ایک روز روزہ رکھتے تھے اور ایک روز طرح دیتے تھے[6]

ص ۱۹۲

[1] ایضاً ص ۱۹۵ [2] ایضاً ص ۱۹۲ [3] ایضاً ص ۱۹۲ [4] ایضاً ص ۱۹۲ [5] شذرات الذہب: ج ۱ ص ۱۱۱ [6] طبقات: ج ۶ ص ۱۹۸ [7] ایضاً

اولاد امام نخعی کی دو لڑکیاں تھیں، ابوالہیثم کہتے ہیں کہ مرض الموت میں ابراہیم کو میں دیکھنے گیا تو وہ رونے لگے، اور جب میں نے رونے کا سبب پوچھا تو جواب میں کہا کہ میں دنیا کے لئے بیقرار نہیں ہوں، بلکہ مجھے دونوں بچیوں کا خیال[1] ہے۔

اولادِ ذکور کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، صرف ایک لڑکے کا پتہ چلتا ہے جس کا نام ابان تھا، امام طبری (م ۳۱۰ھ) نے آیت "کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ الخ" کی تفسیر میں ابان بن ابراہیم النخعی کی حسب ذیل روایت نقل کی ہے:۔

حدثنا الحسن[2] بن یحیی قال اخبرنا	ہم سے حسن بن یحییٰ نے بیان کیا، اوران کو عبدالرزاق
عبدالرزاق قال اخبرنا معمر	سے معلوم ہوا اوران کو معمر نے ابان بن ابراہیم نخعی
عن ابان بن ابراھیم النخعی فی قولہ	کی روایت سنائی اِن ترک خیرا کی تفسیر میں کہ
ان ترک خیرا قال الف درھم	(خیر سے)، ایک ہزار درہم سے لے کر پانچ سو درہم
الی خمسمأۃ	تک مراد ہے۔

لباس رنگین کپڑے امام نخعی کو پسند تھے، عوام بن حوشب کہتے ہیں کہ میں نخعی کے گھر گیا تو ان کو سرخ کپڑے میں ملبوس پایا، بستر بھی رنگین ہی تھے، سلیمان بن بسیر کہتے ہیں کہ نخعی زرد رنگ کی دو چادروں میں باہر نکلتے تھے اور اسی لباس میں جامع مسجد جاتے اور جمعہ کی نماز پڑھتے تھے، عبداللہ بن عون سے ابوقطن نے پوچھا کہ نخعی کو معصفر کپڑوں میں دیکھا ہے، عبداللہ نے کہا ہاں لیکن رنگ میں شوخی نہیں ہوتی تھی، مُحل کہتے ہیں کہ ابراہیم طیلسانی چادر اوڑھ کر امامت کرتے تھے ابوزیاد اور ابوالہیثم القصاب کا بیان ہے کہ قلنسوہ[3] اوڑھتے تھے جو لومڑی کی کھال کا یا طیلسانی ہوا کرتا تھا، بکیر بن عامر کا بیان ہے کہ میں نے ابراہیم کو عمامہ باندھے دیکھا ہے، وہ شملہ پیچھے چھوڑ دیتے تھے۔

امام موصوف لوہے کی انگشتری استعمال کرتے تھے، منصور کہتے ہیں کہ ان کی انگوٹھی پر یہ عبارت

---

[1] طبقات ۱۹۰ [2] تفسیر طبری: ج ۲ ص ۶۹ [3] طبقات ج ۶ ذکر نخعی

کندہ تھی۔

ذبابٌ للہ ونحن لہ — ایک مکھی دیکھی، خدا کی ہے اور ہم بھی اُسی کے ہیں

ان کی متعدد انگشتریاں تھیں بعض کا نقش یہ تھا۔

اللّٰہ ولیُّ ابراھیم — اللہ ابراہیم کا ولی ہے

حماد کا بیان ہے:۔

وکل خاتَم ابراھیم من حدید — ابراہیم کی سب انگوٹھی لوہے کی تھی

حضرت عبداللہ بن مسعود نے بھی لوہے کی انگوٹھی استعمال کی تھی، چنانچہ اعمش کی روایت ہے

قالَ رأیت فی ید ابراھیم النخعی خاتما من حدید فقال ابراھیم اخبرنی من رای علی ید ابن مسعود خاتما من حدید — کہا میں نے ابراہیم نخعی کے ہاتھ میں لوہے کی انگشتری دیکھی تو ابراہیم نے کہا مجھے خبر دی ہے اس شخص نے جس نے ابن مسعود کے ہاتھ میں لوہے کی انگشتری دیکھی

اخلاق و عادات امام نخعی سادہ مزاج بے تکلف، نام و نمود سے بیزار تھے، عجلی کا بیان ہے:

وکانَ رجلا صالحًا، فقیھا متوقیا قلیل التکلف — صالح، فقیہ، پرہیزگار، بے تکلف شخص تھے۔ اور شہرت سے بچتے تھے

اعمش کہتے ہیں:

کانَ ابراھیم صیرفیا فی الحدیث وکان یتوقی الشھرۃ — ابراہیم حدیث کے صرّاف تھے اور شہرت سے بچتے تھے۔

طبیعت کے صلح پسند تھے، خود کہتے ہیں کہ میں کبھی کسی سے نہیں لڑا، ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھنا ناپسند کرتے تھے، کوئی مزاج پرسی میں کہتا کیف اصبحتم، تو جواب میں کہتے: بنعمۃ من اللہ

---

۱ ایضاً ج ۶، و البستان ص ۱۵۱ ۲ کتاب الآثار ص ۱۱۳ ۳ ایضاً ۴ البستان ص ۱۵۱ ۵ تہذیب: ج ۱ ص ۱۷۷
۶ تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۶۴ ۷ طبقات: ج ۶ ص ۱۹۱ ۸ ایضاً ص ۱۹۱ ۹ ایضاً ص ۱۹۵

(اللہ کا احسان ہے) اپنی چیزوں کو خود اٹھا لینے میں باک نہ تھا اعمش کہتے ہیں:-

ربما رأیت مع ابراهیم الشئ یحمله	بسا اوقات میں نے ابراہیم کو دیکھا کہ اپنی چیز آپ اٹھا
یقول انی لارجو فیه الاجر یعنی فی	لیتے اور کہتے ہیں اس میں ثواب کی امید رکھتا ہوں
حمله	یعنی بوجھ اٹھانے میں۔

مہماں نوازی کا جذبہ رکھتے تھے، اور صدقہ وخیرات بھی کیا کرتے تھے، چنانچہ ابو مسکین کہتے ہیں کہ ابراہیم اپنے گھر میں کھجور رکھنا پسند کرتے تھے کہ مہمان آجائے تو کھجور ہی پیش کرنے کو ہو یا کوئی سائل پہنچے تو وہی صدقہ ہو۔

امراء کے ہدایا قبول کیا کرتے تھے، چنانچہ ابو ذر ہمدانی کے ساتھ زہیر بن ازدی عامل حلوان سے اپنا وظیفہ مانگ لاتے، ایک دفعہ نعیم بن ابی ہند نے ایک خم طلاء بھیجدیا، تو آپ نے قبول کیا طلاء بہت زیادہ شیریں تھا لہذا مزید پخت کے بعد اس کو نبیذ بنالیا۔

خوف خدا اور ترحم علی الخلق کا یہ حال تھا کہ خادم کو سزا دینا چاہتے تو کہتے، احمد اللہ لاضربنک اس کے بعد چابک منگواتے اور کہتے ہاتھ پھیلاؤ، پھر ایک بار مارتے اور بس کرتے،

فطرۃً خاموشی پسند تھے، ابو بکر بن عیاش کا بیان ہے کہ ابراہیم اور عطاء سے جب تک سوال نہیں کیا جاتا تھا نہیں بولتے تھے۔

امام نخعی کی طبیعت میں مزاح کا بھی رنگ تھا، ایک دفعہ کسی نے ان سے کہا کہ سعید بن جبیرؓ ایسا کہتے ہیں تو نخعی نے کہا اُن سے جاکر کہدو کہ ترکستان کا راستہ لیں، جب حضرت سعید سے کہا گیا کہ نخعی ایسا کہتے ہیں تو انھوں نے کہا نخعی کو ٹھنڈے پانی میں بیٹھنے کو کہو،

شاید ٹھنڈا پانی امام موصوف کو بہت مرغوب تھا، کہتے ہیں:-

ماقرأت هذه الآية الا ذكرت الماء	میں جب بھی آیت وحیل بینهم وبین ما یشتهون
البارد وحیل بینهم وبین ما یشتهون	پڑھتا ہوں، ٹھنڈے پانی کا خیال آتا ہے۔

۱؎ ایضاً ص۱۹۲ ۲؎ ایضاً ص۱۹۳ ۳؎ البستان ص۱۰۱ ۴؎ طبقات: ج ۶ ص۱۹۳ ۵؎ ایضاً ص۱۹۴ ۶؎ ایضاً ص۱۹۲ ۷؎ شذرات الذہب ج ۱ ص۱۱۱، ابن قتیبہ: ص۲۳۵ ۸؎ طبقات ج ۶

نخعی اور حجاج | حجاج کی شخصیت جس طرح سیاست و تدبیر، انصرام نظام اور ملکہ جہانبانی میں روشن پہلو رکھتی ہے اسی طرح ظلم و تعدی اور قہر و جبروت کا تاریک تر پہلو بھی رکھتی ہے، ائمہ اسلام کو حجاج کی سنگدلی و تشدد سے جو نقصان پہنچا تاریخ میں اس کا ایک سرخ باب قایم ہے، حجاج بزور شمشیر ائمہ حق کی زبان بند کرنا چاہتا تھا، لیکن حق کی زبان نہ کبھی خاموش ہوئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے، علمائے امت قربانیاں کرتے رہے اور علی الاعلان حجاج کی ناجائز کارروائیوں کے خلاف ان کی آواز بلند ہوتی رہی، امام نخعی فرماتے تھے:۔

كفى به عمى ان يعمى الرجل عن امر الحجاج[1] | آدمی کے اندھا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ حجاج کی کارروائیوں کو دیکھتے ہوتے اندھا بنا رہے

منصور کہتے ہیں[2] کہ میں نے ابراہیم نخعی سے حجاج پر لعنت بھیجنے کے متعلق پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کیا اللہ تعالیٰ نہیں فرماتا ہے۔

الا لعنة الله على الظالمين | ہوشیار! خدا کی لعنت ہے ظالموں پر

غرض نخعی حجاج کے اُن سخت مخالفین میں سے تھے جو حجاج پر لعنت بھیجنے میں بھی دریغ نہ کرتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ بہتیرے ائمہ فقہ و حدیث اور اعیان امت عبدالرحمٰن بن الاشعث کے ساتھ ہو گئے تھے، ان میں سے امام شعبی اور حضرت سعید بن جبیرؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، حجاج کی نظروں میں امام نخعی کی ذات بھی مشتبہ تھی، نخعی اس ظالم کی گرفت سے بچتے رہے، اکثر جمعہ[3] اور عیدین میں شرکت بھی نہیں کرسکتے تھے،

امام نخعی کی زندگی ہی میں حجاج فوت[4] ہوا، حجاج کی موت نے بہت بڑی مصیبت کا خاتمہ کر دیا چنانچہ حماد اس کی بشارت اپنے شیخ امام نخعی کو سناتے ہیں اور وہ سجدۂ شکر ادا کرتے ہیں حماد کہتے ہیں:۔

---

[1] طبقات: ج ۶ ص ۱۹۵ [2] طبقات: ج ۶ ص ۱۹۵ [3] ایضا، عن حسن بن عمرو [4] ۹۵ھ رمضان شوال [5] طبقات: ج ۶ ص ۱۹۵

ماکنت اری احداً یبکی من الفرح — میں نے خوشی سے روتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا

حتی رایت ابراھیم یبکی من الفرح — تھا تا آنکہ ابراہیم کو میں نے خوشی سے روتے دیکھا

ایک عجیب قربانی | حجاج کے ظلم و استبداد، اور امام نخعی کی مقبولیت سے متعلق ایک عجیب[1] واقعہ ہے کہ حجاج نے جب ابراہیم نخعی کو پکڑ منگوایا تو ان کے ہمنام ابراہیم تیمی نے جو بنی تیم الرباب سے تھے اور جن کی کنیت ابو اسماء تھی، اپنے کو پیش کر دیا، حالانکہ تیمی جانتے تھے کہ حجاج کو نخعی کی تلاش ہے حجاج نے ابراہیم تیمی ہی کو نخعی سمجھ کر قید خانہ میں ڈلوا دیا، تیمی وہیں فوت ہوئے، حجاج کو خواب میں یہ آواز سنائی دی کہ آج رات اس شہر میں ایک جنتی فوت ہوا ہے، صبح کو حجاج نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ابراہیم (تیمی) نے وفات پائی - حجاج بولا شیطانی خواب تھا، اور اس مجسمۂ ایثار کو کناسہ میں ڈلوا دیا،

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حجاج امام نخعی کا شدید دشمن تھا، اور بزعم خود اس نے نخعی ہی کو قید خانہ بھجوایا تھا،

امام نخعی سے حجاج کی عداوت صرف اسی وجہ سے تھی کہ وہ حجاج کے تمرد و سرکشی کے خلاف علانیہ صدا بلند کر رہے تھے، ورنہ ابن الاشعث سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا، یحییٰ بن سعید کہتے ہیں

لم یکن ابراھیم مع ابن الاشعث[2] — ابراہیم، ابن الاشعث کے ساتھ نہ تھے

عجلی خیثمہ بن عبدالرحمٰن کے ساتھ نخعی کا اس طرح ذکر کرتے ہیں؛

لم ینج من[3] فتنۃ ابن الاشعث الا — ابن الاشعث کے فتنہ سے صرف وہ (خیثمہ) اور

ھو وابراھیم النخعی — ابراہیم نخعی بچے رہے

امام نخعی کی وصیت | ابو ہیثم کا بیان ہے کہ امام نخعی نے یہ وصیت کی تھی کہ اگر چار آدمی موجود ہوں تو ان کی وفات کی خبر کسی کو نہ دی جائے ابو ہیثم کو امام نخعی کی یہ بھی وصیت تھی کہ ان کی پہلی بیوی کی چیزیں اس کے ورثہ کو دیدی[4] جائیں، چنانچہ ابو ہیثم نے ایسا ہی عمل درآمد کیا،

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۱۹۵ [2] ایضاً ص ۱۹۹ [3] طبقات ج ۶ ص ۱۹۵ [4] تہذیب ج ۱ ص ۱۷۷ [5] طبقات ج ۶ ص ۱۹۸ [6] ایضاً

وفات | وفات کے وقت امام نخعی بہت زیادہ پریشاں خاطر تھے، ان سے پوچھا گیا کہ اس قدر پریشاں کیوں ہیں؟ تو کہا اس سے بڑھ کر خطرہ کا وقت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم فرشتۂ موت کے منتظر ہیں، جو خدائی حکم ساتھ لائیگا، اور پھر وہی باتیں ہوں گی، یا تو جنت کی بشارت دیگا، یا دوزخ کی طرف گھسیٹیگا واللہ مجھے یہ پسند ہے کہ قیامت تک میری روح حلق میں اٹکی رہ جاتی[1]،

تجہیز وتکفین | جنازہ میں صرف سات آدمی شریک تھے، عبدالرحمٰن[2] بن الاسود بن یزید نے جو امام نخعی کے ماموں زاد بھائی تھے نماز جنازہ پڑھائی، بہ قول ابن عون[3] رات کے وقت سپرد خاک کئے گئے

سن وفات کی تعیین | ۹۵ھ یا ۹۶ھ ہجری امام نخعی کی وفات کا سال ہے، علامۂ ذہبی کہتے ہیں کہ ۹۵ھ کے اخیر میں ان کی وفات ہوئی، اور طبقات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہ عہد ولید بن عبدالملک ۹۶ھ میں انھوں نے انتقال کیا، ابن قتیبہ کی تصریح بھی یہی ہے

علامۂ ذہبی اور ابن سعد کا یہ اختلاف ختم ہو سکتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ ۹۶ھ کے اوائل میں نخعی کی وفات ہوئی، ابونعیم کہتے ہیں:۔

سألت ابن بنت ابراهيم فقال بعد الحجاج باشهر اربعة اوخمسة — میں نے ابراہیم کے نواسہ سے پوچھا تو کہا کہ حجاج کے چار یا پانچ ماہ بعد (ابراہیم کی وفات ہوئی)

ابونعیم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں:۔

كانه مات أول سنة ست وتسعين — گویا ۹۶ھ کے اوائل میں نخعی نے انتقال کیا۔

ابونعیم کے قول کے مطابق امام نخعی کا انتقال ۹۶ھ صفر یا ربیع الاول میں ہوا، کیونکہ حجاج کی وفات ۹۵ھ رمضان یا شوال میں ہوئی،

پیشتر یہ ذکر ہو چکا ہے کہ حجاج نخعی کی زندگی ہی میں فوت ہوا، اور ابونعیم کی تصریح بھی یہی ہے لیکن علامۂ عجلی کہتے ہیں:۔

مات وهو مختف من الحجاج — حجاج سے روپوشی کی حالت میں وہ (ابراہیم مرے)

لیکن عجلی کی تردید کیلئے طبقات اور ابونعیم کی تصریحات کافی وافی ہیں، وهذا آخر ما اردنا من ايراده في الباب

۱ وفیات الاعیان: ج ۱ ص ۳ ۲ شذرات الذہب: ج ۱ ص ۱۱۱ ۳ ایضاً ۴ طبقات ج ۶ ص ۱۹۰ ۵ ایضاً ص ۱۹۱ ۶ ایضاً ۷ تہذیب ج ۱ ص ۱۷۷

قدرتی نظام اجتماع

(۴)

(از جناب مولوی محمد ظفیر الدین صاحب پوده نوڈیہا دی استاد دار العلوم معینیہ سانحہ)

انتشار جماعت کی کراہیت | بلاشبہ اس کلام میں جس طرف اشارہ کیا گیا ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جماعت کے بنیادی مقاصد سے ہے اور کہا جا سکتا ہے جماعت کی روح بڑی حد تک اسی میں پنہاں ہے، یہی وجہ ہے بعض ائمہ دین نہایت سختی سے اس طرف گئے ہیں کہ اذان و جماعت والی مسجد میں جماعت ثانیہ کراہیت سے کسی حال میں خالی نہیں، اور فضائل صرف جماعت اولی ہی کو حاصل ہیں۔

ہم جب نماز خوف کا مسئلہ سامنے رکھتے ہیں تو اور بھی اس مسئلہ جماعت کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے میدان کارزار میں جب دو جماعت کا حکم نہیں تو رات دن اپنی پرسکون مسجد میں جماعت ثانیہ کی اجازت کیوں کر سمجھی جا سکتی ہے، ہاں راستہ کی مسجد ہو تو البتہ اجازت سمجھ میں آتی ہے کہ وہاں کوئی نظم و ضبط ممکن ہی نہیں، احادیث میں اس طرح کا واقعہ جہاں آیا ہے اس کی مراد یہی ہے کہ وہ گذرگاہ کی مسجد ہوگی نظم جماعت کے سلسلہ میں جو حدیث ہم نقل کر آئے ہیں ان میں بھی اس طرف کافی اشارہ موجود ہے کہ جماعت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صرف ایک ہی ہوتی تھی اور یہی مطلوب بھی تھا

دلوں کی نورانیت | جماعت ثانیہ کو جب جماعت کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی تو پھر قدرتی طور پر جماعت اولی میں ہر شخص حاضری کی سعی کرے گا اور وہ سستی جو جماعت ثانیہ کے نام پر پیدا ہو سکتی ہے راہ نہ پاسکے گی، اور اس صورت میں جماعت بڑی سے بڑی ہوگی، پھر ہر ایک قلب روشن

ہو پڑیگا اور اللہ تعالیٰ کی معرفت و طاعت کا نور، ایک قلب مومن سے دوسرے مومن کے دل پر پرتو ڈالیگا اور اس طرح ان کی روحوں کی مثال ایسی ہوجائیگی کہ چند صاف شفاف آئینے ایک دوسرے کے آمنے سامنے رکھ دئے گئے ہیں اور ان پر سورج کی آناو کرنیں پڑرہی ہیں جس طرح ان آئینوں کا حال ہوتا ہے کہ ہر ایک دوسرے کو اپنے عکس سے منور کردیتا ہے یہی حال جماعت میں شریک ہونے والی روحوں کا ہوتا ہے

صبح کی جماعت میں تو یہ کیفیت اور بھی پورے شباب پر ہوگی کیونکہ آرام وچین کی نیند دماغ کو سکون بخشدیتی ہے، دل اس وقت نسبتاً بہت زیادہ پُرسکون اور افکار کے گرد وغبار سے پاک ہوتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی جماعت کا ثواب یہ بتایا گیا ہے کہ پوری رات کی عبادت کے برابر ہے

دین سے دنیا کی اصلاح | جو کچھ عرض کیا گیا اس کی روشنی میں غور کیجئے کہ ان کیفیتوں کے حصول کے وقت ایک کا دوسرے کے بغلگیر ہونا کس قدر اثر انداز ہوسکتا ہے دنیاوی اعتبار سے بھی اور دینی نقطہ نظر سے بھی، اتحاد وارتباط جسمانی اور روحانی دونوں کائنات کے لئے مفید ثابت ہوگا اور ان کیفیات کے استحضار کے ساتھ جو بھی اجتماع ہوگا کیا ان میں یہ احساس تازہ نہ ہوگا ؟ کہ جس طرح ہم ایک گھر میں، ایک ضابطہ کے تحت، صرف ایک ذات کی خوشنودی کے لئے جمع ہوتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ دنیاوی زندگی میں ہماری لائنیں مختلف ہوں اور جس طرح یہاں ہم مل کر اپنے ایک بڑے دشمن شیطان رجیم کو رسوا کر ڈالتے ہیں اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی متحد ہو کر اپنے دشمنوں پر غالب آسکتے ہیں۔

اسلامی مساوات | صرف یہی نہیں بلکہ ایک امام کی ماتحتی ان کے دلوں پر یہ نقش چھوڑیگی کہ دنیاوی زندگی میں بھی ہمارا امام ایک ہی ہونا چاہئے۔

ایک گھر میں ایک مصلّی پر بلا امتیاز ہر ایک کا دوسرے کے بغلگیر ہونا اور ایک سیدھ میں کھڑا ہونا، ان میں مساوات کی وہ روح پیدا کرے گا جو لاکھوں کانفرنسوں سے ممکن نہیں، یہاں شاہ وگدا، امیر وفقیر، منصب دار اور غیر منصب دار، ذات پات، نسل ونسب اور رنگ وروپ

کا کوئی سوال نہیں ہوتا ہے، کسی کی کوئی جگہ متعین نہیں یہاں اگر کسی درجہ میں معیار فضیلت ہے تو زہد و تقویٰ، خدا شناسی اور خدا ترسی علم و فضل اور اسی طرح کی کوئی اور چیز، بلکہ نظم جماعت میں تو ان چیزوں کو بھی دخل نہیں ہے سوائے علم و فضل کے کہ ان کا بعض امور میں لحاظ ہوتا ہے۔

بغض و حسد کی روک تھام | اور پھر اس نظم جماعت سے خود بخود الفت و محبت کے رشتے استوار ہوتے ہیں، نفاق و خصومت، حسد و بغض، عداوت و نفرت اور اس طرح کی ساری نقصان دہ اور ضرر رساں باتوں کا ہمیشہ کے لئے دروازہ بند ہو جاتا ہے قرآن پاک نے بھی نماز کے اس وصف کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا (روم ۔ ۴)

رات دن کی باہم ملاقاتیں خاص کیفیت کے ساتھ ہونگی تو جہاں محبت والفت اور مساوات کا جذبہ راسخ ہوگا وہاں دردمندی و غمخواری بھی اپنی جگہ پیدا کرے گی، ایک دوسرے کو بُرے اور پھٹے حال میں جب دیکھے گا تو طبعی طور پر ہمدردی حسن سلوک اور نیک برتاؤ کا جذبہ ابھرے گا اور اجتماعی جذبہ ان کو سب کچھ کرنے پر مجبور کرے گا یہ اور اس طرح کے بیسیوں فائدے خود بخود مترتب ہوں گے، مسجد کے اس نظم جماعت کے مصالح و حکم اگر استعصاء سے قلم بند کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب صرف اسی عنوان پر ترتیب دی جا سکتی ہے اخیر ساعت عمر میں نظم جماعت دیکھ کر رحمت عالم صلعم کی مسرت بہرحال اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کا نتیجہ تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نظم جماعت بہت محبوب تھا اور اپنی اخیر ساعت عمر تک اس سے آپ نے والہانہ محبت فرمائی، حضرت انس رضؓ کا بیان ہے کہ دوشنبہ کو صدیق اکبرؓ امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے اور لوگ صف بستہ باقاعدہ پیچھے کھڑے تھے اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی آخری بیماری میں کمزوری کی وجہ سے گھر میں آرام فرماتے تھے، آپ اپنے بستر سے اٹھ کر دروازہ پر تشریف لاتے اور پردہ اٹھا کر جماعت کو دیکھنے لگے جو مسجد میں مشغول نماز تھی۔ آپ یہ دیکھ کر خوشی سی مسکرا اٹھے (مسلم ص ۱۷۹)، جانتے ہیں آپ کی یہ مسرت کیوں تھی؟ محض اس وجہ سے کہ آپ نے صحابہ کرام کو دیکھا نماز با جماعت

ادا کر رہے ہیں، ہر ایک امام کی پوری پوری پیروی کرتا ہے اور اس طرح یہ اپنی شریعت پر قائم، آپس میں متحد اور ان کے دل ملے ہوتے ہیں

جامع مسجدوں کا نظام | یہ پنجوقتہ جماعتوں کا حال ہے جو محلہ میں اشاعت دین انضباط اتحاد اور بے شمار دینی و سیاسی منافع کا باعث ہوتی ہیں، باقی شہروں اور بڑی آبادی کے مختلف محلوں میں اشاعت دین وغیرہ کا مسئلہ، تو اس کے لئے شریعت نے جامع مسجدوں کا نظام قائم کیا ہے اور اس کو ٹھوس بنیاد پر مستحکم کر دیا ہے کیونکہ ہر دن تمام محلوں کا یکجا ہونا دقت و پریشانی اور حرج سے خالی نہ تھا اور ہفتہ بھر میں ایک ہی بار اس طرح کا اجتماع اپنی مخصوص خوبیوں کی بنا پر مناسب بھی تھا۔

ہر جگہ جمعہ کی ایک ہی جماعت عہد نبوی اور عہد صحابہ میں | چونکہ جامع مسجدوں سے متعلق گرانقدر فوائد متعلق ہیں اس لئے شریعت نے اس مسئلہ کو واضح کر دیا ہے کہ ایک شہر یا قصبہ میں ایک ہی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی جانی چاہیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں یہی رائج تھا، ایک شہر کی متعدد مسجدوں میں جمعہ کی نماز نہیں پڑھی جاتی تھی، صاحب مبسوط جو خود بھی عدم جواز تعدد جمعہ کی طرف مائل ہیں لکھتے ہیں۔

ان فی زمن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والخلفاء بعدہ فتحت الامصار ولم یتخذ احد منھم فی کل مصر اکثر من مسجد واحد لاقامۃ الجمعۃ ولو جاز اقامتھا فی موضعین جاز فی اکثر ذالک فیودی الی القول بان یصلی اھل کل مسجد فی مسجدھم واحد لا یقول بذالک وفی تجویز اقامۃ الجمعۃ فی موضعین فی مصر واحد تقلیل الجماعۃ

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کے زمانہ میں بہت سارے شہر فتح ہوتے مگر ان میں سے کسی نے بھی ایک شہر میں "ایک جامع مسجد سے زیادہ نہ بنائی، اگر اقامت جمعہ ایک شہر میں دو جگہ جائز ہوتا تو دو سے زیادہ جگہوں میں بھی جائز ہوگا اور بالآخر یہ بات یہاں تک پہنچے گی کہ ہر ہر مسجد والے اپنی ہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کریں حالانکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے اور ایک شہر میں دو مسجدوں کے اندر نماز جمعہ جائز قرار دینا جماعت کی قلت کا باعث ہوگا

واقامۃ الجمعۃ من اعلام الدین	اور اقامت جمعہ دین کی نشانیوں سے ہے لہذا
فلا یجوز القول بما یودی الی تقلیلہا	ایسی بات کا قائل ہونا جائز نہ ہوگا جو اس کی تقلیل
(مبسوط سرخی باب الجمعۃ ج ۲ ص ۱۲۱)	جماعت کا باعث ہو۔

انھوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ تعددِ جمعہ کی شکل میں اقامت جمعہ کا مقصد اصلی فوت ہو جائیگا، کیونکہ جماعت میں انتشار پیدا ہو کر قلت پیدا ہو جائے گی، حالانکہ یہ دن شریعت نے اس لئے مخصوص کیا ہے کہ ہفتہ میں ایک بڑی جماعت، جس میں سارا شہر شریک ہو، شعارِ دین کا عظیم الشان مظاہرہ کرے اور دینی و دنیاوی فوائد سے متمتع ہو۔

خیر القرون بلکہ قرون ثلثہ تک تعدد جمعہ کا پتہ نہیں چلتا، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو تیسری صدی ہجری کے ہیں انھوں نے اپنے زمانہ میں تعدد جمعہ کا انکار فرمایا ہے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ تعدد جمعہ میں نقل کیا ہے۔

ذکر الاثرم من احمد انہ قال لا اعلم	اثرم نے امام احمد سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے
بلدا من بلاد المسلمین اقیمت فیہ	فرمایا "میں نہیں جانتا کہ مسلمانی شہروں میں سے
الجمعتان اذا تقرر ھذا و احمد	کسی شہر میں بھی دو جمعہ قایم کیا گیا ہو" یہ جب ثابت
من القرن الثالث ظہر ان خیر	ہو چکا اور یہ بھی معلوم ہے کہ امام احمدؒ تیسری صدی
القرون لم یقع فی زمانھم التعدد	کے ہیں پس معلوم ہوا کہ خیر القرون میں تعدد جمعہ
(مجموعہ فتاوی عبد الحئی جلد ثانی ص ۱۱۱)	واقع نہیں ہوا۔

ائمہ اربعہ عدم تعدد جمعہ کے حق میں | اکثر علماء احناف اور دوسرے ائمہ کا قول بھی اسی کی تائید میں ہے کہ تعدد جمعہ نہ ہونا چاہئے، بعض تو بالکل ناجائز کہتے ہیں اور بعض اولیٰ اور احوط کے خلاف قرار دیتے ہیں، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت جواز کی اور دوسری عدم جواز کی ہے، عدم جواز ہی والی روایت کو علمائے احناف میں امام طحاوی، تمرتاشی اور صاحب مختار نے راجح قرار دیا ہے، ائمہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ عدم تعدد کے قائل ہیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور روایت بھی یہی ہے

اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کو راجح قرار دیتے ہیں سبکی شافعیؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ کسی بھی صحابی یا تابعی سے ایک شہر میں تعدّد جمعہ ثابت نہیں (شامی جلد اول)

مروجہ تعدد جمعہ | تمام روایتوں پر پوری بصیرت کے ساتھ غور کرنے کے بعد فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ایک شہر میں (اگر اس میں دریا یا بڑا نہر نہیں ہے تو) صرف ایک مسجد میں جمعہ بڑی حد تک ضروری ہے اور اگر ایسا دریا یا نہر بیچ شہر وغیرہ میں ہے جو ادھر سے اُدھر ہونے میں مانع ہے یا اتنی بڑی آبادی ہے جہاں ایک مسجد میں نہ گنجائش ہو سکتی ہے اور نہ آنا آسان ہے تو دو جگہ نماز جمعہ پڑھی جا سکتی ہے، باقی آج کل جیسا تعدد جمعہ مروج ہے وہ کسی درجہ میں بھی اصول شریعت کے قریب نہیں، مروجہ تعدد جمعہ کے جواز اور عدم جواز کی بحث میں دخل انداز ہونے کی چاہے گنجائش نہ ہو مگر اتنا تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ طریقہ اقامت جمعہ کے بنیادی منشا اور اس کی روح کے خلاف ہے

اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف نہیں کہ جمعہ کے دن معذورین (مسافر، مریض وغیرہ) کا مصر میں ظہر کی نماز باجماعت ادا کرنا مکروہ ہے اس کی وجہ علماء نے جو لکھی ہے وہ یہ ہے کہ جماعت جمعہ میں اختلال کا اندیشہ ہے مولانا بحر العلوم جو خود تعدد جمعہ کے قائل ہیں مگر یہ بھی معذورین کی جماعت ظہر کو غیر دیہات میں مکروہ لکھتے ہیں اور وجہ کراہیت جو بتاتے ہیں وہ یہ ہے۔

لان الجمعۃ جامعۃ للجماعات فی المصر	نماز جمعہ ایک شہر کی مختلف جماعتوں کو یکجا کرنیوالی
ولو صلّی المعذورون بالجماعۃ عسی	ہے اور اگر معذورین با جماعت ظہر پڑھیں گے تو ممکن
ان یدخل غیرھم فیخل جماعۃ الجمعۃ	ہے غیر معذور بھی ان کے شریک ہو جائیں پس اس
(ارکان ص۱۱۱)	طرح جماعت جمعہ میں اختلال پیدا ہو جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ جب جماعت جمعہ کا اس قدر لحاظ ہے تو پھر خود جمعہ کی جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا کیوں کر قرین اصول ہو سکتا ہے۔

قیامت کی یاد | جب اتنی بات سمجھ میں آگئی تو اب جامع مسجدوں کے نظام پر غور فرمائیں کہ کیوں کر ہفتہ میں ایک مخصوص دن، ایک وقت میں ہر ہر جگہ کے مسلمان اپنی اپنی جامع مسجدوں میں یکجا

ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی پورے شان وشکوہ کے ساتھ ادا کریں گے اور پھر اس اجتماع کو کیا حیثیت حاصل ہوگی

علامہ ابن القیمؒ اجتماع جمعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بلاشبہ جمعہ لوگوں کے جمع ہونے اور ان کو مبداء ومعاد یاد دلانے کا دن ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر امت کے لئے ہفتہ میں ایک دن بنایا ہے جس میں وہ عبادت کے لئے ہر کام سے علیحدہ ہوتے ہیں اور جمع ہوکر مبداء ومعاد اور ثواب وعقاب کو یاد کرتے ہیں اور اس اجتماع سے اس بڑے اجتماع کی یاد تازہ کرتے ہیں جو پروردگار عالم کے روبرو ہوگا، اور یہ مسلّم ہے کہ اس مقصد کے لئے دنوں میں وہ دن مناسب تھا جس میں ساری مخلوق جمع کی جائیگی اور وہ جمعہ کا دن ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے اس دن کی فضیلت وشرافت کے پیش نظر اس امت کے لئے اسی دن کو یہ فخر عطا کیا اور اپنی بندگی کے لئے اس دن میں ان کا اجتماع مشروع فرمایا اور اسی کو اس کی شرافت کی وجہ سے مقدر فرمایا، پس یہ دن شرعی طور پہ دنیا میں جمع ہونے کا دن ہے اور قدر ومنزلت کے لحاظ سے آخرت میں (زاد المعاد باب الجمعہ)

قیامت کے دن حشر میں جو اجتماع ہوگا وہ بھی جمعہ ہی کا دن ہوگا، اس لئے یقینی طور پر مردِ مومن کا ذہن جمعہ کے اجتماع سے بڑے دن کے اجتماع کی طرف جائیگا اور پھر ساتھ وہ سارے حالات جو میدانِ حشر میں پیش آنے والے ہیں ایک ایک یاد آئیں گے اور اپنے اعمال وا خلاق کا نقشہ تھوڑی دیر کے لئے آنکھوں میں پھر جائیگا، اور اس سے یقینی طور پر قلبِ مومن متاثر ہوگا۔

پند ونصیحت | رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم شاید اسی وجہ سے کبھی کبھی نماز جمعہ میں سورہ جمعہ تلاوت فرماتے تھے جس میں نماز جمعہ کے لئے تاکیدی حکم ہے، سعی الی الجمعہ کا وجوب ہے اور ان تمام امور کے ترک کا حکم ہے جو نماز جمعہ اور اجتماعِ جمعہ کی شرکت سے مانع ہو سکتے ہیں پھر ذکر اللہ کی کثرت پر بھی زور دیا گیا ہے، تاکہ یہ صلاح وفلاح دارین کا ذریعہ بن سکے اور کامیابی سے ہمکنار کردے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہونا باعثِ ہلاکت ہے اور آپ دوسری رکعت میں سورہ منافقون پڑھتے تھے، جس سے غالباً آپ کا منشاء یہ تھا کہ امت کو نفاق سے

ڈرائیں جو دینی اور دنیادی تباہی و بربادی کا سرچشمہ ہے، نیز امت کو اس بات پر متنبہ کرنا مقصود تھا کہ مال، اولاد، اور دنیا کا لالچ تم کو نماز جمعہ اور اللہ کی یاد سے، خبردار کہیں روک نہ دے، اور آخر میں موت کی یاد تازہ کرا کے اصل مقصد کی طرف متوجہ کرنا اور اس کے موانع سے ہشیار کرنا تھا کہ جو کچھ کرنا ہے یہیں کرلو، وہاں اس کا موقع نہیں ہے بعد موت ساری تمنا اور آرزو بے سود ہوگی (زاد المعاد ص۱۱۰ ج ۱)

آج بھی امت کے لئے وہی طریقہ مسنون ہے جو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا چنانچہ ہفتہ میں جب یہ عظیم الشان اجتماع ہوگا، مسلمان خلوص کے ساتھ جمع ہوں گے تو قیامت کی وہ سخت گھڑی یاد آئے گی جب نفسی نفسی کا عالم ہوگا، نفس اور اعمال کے احتساب کا موقع پیدا ہوگا اور امام جب کبھی نماز میں سورۂ جمعہ اور منافقون کی تلاوت کرے گا تو ہمارے قلوب میں ایک بے چینی کی کیفیت پیدا ہوگی

پورا شہر ایک امام کے پیچھے پھر اس ہفتہ وار اجتماع میں پنجوقتہ جماعت کے فائدوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ چند مسجدوں کی جماعتیں ایک مسجد میں سمٹ آتی ہیں اور سب کے سب صرف ایک امام کی پیروی کرتے ہیں گویا یہ امام پورے شہر کا امام ہوتا ہے اور آج اس کی ہر حرکت و سکون کی پوری پوری مطابقت کی جاتی ہے، یہ امام اس دن ایک بلیغ خطبہ دیتا ہے جس میں حمد و ثنا کے بعد قرآن و احادیث پاک کی روشنی میں فرائض اور ذمہ داریوں کی یاد دہانی کی جاتی ہے، امام شہر کی سیاسی و دینی رہنمائی کرتا ہے اور ہفتہ بھر کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا تذکرہ کرتا ہے اور خیر القرون کی یاد تازہ کراتا ہے اور اس طرح اس دور کے احیاء کے لئے ابھارتا ہے۔

تبلیغ و اشاعت کی اہمیت یہی وجہ ہے کہ خطبہ کا سننا واجب قرار دیا گیا ہے، امام جہاں خطبہ دینے کی نیت سے نکلا، دنیا کی ساری باتیں باعث گناہ ہوگئیں جن امور کی اجازت تھی وہ بھی شرعی طور پر اب باقی نہیں رہی، کوئی بھی کچھ بول نہیں سکتا، حتیٰ کہ نفل و سنت پڑھنے کی بھی گنجائش باقی نہیں

رہنی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اذا قلت لصاحبك يوم الجمعة انصت	اگر امام کے خطبہ دیتے وقت تو نے اپنے
والامام يخطب فقد لغوت	کسی بھائی کو یہ کہا کہ چپ رہو تو یہ بھی تو نے ایک
(بخاری باب الانصات یوم الجمعۃ)	لغو کام کیا۔

انداز خطابت | گویا امام کے سوا کسی اور کو یہ حق نہیں کہ کچھ بولے، یا امر بالمعروف کرے، یہ ساری چیزیں صرف امام ہی کے لئے اس وقت مخصوص ہوتی ہیں خطیب قوم کا بہترین شخص ہوگا، اس پر اثنائے خطبہ میں ایسی کیفیت طاری ہو کہ اس کی زبان سے جو بات نکلے، اثر میں ڈوبی ہوتی ہو تاکہ قوم کے قلب و جگر پر تیر کی طرح وہ بات لگتی چلی جائے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز خطابت اس دن اسی انداز کا ہوتا تھا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم	آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ دیتے تو آنکھیں
اذا خطب احمرت عيناه وعلا صوته	سرخ ہو جاتیں اور آواز بلند، اور لب و لہجہ میں شدت
واشتد غضبه حتى كانه منذر جيش	پیدا ہو جاتی، معلوم ہوتا آپ کسی لشکر سے ڈرا رہے
يقول صبحكم ومساكم ويقول بعثت انا	ہیں اور فرما رہے ہیں کہ وہ لشکر اب صبح و شام میں
والساعة كهاتين ويقرن اصبعيه	ٹوٹ پڑنے والا ہے اور فرماتے کہ قیامت اور مجھے
السبابة والوسطى (مسلم کتاب الجمعہ ج ۱ ص ۲۸۴)	درمیان بس اتنا فرق ہے جتنا شہادت اور بیچ کی
	انگلیوں کے درمیان

امام کی ظاہری ہیئت | اس دن امام کی ظاہری ہیئت بھی ذرا عمدہ اور نمایاں ہونی چاہئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کتب حدیث میں اس طرح کی باتیں ملتی ہیں، حضرت عمرو بن حریث کا بیان ہے۔

ان النبي صلى الله عليه وسلم خطب	جمعہ کے دن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سیاہ عمامہ
وعليه عمامة سوداء قد ارخى طرفيها	باندھ کر خطبہ ارشاد فرماتے جس کے دونوں کنارہ

بين كتفيه يوم الجمعة (مسلم) — آپ کے شانوں کے درمیان لٹکا ہوتا۔

سامعین کا لحاظ | جمعہ کے دن جو مستحبات و مسنونات ہیں ان کو سامنے رکھ لیجئے تو اجتماع کی شان و شوکت اور بھی نمایاں معلوم ہوگی، غسل، مسواک، خوشبو حتی المقدور، اچھا لباس، وغیرہ وغیرہ پھر امام کو ہدایت ہے کہ خطبہ ایسا دے کہ سامعین پورے کیف و نشاط کے ساتھ سنیں، ان کے جوش و انبساط میں کوئی فرق نہ آئے، ارشادِ نبوی ہے

ان طول صلوٰة الرجل وقصر خطبته مئنة من فقهه فاطيلوا الصلوٰة واقصروا الخطبة وان من البيان سحرا (مسلم کتاب الجمعہ ج ۱ ص ۲۸۶) — مرد مومن کی لمبی نماز اور مختصر خطبہ اس کے فقیہ ہونے کی علامت ہے پس نماز لمبی کرو اور خطبہ مختصر اور بلا شبہ بعض بیان جادو ہے۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ضرورت کے وقت بھی اختصار ہی سے کام لیا جائے جس سے ضرورت پوری نہ ہو سکے۔ بلکہ امام کو ضرورت کے وقت اس کا اختیار ہے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور بھی یہی تھا کبھی خطبہ کو طول دیتے اور کبھی اختصار سے کام لیتے، جیسی ضرورت محسوس فرماتے، علامہ ابن القیم لکھتے ہیں:۔

وكان يقصر خطبته احيانا ويطيلها احيانا بحسب حاجة الناس (زاد المعاد ج ۱ ص ۱۱۶) — جیسی لوگوں کی ضرورت ہوتی، اسی کے مطابق آپ خطبہ دیتے کبھی مختصر اور کبھی لمبا

امام کی توجہ | خطبہ میں اس کا بھی لحاظ رہے کہ امام خطبہ دیتے ہوئے کھڑا رہے، اور اس کا رُخ قوم کی طرف ہو تاکہ امام کی طرف قوم کا رجحان باقی رہے اور اس کی باتیں قوم کو متاثر کرسکیں، سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا۔

وكان يخطب قائما ...... واذا صعد المنبر اقبل بوجهه على الناس (زاد المعاد ج ۱ ص ۱۱۶) — آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے اور منبر پر لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے۔

اس طرف اشارہ گذر چکا ہے کہ امام (خطیب) محض اپنے جسم ہی سے قوم کی طرف متوجہ نہیں ہونا ہے بلکہ اس کو دلی اور روحانی توجہ بھی قوم پر رکھنی چاہئے۔

قبولیت دعا کی گھڑی | اس جمعہ کے دن ایک گھڑی ایسی ہے جس میں دعائیں خصوصیت سے مقبول بارگاہ ہوتی ہیں، حدیث کے الفاظ تو بتاتے ہیں کہ دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور اس گھڑی میں مومن کی

دعا رد نہیں کی جاتی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ جمعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا

فیہ ساعۃ لا یوافقہا عبد مسلم وھو یصلی یسأل اللہ شیئا الا اعطاہ ایاہ ، اشار بیدہ یقللہا (مسلم کتاب الجمعۃ ص۲۸۱ ج۱)

جمعہ کے دن ایک ایسی گھڑی ہے جس میں مرد مسلمان نماز پڑھے اور اپنے اللہ سے کسی چیز کی درخواست کرے تو اللہ تعالیٰ وہ چیز اسے عطا کریگا مگر وہ گھڑی مختصر ہوتی ہے

یہ ساعت استجابت باقی ہے یا اٹھالی گئی ؟ ہر جمعہ میں یہ ساعت آتی ہے یا کسی خاص میں اس باب میں مختلف اقوال ہیں مگر جو صحیح مذہب ہے وہ یہ ہے کہ یہ ساعت استجابت (قبولیت کی گھڑی) باقی ہے اور ہر جمعہ میں آتی ہے یہ مسئلہ بھی اختلافی ہے کہ وہ کون سی گھڑی ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس باب میں بیالیس اقوال نقل کئے ہیں اور پھر ہر ایک قول کا ماخذ اور اس کی دلیل بھی لکھی ہے، مگر راجح یہی ہے کہ اس قبولیت کی گھڑی کو چھپا لیا گیا ہے، کوئی خاص گھڑی متعین نہیں ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ بندہ اس گھڑی کی تلاش و جستجو میں ہمیشہ ہر جمعہ کو پورے دن رغبت سے عبادت میں مصروف رہے،

نماز جمعہ کی تاکید | انھی خصوصیات کی وجہ سے نماز جمعہ کی سخت تاکید ہے اور با جماعت نماز کا حکم ہے جمعہ کی انفرادی نماز سرے سے جائز ہی نہیں ہے البتہ جو لوگ معذور و مجبور ہیں وہ بجائے جمعہ ظہر کی نماز پڑھ سکتے ہیں، قرآن میں اس نام سے ایک مستقل سورہ موجود ہے اس میں یہ آیت بھی آئی ہے

یا ایھا الذین امنوا اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع (جمعہ ۲)

اے ایمان والو! جمعہ کے دن جب اس کی نماز کے لئے تم کو پکارا جائے تو اللہ تعالیٰ کی یاد کی طرف دوڑ پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔

حدیث میں مختلف پیرایہ سے اس کی اہمیت ذہن نشین کی گئی ہے یہاں صرف چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔

الجمعۃ حق واجب علی کل مسلم فی جماعۃ الا علی عبد مملوک او امرأۃ او صبی او مریض (ابوداؤد)

ہر مسلمان مرد پر جمعہ کی جماعت ایک ضروری حق ہے البتہ چار پر نہیں غلام۔ عورت۔ بچہ اور بیمار۔

ترک جمعہ و جماعت کی وعید بیان فرمائی گئی ہے حضرت ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں

سمعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر فرماتے
یقول علی اعواد منبرہ لینتھین اقوام	ہوئے سنا کہ یا تو لوگ جمعوں کے ترک سے باز آئیں گے
عن ودعھم الجمعات او لیختمن اللہ علی	یا پھر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دیگا۔ پھر البتہ وہ
قلوبھم ثم لیکونن من الغافلین	غافلوں میں ہو جائیں گے۔

(مسلم کتاب الجمعہ ص۲۸۴ ج۱)

ایک دوسری حدیث میں ہے جو ابوداؤد میں ہے کہ جو شخص سستی کی وجہ سے تین جمعہ ترک کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر کر دیتا ہے، مسلم[1] شریف کی ایک حدیث میں آیا کہ جو لوگ جمعہ کی نماز میں نہیں آتے جی چاہتا ہے ان کو پھونک ڈالوں، علامہ ابن القیمؒ نے ان ہی حدیثوں کے پیش نظر لکھا ہے کہ "جمعہ کی نماز فرائض اسلام میں موکد تر ہے اور اس کا اجتماع، عظیم الشان اجتماع ہوتا ہے، اتنا عظیم الشان کہ عرفہ کے بعد فرض اجتماع یہی ہے، جو اس کی شرکت محض اپنی سستی و دنیا طلبی کی وجہ سے ترک کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے دل پر غفلت کی مہر لگا دیں گے، اس کا رتبہ اعلیٰ ہے اور اتنا اعلیٰ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی قربت اور سب سے اول اس کا دیدار ان لوگوں کو نصیب ہوگا جو جمعہ کے دن امام کے زیادہ قریب ہوتے ہیں اور سویرے جامع مسجد حاضر ہوتے ہیں[2]۔

یہ سب تاکید اسی لئے ہے کہ جامع مسجدوں کا قدرتی نظام ہمیشہ مضبوط بنیاد پر قائم رہے اور ان کے اجتماعوں سے جو بھی دینی و دنیاوی فائدے ہو سکتے ہیں فرزندان توحید اس سے پورے طور پر مستفید ہوتے رہیں اور غفلت، کاہلی، اور بے رغبتی وغیرہ ان میں اثر پذیر نہ ہو سکے۔

ایک عام فائدہ | شروع ..... میں عرض کر آیا ہوں کہ جمعہ کے اجتماع میں شہر کے ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے ہیں علماء، صوفیاء، رؤسا، تجار، غرباء، فقراء، مختصر یہ کہ ہر شعبۂ زندگی کے تقریباً ہر فرد ہوتے ہیں، ہر ایک دوسرے کو عبرت و بصیرت کی نظر سے دیکھینگے، کسی کو تعلیم اور علوم و فنون کی اشاعت کی فکر ہوگی، کسی کو تزکیۂ قلوب اور روحانی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوگی کوئی مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی کا جائزہ لیگا، کوئی پست خیال افراد کی ترقی کی اسکیم بنائیگا اور کچھ لوگ

---

[1] مسلم باب صلوٰۃ الجماعۃ الخ ص۲۳۲ ج۱ [2] زاد المعاد ص۱۰۲ ج۱

میں کسب حلال کی اُمنگ پیدا ہوگی، گویا یہ سارے طبقے مل کر ہر ہفتہ اور کچھ نہیں تو مسلمانوں کی صحیح کا احساس تو ضرور ہی اپنے اندر پیدا کریں گے۔ اور ہر قلب پر ایک چوٹ سی لگے گی۔

مسجدوں کا ایک اور نظام عیدگاہ کے نام سے | اس ہفتہ وار اجتماع کے علاوہ سال میں دو مخصوص اجتماع اور بھی ہوا کرتے ہیں ایک کو عید الفطر کہتے ہیں اور دوسرا عید اضحٰی کے نام سے موسوم ہوتا ہے ان کا نظام "عیدگاہ" کے نام سے قایم ہے اس کو مسجدوں سے بڑا گہرا تعلق ہے اور یہ مسجدوں کے نظام سے الگ نہیں کہا جا سکتا، عیدگاہ بہت سے شرعی احکام میں مسجد کے تابع ہے اور اس سے بڑھکر یہ کہ عموماً یہ اجتماع مسجد میں بھی ہوتا رہتا ہے، فرق یہ ہے کہ یہ پنجوقتہ نمازوں میں داخل نہیں بلکہ علیحدہ ہی اور سال میں یہ دو نمازیں روزانہ نماز سے زیادہ پڑھی جاتی ہیں شریعت میں ان نمازوں کو وجوب کا درجہ حاصل ہے اسی وجہ سے اس کے لئے نہ اذان ہوتی ہے نہ تکبیر۔ بقیہ شرائط تقریباً وہی ہیں جو جمعہ کیلئے ہیں

یہ اجتماع ہفتہ وار اجتماع کی نسبت سے ذرا شاندار ہوتا ہے، اس میں اہتمام کچھ زیادہ ہوتا ہے اور عموماً اس کی ادائیگی بجائے مسجد کے باہر میدان میں ہوتی ہے ایک میں صدقہ فطرہ کا نظم ہے اور دوسرے میں "قربانی" کا جس سے غرباء و فقراء کی تھوڑی بہت امداد ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ بھی اس مسرت میں برابر کے شریک ہو جاتے ہیں۔

ذخیرۂ احادیث کو سامنے رکھ کر جب غور کیجئے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس موقع سے جہاں اور بہت سے فائدے اور مصالح مقصود ہیں وہاں شکوہ اسلام اور شوکت مسلمین کا اظہار بھی ہے اور غالباً اسی وجہ سے حکم ہے کہ ایک راستہ سے جائے اور واپسی دوسرے راستہ سے ہو، بلکہ ایک میں تو باواز بلند تکبیر کا بھی حکم ہے،

کتب حدیث میں یہ بھی واقعہ مندرج ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے موقع پر عورتوں کے اجتماع کا بھی حکم دیا ہے حتی کہ ان عورتوں کو بھی نکلنے کا حکم ہے جو نماز نہیں پڑھ سکتی ہیں، اس کی وجہ بعض علماء یہی بتلاتے ہیں کہ شروع اسلام میں اس سے بڑی حد تک اظہار شان و شکوہ تھا اور اب چونکہ یہ ضرورت اُس پیمانہ پر باقی نہ رہی اس لئے عورتوں کا اجتماع ناپسند کیا جاتا ہے

اور بعض لوگ تو اب بھی اس موقع پر خروج نساء کے قائل ہیں، تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

اجتماع عیدین کی اہمیت | ان اجتماعِ عیدین سے بھی خیر القرون میں کام لیا گیا ہے، اور آج بھی ان سے کام لیا جا سکتا ہے یہ الگ بات ہے کہ ہم دین کی ان حکمتوں سے واقف نہیں اور یہ کہ اس اجتماع سے کام لینا چھوڑ دیا، آج بھی اگر ارباب فضل و کمال اس طرف توجہ کریں تو ان اجتماع سے ایک بڑی کانفرنس کا کام لیا جا سکتا ہے، دین کی باتوں کی اشاعت بسہولت ہو سکتی ہے، بہت سے ان مسلمانوں کو جو دین سے ناآشنا ہیں انھیں دین کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔

بہرحال آج ہم اپنی غفلتوں کی وجہ سے جو بھی کریں مگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اجتماع دینی سے بڑا کام لیا، تبلیغ و اشاعت میں ان سے آپ کو بڑی مدد ملی ہے، جہاد جیسا اہم کام بھی اس موقع سے آپ نے انجام دیا ہے بلکہ حدیث میں اس کا کچھ خصوصیت سے ذکر ملتا ہے، حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخرج یوم الفطر والاضحیٰ الی المصلی فاول شیئ یبدأ بہ الصلوٰۃ ثم ینصرف فیقوم مقابل الناس والناس جلوس علی صفوفھم فیعظھم ویوصیھم ویامرھم وان کان یرید ان یقطع بعثا قطعہ او یامر بشیئ امر بہ ثم ینصرف (بخاری باب الخروج الی المصلی)	نبی اکرم صلعم عید الفطر اور عید اضحیٰ میں عیدگاہ تشریف لاتے، سب سے پہلے نماز ادا فرماتے، پھر فارغ ہو کر لوگوں کی طرف توجہ فرماتے، اور لوگ اپنی جگہ بیٹھے ہوتے ان کو نصیحت فرماتے اور تاکیدی حکم دیتے اگر لشکر اسلام کی روانگی کا ارادہ ہوتا تو اس کو روانہ فرماتے، یا کسی ضروری کام کا انجام دینا ضرور ہوتا تو اس کے متعلق حکم نافذ فرماتے، پھر واپس ہوتے

ملکی اور دینی کام | یہ حدیث کتنی واضح ہے، الفاظ حدیث میں اس اجتماع کے مہتم بالشان ہونے پر کس قدر زور معلوم ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا عظیم الشان مصرف لیا، مجاہدین کی روانگی کا کام کوئی معمولی کام ہے کاش اس سے ہم سبق حاصل کریں اور ملکی یا دینی جس طرح

کا کام درپیش آئے اس سے مدد لیں، اس وجہ سے اور بھی کہ اس طرح کا اجتماع آج کل آسان کام نہیں، اور غالباً اسی حکمت کے پیش نظر عید کا خطبہ نماز بعد رکھا گیا ہے، کہ باطمینان تبلیغ واشاعت دین کا کام انجام پا سکے، بخلاف جمعہ کے کہ وہ نسبتاً جلد جلد ہوتا ہے خطبہ نماز سے پہلے رکھا گیا ہے بلاشبہ یہ بھی بات ہے کہ جمعہ بعد نوافل وسنن ہیں جو عید بعد نہیں ہیں۔

عن ابن عمرؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکرؓ وعمرؓ یصلون العیدین قبل الخطبۃ (بخاری باب الخطبہ بعد العید)

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ عیدین کی نماز خطبہ سے پہلے ادا فرماتے۔

اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو بھی نصیحت فرماتے اور انھیں بھی ان کے فرائض یاد دلاتے تھے حدیث میں یہ واقعہ مصرح ہے ملاحظہ ہو۔

ثم اتی النساء فوعظھن وذکرھن وامرھن بالصدقۃ (مردوں سے فارغ ہوکر) آپ عورتوں کے مجمع میں

فرایتھن یھوین الی اذانھن وحلوقھن یدفعن الی بلال ثم ارتفع ھو وبلال الی بیتہ (مشکوۃ صلوۃ العیدین)

تشریف لاتے ان کو وعظ ونصیحت فرماتے، اور صدقہ دینے کی تلقین فرماتے راوی کا بیان ہے کہ میں عورتوں کو دیکھتا تھا کہ اپنے کانوں اور گردنوں کے زیورات پر جھک پڑتی تھیں اور حضرت بلالؓ کے حوالہ کرتی تھیں۔ پھر آپ حضرت بلالؓ کے ساتھ اپنے گھر تشریف لاتے۔

مسجد حرام کا اجتماع عید اضحیٰ کے موقع پر دنیائے اسلام کا عظیم الشان اور بے مثال اجتماع ہوتا ہے اور وہاں ہوتا ہے جو آں حضرت کا مولد ہے، جو مقام ابتدائے بنی آدم سے مرجع خاص و عام ہے، جو عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں کا قدیم مرکز ہے اور جس کو "سرۃ الارض" ناف زمین کی حیثیت حاصل ہے، یہ دنیائے اسلام کا شیرازہ ہے جس میں سارے فرزندانِ توحید بندھے ہوتے ہیں، چاہے وہ کسی گوشۂ زمین کا باشندہ ہو، اور جس نسل وخاندان سے بھی تعلق رکھتا ہو،

اس نشان دہی سے بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ مری مراد مکہ معظمہ یا دوسرے لفظ میں مسجد حرام سے ہے جو روئے زمین کی پہلی مسجد ہے اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔

اسلامی عالمگیر کانفرنس | اسی مسجد حرام کو یہ شرف حاصل ہے کہ اول یوم سے یہ انسانوں کا مرجع عام رہی اور جب سے عالم میں اسلام کی نورانی کرنیں پھیلیں ہر سال یہاں "اسلامی عالمگیر کانفرنس" ہوتی ہے جس میں پورب سے لیکر پچھم اور اُتّر سے لے کر دکھن تک کے اسلامی نمائندے شریک ہوتے ہیں اور ایک مقام اور ایک تاریخ میں جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان کرتے ہیں اور جمع بھی ہوتے ہیں کس شان سے ؟ کہ ان سب کی سرکاری زبان ایک ہوتی ہے سب کی ظاہری ہیئت ایک سی ہوتی ہے، سب کی آواز اور پکار بھی تقریباً ایک ہی ہوتی ہے، یہاں ملک و قوم کا سوال مٹ جاتا ہے، نسب و نسل کا بت پاش پاش ہو جاتا ہے ایک رشتہ سارے رشتوں پر غالب ہو جاتا ہے مختصر یہ کہ سب ایک خاندان کے افراد بن کر جمع ہوتے ہیں۔

کون سا ایسا کام ہے جو اس عظیم الشان تاریخی اجتماع سے انجام نہ پا سکے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عالمی مجلس سے بڑا کام لیا ہے مکی زندگی میں بھی اور مدنی دور حیات میں بھی، اسی اجتماع کی برکت سے اول اول اسلام مدینہ منورہ پہنچا تھا، اور وہاں پہنچ کر پورے عالم پر چھایا تھا، آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس عالمی اجتماع سے کام لیا، سیاسی بھی اور دینی بھی، اور صحابہ کرام کے بعد بھی ہر دور میں محدثین اور علماء نے اس اجتماع سے فائدہ اُٹھایا، جس کی تفصیل یہاں مقصود نہیں ہے

اشاعت و تبلیغ کا موقعہ | آج بھی ہم اس اجتماع سے دینی اور دنیاوی فائدے حاصل کر سکتے ہیں، یہاں اشاعت دین کا بڑا اچھا موقع ہے لوگ سب سے علیحدہ ہو کر صرف دین کے لئے جمع ہوتے ہیں، اور سب سے کٹ کر ایک مقصد کے لئے دور دراز سے چل کر آتے ہیں، خدا کرے مسلمانوں کی سوئی ہوئی بستی جاگے اور "نظام مساجد" کے ان اہم شعبوں پر غور و فکر کرے۔ اسی مسجد حرام کے باب میں قرآن کا اعلان ہے وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا (بقرہ - ۱۵) اور اسی کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ارشاد ربانی ہوا تھا وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّ عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (حج - ۳) (جس کی تفصیل اول کتاب میں گذر چکی ہے)

امیر الامراء نواب نجیب الدولہ ثابت جنگ
اور
جنگ پانی پت
(۳)

(از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی)

غازی الدین خاں عماد الملک آکر ان سے ملے اور شجاعانہ تیور دیکھ کر بہت خوش ہوئے اپنی فوج کو نجیب خاں نے دہلی کی شہر پناہ کے نیچے لا کھڑا کیا وہیں فوج کے لئے خیمہ بھی لگا دئے گئے صفدر جنگ اپنے ولی نعمت کے مقابل حق نمک خواری یہ ادا کر رہے تھے۔ دہلی سے دو میل کے فاصلہ پر جاٹوں اور مرہٹوں کو ہمراہ لئے مورچے جمائے پڑے تھے۔

دہلی کی شہر پناہ پر شاہی توپیں اور رہکلے چڑھے ہوئے تھے نجیب خاں نے یہ طریقہ اختیار کیا روزانہ صبح اٹھ کر دشمن کے مورچوں پر حملہ کرنا اور شام کو شہر کے نیچے آکر آرام کرنا آخرش کوٹلہ کی جنگ میں گشائیں جو صفدر جنگ کا سپہ سالار تھا نجیب خاں کے ہاتھ سے مارا گیا اس بہادر کی موت سے صفدر جنگ اور اس کے حمائتیوں کا حوصلہ پست ہو گیا ایک دن اس کے مضبوط مورچہ پر ایسا حملہ کیا کہ سورج مل جاٹ اور صفدر جنگ کو میدان سے پسپا ہونا پڑا شاہ کو اس کارگذاری کی خبر پہنچی جوش مسرت میں شاہ کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

"نجیب خاں رسالدار نہیں بلکہ نواب نجیب الدولہ نے مورچہ فتح کیا"[1]

شام کو نجیب خاں بعد فتح یابی واپس ہوئے بادشاہ نے شرفِ باریابی بخشا اور نوبت مع

[1] نجیب الدولہ از مولانا اکبر شاہ خاں (عبرت ۱۹۱۰ء)

خلعت اور نوابی کا علم عطا ہوا۔

بادشاہ اور وزیر کی اس جنگ کو چھ ماہ ہو چکے تھے اب رنگ بدل چکا تھا ادھر بادشاہ نے نجیب الدولہ کی بہادری اور شجاعت دیکھ کر تمام بیرونی افواج کی اعلیٰ سرداری عطا کی اس نے صفدر جنگ کے پیر اُکھاڑ دیئے سورج مل جاٹ تو دُم دبا کر بھرت پور چلتا بنا آخر کار صفدر جنگ نے معافی کی درخواست کی اور اس کو بہت غنیمت سمجھا کہ اودھ کی صوبہ داری پر فائز رہ کر اپنے علاقہ کو چلتے ہوئے۔

خطاب | احمد شاہ نے وزیر غازی الدین خاں کی سفارش سے نجیب خاں کو خطاب اور منصب ہفت ہزاری اور نقارہ و نشان اور منصب بخشی گیری اور سہارنپور کی ہاؤنی مرحمت کی۔

انسداد شر و فساد | نواب نجیب الدولہ نے ارد گرد جو فسادات اُٹھتے رہتے تھے ان کا بحسن خوبی انسداد کیا۔ مظفر نگر میں جیت سنگھ نے بڑا فتنہ بپا کر رکھا تھا اور لوٹ مار مچا رکھی تھی وہ نواب کے ہاتھوں قتل ہوا اور تمام مظفر نگر اور اس کے مضافات پر قابض ہو گئے اس طرح دوآبہ گنگ و جمن اور گنگا کے مشرقی جانب کا روہیلکھنڈ کا مغربی حصہ بھی نواب کے حصہ میں آگیا ۱۷۵۳ء میں "مالن ندی" کے بائیں کنارے پر اپنے نام سے شہر آباد کیا۔

نجیب آباد | شہر کی آبادی کا اہتمام اپنے ایک ہندو کارندہ کے سپرد کیا قلعہ پتھر گڈھ کی تعمیر کا مہتمم ایک مسلمان کو بنایا مظفر نگر کے ضلع سے بنیئے، کھتری، برہمن لا لا کر آباد کئے گئے اور تمام تر توجہ ہندوؤں کی دلدہی میں صرف کی۔ چنانچہ ضلع مظفر نگر کے قصبہ شاملی سے جو ہندو لاکر آباد کیے ان کے نام کا محلہ اب تک شاملی نامی ہے۔

اس کے علاوہ ہندوں کو مکانات نواب نجیب الدولہ کی طرف سے بنے بنائے عطا ہوئے اور پٹھانوں کے لئے یہ تھا وہ خود اپنے مکان تعمیر کرائیں قلعہ پتھر گڈھ میں مسجد شاندار تعمیر کرائی گئی

غازی الدین کا دلی پر قبضہ | ۱۱۷۰ھ ۱۷۵۶ء میں غازی الدین خاں حکومت دہلی کے سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا اس نے پنجاب کو بھی دہلی سے ملحق کرنا چاہا۔ احمد شاہ درانی میر منو کو پنجاب کا حاکم مقرر کر تا گیا تھا وہ مرا

تواس کی بیوہ مغلانی (یا مراد) بیگم مدار المہام بنی اور نابالغ بچے کو حکومت پر بحال رکھا۔ غازی الدین نے جولائی ۱۷۵۴ء میں مرہٹوں کو مدد کے لئے بلایا اور بادشاہ کو تخت سے اتار کر آنکھوں میں سلائی پھروا کر اندھا کیا اور اس کی جگہ جہاندار شاہ کے بیٹے عزیز الدین کو عالمگیر ثانی لقب سے تخت پر بٹھایا اس واقعہ سے شہر میں اس کے خلاف شورش بپا ہو گئی تو مصلحت یہ دیکھی کہ کچھ دن کے لئے دلی سے دور رہے چنانچہ پنجاب کا رُخ کیا اور میر منو کی لڑکی سے شادی کی اور ساس کو دھوکہ دے کر لاہور پر قبضہ کیا۔ ادینہ بیگ خاں کو تیس لاکھ سالانہ خراج کے وعدے پر لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا اور معہ بیوہ و دختر میر منو دہلی واپس روانہ ہو گیا۔ ان واقعات کی اطلاع شاہ درانی کو ہوئی وہ نہایت غضبناک ہوا اور فوج جرار لے کر ہندوستان پر چڑھ دوڑا اور قندہار سے بڑی تیزی کے ساتھ خود کو لاہور پہنچایا۔ ادینہ بیگ خاں شاہ ابدالی کے حملہ کی خبر سنتے ہی بھاگا اور ہانسی حصار میں عماد الملک سے جا کر ملا۔

"شاہ ابدالی دار دلاہور شد۔ چوں بادشاہ ملیغار کوچ بکوچ ازراہ سرہند نواح دار الخلافہ شاہجہاں آباد گشت نواب نجیب الدولہ بہادر قریب بکرنال بملازمت والا احمد شاہ مستفیض گشت۔ وعماد الملک غازی الدین خاں مذیہ مع عالمگیر ثانی بادشاہ ہندوستان بطریق استقبال رفتہ در قصبہ نریلہ با احمد شاہ درانی ملاقات نمود چہل روز احمد شاہ درانی در دہلی قیام نمود حضرت بیگم صاحبہ صبیہ محمد شاہ راکہ از بطن صاحبہ محل بود بصلاح عالمگیر ثانی بعقد خود در آورد وسر دفتر خواتین حرم فرمود[1]"

شاہ ابدالی عماد الملک سے بے حد خفا تھا مگر اس کی ساس مغلانی بیگم نے شاہ سے سفارش کی اور عماد الملک نے بھی خوشامد و عاجزی کی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تو غصہ فرو ہوا۔

اس فتح کی یادگار میں احمد شاہ کا سکہ چلا دیا گیا جس میں ۱۱۷۰ھ ڈال دیا گیا۔ فراہمی روپیہ کے لئے سورج مل جاٹ کی طرف توجہ مبذول ہوئی اس کی تمردی اور شورہ پشتی بہت بڑھی ہوئی تھی اپنے ایک سردار خان جہان خاں کے ذریعہ گوشمالی شروع کرادی راہ میں متھرا تھا وہاں میلہ میں جاٹ

---

[1] تاریخ احمد

جمع تھے ان کی سرکوبی کی خاطر متھرا کو لٹوا دیا۔

صفدر جنگ مر چکا تھا مگر عماد الملک اس کے بیٹے شجاع الدولہ سے بھی خوش نہ تھا اس نے شاہ درانی سے اس بات کی اجازت حاصل کی کہ شجاع الدولہ اور دوسرے مرہٹوں سے بادشاہ کے لئے روپیہ وصول کرنے معہ دو شہزادوں کے جائے چنانچہ غازی الدین اودھ کی طرف روانہ ہوا۔

عالمگیر ثانی نے شاہ درانی سے غازی الدین کی بدسلوکی کا شکوہ کیا اور کہا کہ آپ ہم کو غازی الدین خاں کے پنجہ سے نکالتے جاویں چنانچہ بوقت روانگی تالاب مقصود آباد پر شہنشاہ عالمگیر ثانی کے فرمانے پر نجیب الدولہ کو سلطنت مغلیہ کا کارپرداز مقرر کیا اور تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں دے۔

امیر الامرائی | نواب نجیب الدولہ را بمرتبہ امیر الامرائی سرفراز فرمودہ و خدمت بادشاہ موصوف گذاشت و خود روانہ ولایت شد[۱]"

پنجاب کا افغانستان سے الحاق | شاہ ابدالی لاہور و ملتان دونوں صوبوں کی حکومت پر اپنے بیٹے تیمور شاہ کو چھوڑا تیمور شاہ کی شادی اس نے دختر محمد شاہ مرحوم شہنشاہ دہلی سے کر کے دونوں بادشاہوں میں قرابت باہمی کی صورت نکالی تھی ادینہ بیگ خاں کو تیمور شاہ کا نائب مقرر کیا مگر عملی طور پر کامل اختیار اس کو حاصل رہا۔ شاہ موصوف کی واپسی کے بعد عماد الملک نے اپنی شرارت کا جال پھر پھیلایا۔

عماد الملک کے ہاتھوں خاندان دذات شہنشاہ کی اہانت | عماد الملک نے جو اس وقت شاہزادگان تیموری کے ساتھ فرخ آباد میں نواب احمد خاں بنگش کے پاس مقیم تھا جب نجیب الدولہ کے منصب امیر الامرائی پر فائز ہونے کی خبر پائی تو چونکہ وہ اس کو اپنا موروثی و ذاتی منصب خیال کرتا تھا اور نجیب الدولہ کو اس نے صفدر جنگ سے لڑائی ہونے کے وقت احمد شاہ مرحوم کی خدمت ادا کرنے کے لئے دہلی میں بلایا اور شہنشاہی دربار میں عہدہ دلایا تھا اس سے وہ نجیب الدولہ سے

[۱] تاریخ احمد

بے حد ناراض ہوا اور شہنشاہ عالمگیر ثانی کی بھی جن کو خود اس نے تخت پر بٹھایا تھا مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا یہی عماد الملک تھا جس نے شاہی خواتین کو ملہار راؤ ہلکر کے ہاتھوں گرفتار کرایا اور احمد شاہ کو گرفتار و قتل کرا کے رعب و داب شہنشاہی کو سخت صدمہ پہنچایا اور اب وہ اپنے دست گرفتہ بجیب (؟)
کو اپنا رقیب تصور کر کے اس کے استیصال کے فکر میں لگ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ اور عالمگیر ثانی سے زبردستی اس کی منظوری حاصل کرنے کے لئے اس شہنشاہ و نجیب الدولہ کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی فکر کی۔"

مغل شہنشاہی کی عقیدت مرہٹوں کے دلوں میں | عماد الملک نے نجیب الدولہ کی عداوت میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ بالاجی باجی راؤ پیشوا کے بھائی رگھناتھ راؤ عرف رگھوبا کو اپنی امداد کے لئے بلایا رگھوبا اس وقت مالوہ میں اس استحقاق کی بناء پر لوٹ مار کر رہا تھا جو باجی راؤ پیشوا کو صوبہ داری مالوہ کا فرمان بیشگاہ شہنشاہ محمد شاہ جنت آرامگاہ سے ۱۷۳۶ء میں عطا ہونے کی بناء پر پیدا ہوا تھا۔ مرہٹے اگرچہ لوٹ مار کے شائق تھے مگر ذات شہنشاہی کا ان کے دلوں میں خاص ادب و احترام تھا اور وہ تخت مغلیہ کی آڑ میں اپنا اقتدار قائم کرنا اور ہندوؤں کی مذہبی مراسم کی آزادی کو بحال کرنا چاہتے تھے جو اکبر اعظم اور اس کے جانشینوں نے ان کو عطا کی تھی۔

مگر مغلیہ شہنشاہی اقتدار کے زوال پذیر ہونے پر بعض علاقوں میں خود سر مقامی حکام نے اس پر بندشیں عائد کر دی تھیں صرف سداشیو راؤ بھاؤ نے اپنے سر پر آور وہ مرہٹہ رفقا اور راجپوت رؤساکی مرضی کے خلاف اپنے فرقہ کی مقررہ پالیسی سے انحراف کرنا چاہا تھا جس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

مرہٹوں کا ہندو مسلمانوں سے یکساں برتاؤ | ۱۷۳۶ء میں باجی راؤ پیشوا نے خود دار السلطنت دہلی کے گرد و نواح میں لوٹ مار کی تھی مگر اس کے ساتھ ہی کالکا کے میلہ میں ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کی طرح لوٹا کھسوٹا تھا[۱]۔

---

[۱] پانی پت کا خونی میدان صفحہ ۱۰۷

اس کے بعد مرہٹوں نے خود دار السلطنت کا اس وقت تک رُخ نہیں کیا جب تک عماد الملک جیسے موروثی وشہنشاہی عہدہ دار نے اپنی ذاتی اغراض کے لئے ملہار راؤ اور جیا پا سیندھیا کو نہیں بلایا اور شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد نجیب الدولہ کی ضرر رسانی کے لئے دوبارہ ہلکر اور رگھوبا کو طلب نہیں کیا۔

عماد الملک نے اپنی ذاتی سپاہ ان دونوں سرداران مرہٹہ کی فوج کے ساتھ شامل کر کے دہلی کو محصور کر لیا احمد خاں بنگش کو بہکا کر ہمراہ لایا تھا کہ نجیب الدولہ کو معزول کر کے تم کو امیر الامراء کرایا جائے گا یہ اس کے ساتھ لگے چلے آئے تھے۔ نجیب الدولہ ۴۵ یوم تک مرہٹوں اور عماد الملک اور احمد خاں بنگش کی افواج سے مقابلہ کرتا رہا مگر عالمگیر ثانی یہ رنگ دیکھ کر گھبرا سے گئے۔

ملہار راؤ اور نجیب الدولہ سے تعلقات کا قائم ہونا | اور نجیب الدولہ سے کہا کہ اس وقت میری اور تمہاری جان اسی طرح بچتی ہے کہ صلح کر لی جائے نجیب الدولہ نے جب بادشاہ کا یہ رنگ دیکھا ملہار راؤ ہلکر کے پاس پیغام بھیجا کہ میں اب تمہاری مزاحمت چھوڑتا ہوں اور اپنے علاقہ کو جاتا ہوں ملہار راؤ نے اس کو تائید غیبی سمجھ کر بڑی عزت واحترام کے ساتھ استقبال کے لئے آمادگی ظاہر کی چنانچہ نواب نجیب الدولہ اپنے تمام ساز و سامان و اسباب و فوج و باربرداری وغیرہ کے ساتھ قلعہ سے نکلے اور ملہار راؤ ہلکر کے خیموں کے قریب ایک روز قیام کیا محاصرین افواج نے ہر قسم کی تعظیم و تکریم کو ملحوظ رکھا اس کے بعد نواب نجیب آباد پہنچ گئے ان کے جاتے ہی ملہار راؤ سے صلح کر لی اور بادشاہ نے قلعہ کے دروازے کھول دے اور غازی الدین کو وزیر تسلیم کیا شاہزادہ عالی گہر دلی سے چلتا بنا کنج پورہ ہو کر سہارنپور نجیب الدولہ کے پاس پہنچ گیا کچھ عرصہ رہ کر تسخیر بنگالہ کے لئے مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستہ میں سعادت اللہ خاں۔ نواب حافظ رحمت خاں وغیرہ نے بھی حسب استطاعت شہزادہ کی امداد و نذرانہ سے دریغ نہ کی اس طرح عالی گہر اودھ اور سرحد بنگالہ تک پہنچ گیا۔

غازی الدین خاں نے ادھر دلی سے نجیب خاں کو خارج کرا کر خود اپنا تسلط بٹھایا۔ اور تھا کر

بالاجی راؤ کے بھائیوں رگھناتھ راؤ، شمشیر بہادر اور ملہر کو پنجاب کی طرف متوجہ کیا سب سے پہلے سید برادران پھر صفدر جنگ اور نظام الملک نے مرہٹوں کو شمالی ہند کی چاٹ لگائی تھی اب غازی الدین خاں دلی اور پنجاب پر بھی ان کو حکمراں بنا کر حوصلہ بڑھا رہا تھا چنانچہ آدینہ بیگ جو غازی الدین کا گرگا اور تیمور شاہ کی طرف سے دوآبہ بست جالندھر وغیرہ کا عامل تھا غازی الدین کے اشارہ سے مرہٹوں کا حامی بن کر اور سکھوں کے گروہوں کو آمادہ بغاوت بنا کر تیمور شاہ اور جہان خاں کو مبتلائے مصیبت بنا دیا۔ مرہٹوں کے سیلاب نے پنجاب میں داخل ہو کر ایک آفت برپا کر دی اور نوبت با ینجا رسید کہ تیمور شاہ وجہان خاں کو لاہور چھوڑ کر کابل کی طرف جانا پڑا رگھناتھ راؤ نے پنجاب کا صوبہ پچھتر لاکھ سالانہ نذرانہ کے عوض ادینہ بیگ کے سپرد کر دیا اور دکن طلبی پر رگھناتھ روانہ ہو گیا ۱۷۵۸ء ادینہ بیگ اس جہان فانی سے کوچ کر گیا ــــــ ادینہ نگر (دینا نگر ضلع گورداس پور) اس کا آباد کیا ہوا ہے نواب ادینہ بیگ نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ صوبہ پنجاب کا نظر کردہ تھا اس کی قبر گوجرانوالہ میں ہے (تاریخ پنجاب مصنفہ جج عبداللطیف)

احمد خاں بنگش اور نجیب الدولہ | غازی الدین نے احمد خاں بنگش کو نجیب الدولہ کا رقیب بنا دیا تھا اور وہ ہمیشہ نجیب الدولہ کی تخریب کے درپئے رہتا تھا ادھر شجاع الدولہ سے بھی اس کو دلی عناد تھا۔ شجاع الدولہ علی محمد خاں کی اولاد اور نجیب الدولہ سے بوجہ ہمسائیگی رقابت رکھتا تھا۔

غازی الدین کا ارادہ فاسد | غازی الدین ہی وہ شخص تھا جس نے صفدر جنگ اور نظام الملک سے زیادہ مرہٹوں کو ترقی دی اور ان دونوں نے شمالی ہند کی چاٹ لگائی اسی نے دلی اور پنجاب پر حکمراں کیا ان واقعات سے مرہٹے حوصلہ مند ہو چکے تھے۔ ادھر غازی الدین کو مناسب موقع ہاتھ آیا کہ نجیب الدولہ کو احمد خاں بنگش اور مرہٹوں کے ہاتھ سے برباد کرا دیا جائے پھر شجاع الدولہ کی خبر لوائے۔ گویا ہندوستان سے اسلامی سلطنت وحکومت کے خاتمہ کے تمام سامان اپنوں کے ہاتھوں مہیا ہو چکے تھے۔

نجیب الدولہ پر چڑھائی | چنانچہ دتا مرہٹہ نے اول ایک لاکھ فوج کے ساتھ نجیب الدولہ کے ملک پر حملہ کر دیا نجیب الدولہ نے دتا کی خبر سنتے ہی نجیب آباد سے روانہ ہو کر مظفر نگر کے ضلع میں سکھرتال

کے مقام پر پہنچکر دتا کا پر جوش خیر مقدم کیا نجیب الدولہ کے پاس فوج اس کے مقابلہ میں دتا کی فوج سے دسواں حصہ (دس ہزار تھی) چنانچہ سکھرتال میں سنگر (دمدمہ) یعنی مٹی کا کچا قلعہ بنایا اور محصور ہو کر توپ۔ رہکلہ۔ بان۔ بندوق سے جی توڑ کے مقابلہ شروع کیا۔ ساتھ ہی ایک ایلچی شاہ درانی کی خدمت میں روانہ کیا۔ یہاں کے حالات مفصل لکھ بھیجے اور یہ لکھا کہ ایک لاکھ روپیہ مقام اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ کوچ کے حساب سے نذرانہ پیش کیا جائے گا۔

نجیب الدولہ کی یہ ذہانت تھی وہ موقعہ کی نزاکت کا لحاظ کر گیا اور یہی اس موقع کیلئے تدبیر تھی اس کے ساتھ ہی دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ اور قاضی مبارک گوپاموی شارح سلم اور مرزا مظہر جان جاناں غداروں کی ریشہ دوانیاں اور ان کے ہاتھوں مرہٹوں کا اقتدار اور ان کے ذریعہ اسلامی حکومت کو پامال کرانے کی تدبیریں و منصوبے یکے بعد دیگرے آنکھوں کے سامنے ان کے گذر رہے تھے نواب دوندے خاں جو نواب نجیب الدولہ کے خسر تھے وہ مرزا مظہر جان جاناں کے مرید تھے ان کو مرزا صاحب نے خطرہ سے آگاہ فرما دیا تھا اور ان کو نصیحت کی تھی کہ اس سیلاب کو دفعہ کرنے میں جان کی بازی لگانے کا وقت ہے[1]۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ العزیز کا معتقد نجیب الدولہ تھا آپ کے ہی ارشاد پر نجیب الدولہ نے احمد شاہ کو دعوت دی تھی[2]۔

قاضی مبارک نے اپنے خلف ارشد قاضی حکم علی گوپاموی کو اپنے چار سو طالبعلموں کے ساتھ دہلی سے دکن تک پھیلا دیا تھا[3] جو وعظ و تذکیر سے مسلمانوں میں جنگی اسپرٹ پیدا کرتے تھے اور جوق در جوق مسلمان آکر امرائے روہیلکھنڈ کے ملازم ہو رہے تھے علماء نے روہیلوں کی سرپرستی کر لی تھی اور ان کی دستگیری کے لئے کمر بستہ تھے مگر امرائے حکومت ملک اور قوم سے غداری کر رہے تھے۔

---

[1] کلمات طیبات [2] شاہ ولی اللہ [3] تذکرۃ الانساب مولوی مصطفٰے علیخاں

(باقی آئندہ)

ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل

(۷)

(از جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف دہلی)

بدنصیب واصف کی آنکھوں کے سامنے سے وہ منظر بھی گذرا ہے کہ وہی ہزاروں کے اجتماع میں بغیر لاؤڈ اسپیکر کے گرجنے والا شیر ۱۹۴۲ء میں کتب خانہ رحیمیہ پر رونق افروز ہے ضعف ونقاہت کی وجہ سے سرنگوں ہے اختلاج قلب سے کبھی کبھی بے قراری ہو جاتی ہے۔ اتنے میں حضرت مفتی صاحب تشریف لاتے ہیں فوراً مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھتے ہیں فرماتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحب! چند اشعار کہے ہیں اگر حکم ہو تو عرض کروں۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں ارشاد فرمایئے۔ نحیف اور دردانگیز آواز میں چند اشعار سناتے ہیں:۔

انھیں جان کر رنج و غم جانتا ہوں عنایت کو ان کی ستم جانتا ہوں
محن سے ہوں واقف الم جانتا ہوں گراں جاں ہوں یہ کم سے کم جانتا ہوں
حقیقت جو عشق و محبت کی پوچھے کم از کم یہ کہہ دینا لازم ہے اس سے
زبوں تر ہیں معنی و اوصاف اس کے اداں جملہ اک چشم نم جانتا ہوں
رہ عشق والفت میں جو گامزن ہے وہ ہمدوش آفات رنج و محن ہے
ہر اک منزل اس کی کٹھن پرفتن ہے میں اس کی ہوا زہر و سم جانتا ہوں
ابھی بحر غم میں ہے دل کو ڈبونا ابھی اشک حسرت سے ہے منہ کو دھونا
ابھی ٹھوکروں کا ہے اس رہ میں رونا کہ آگے کی منزل اہم جانتا ہوں
کرے گا نشانہ خطا تیر زن تو جھپکنے نہ دے دیدۂ سحر فن تو

مژہ راست کرمان میرا سخن تو میں اس تیر میں تیرے خم جانتا ہوں
ہدایت ہے بھولا ہوا سا فسانہ ہوں قید نشیب و فراز زمانہ
رہا ہوں تو ہے اور آگے بھی جانا حقیقت نہایت کی کم جانتا ہوں
نہ پوچھو کہ تدبیر چلنے کی کیا کی فقط دیر باقی ہے امر خدا کی
ضرورت نہیں رہبر و رہنما کی کہ میں راہ ملک عدم جانتا ہوں
در پیر میخانہ کا ہوں گدا میں وہیں کھاتا پیتا ہوں اس کا دیا میں
وہیں دیتا رہتا ہوں سائل صدا میں اسے اہل بذل و کرم جانتا ہوں

۱۹۵۳ء میں جبکہ نواب صاحب محلہ فراش خانہ میں حکیم عبدالرشید خاں کے مکان میں کرائے پر رہتے تھے ایک روز بازار میں کسی جگہ راقم الحروف کو دیکھ کر پکارا۔ اور فرمایا حضرت آرزو لکھنوی آئے ہوئے ہیں آج شام کو تم کھانا میرے ساتھ کھالینا۔ میں نے عرض کیا بسر وچشم! شام کو در دولت پر حاضر ہوا۔ جناب آرزو لکھنوی سے نیاز حاصل ہوا۔ استاد مرحوم نے تعارف کرایا فرمایا کہ یہ میرا ہونہار شاگرد ہے اور مرشد زادہ ہے۔ کھانے سے قبل جناب آرزو اپنا کلام سناتے رہے آپ نے اپنی اس خصوصیت کا اظہار فرمایا کہ میں فارسی عربی کے الفاظ سے بچ کر کہتا ہوں۔ اس مجلس میں انھوں نے اپنی پانچ چھ غزلیں سنائیں ان میں عربی فارسی کے الفاظ بالکل نہ تھے بھاشا سے نکلی ہوئی خالص اردو تھی۔ باوجود اس کے تخئیل کی بلندی، مضامین کی شگفتگی زبان کی فصاحت و دلفریبی بدرجۂ اتم موجود تھی ؎

سائل صاحب کا مذہب اور سیاسی مسلک | سائل صاحب اہل سنت والجماعۃ اور خالص حنفی مسلمان تھے حضرت شاہ دلدار علی مذاق شاگرد ذوق مرحوم سے آپ کو بیعت تھی۔ مگر غلو نہ رکھتے تھے اور اور متصوفانہ بے تعصبی کے حامل تھے۔ ایک روز فرمایا کہ میں تفضیلی سنی ہوں۔ میں نے عرض کیا تفضیلی سنی سے کیا مراد ہے۔ تفضیل تو شیعیت کی ایک شاخ ہے۔ فرمایا کہ میں حضرت علیؑ کو اصحاب ثلثہ پر فضیلت دیتا ہوں میں نے عرض کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اصحاب ثلثہ رضوان اللہ علیہم پر

نفضیلت دینے کا اختیار آپ کو کس نے دیا نیز یہ کہ سنی ہو کر آپ تفضیلی کیسے بن سکتے ہیں یا تو یہ کہئے کہ میں تفضیلی شیعہ ہوں یا کہئے کہ میں پکا سنی ہوں یہ دو رخی بات کیسی؟ مذہب اہل سنت میں تمام علماء کا اتفاق اس امر پر ہے کہ خلفائے راشدین کا تفضل ان کی خلافت کی ترتیب کے لحاظ سے ہے۔ فرمایا کہ کبھی میں اپنے آپ کو شیعہ کہنے کے لئے تو تیار نہیں ہوں میں نے عرض کیا کہ مغلوں کے زمانے میں ہندستان پر ایرانیوں کا اس قدر غلبہ رہا کہ امور سلطنت میں بھی دخیل رہے اور رشتہ داریوں کی وجہ سے معاشرت پر بھی چھائے ہوئے تھے۔ اس کا اثر مذہبی رجحانات پر پڑنا لازمی تھا۔ پرانے پکے سُنی بھی ڈگمگا گئے اور تبرائی شیعہ نہیں تو کم از کم تفضیلی بن گئے۔ معلوم ہوتا ہے آپ کا قول بھی اسی تاثر کی وجہ سے ہے۔ پھر میں نے کچھ تفصیل سے بعض پہلو مدلل طور پر گوش گذار کیے۔ فرمایا کہ اب میرا شبہ دور ہو گیا واقعی میں غلطی پر تھا یہ محض ایک رسمی چیز تھی ورنہ در حقیقت استاد مرحوم پکے سُنی تھے اور انھوں نے بارہا مجھ سے فرمایا ہے کہ "ہمارے اسلاف نے یزید پر لعنت بھیجنے سے منع کیا ہے یہ فعل ہمارے مسلک کے خلاف ہے۔"

سیاسی مسلک کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہ رجعت پسند تھے نہ انتہا پسند بلکہ معتدل تھے ان کا خاندان نواب احمد بخش کے زمانے سے سرکار انگریزی کا وفادار رہا ہے۔ نواب احمد بخش خاں کا زمانہ وہ زمانہ تھا جبکہ تمام ہندستان پر انگریز مسلط ہو چکے تھے اور تمام ملک کا نظم و نسق انگریزوں کے پنجہ استبداد میں آچکا تھا نواب احمد بخش خاں سے انگریزوں کے ذاتی مراسم اور دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ ان کی خدمات کے عوض ان کو فیروز پور اور لوہارو کی جاگیریں بھی ملی تھیں ان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے نواب شمس الدین احمد خاں ان کے جانشین ہوئے یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریزوں کے تسلط و اقتدار اور تشدد و مظالم سے رعایا میں نفرت کے جذبات پیدا ہو رہے تھے اور اپنی جگہ پر ہر شخص اس غلامانہ زندگی سے اذیت محسوس کر رہا تھا۔ نواب شمس الدین احمد خاں کے متعلق انگریز مورخوں نے لکھا ہے کہ وہ نہایت بد چلن اور فتنہ انگیز نواب تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سر ولیم فریزر سے جو اس زمانے میں دہلی کے ایجنٹ تھے نواب کی مخالفت ہو گئی تھی اور کہا جاتا ہے

کہ سر ولیم فریزر کے قتل میں نواب کی اشتعالک تھی یہ انگریز مورخوں کی فطری عادت ہے کہ وہ آزاد خیال اور محب وطن انسان کو بد چلن اور فتنہ انگیز کے لفظ سے ہی یاد کرتے ہیں اور غداران وطن کو نیک چلن، خوش اطوار، وفادار اور دنیا بھر کے مشفقانہ خطابات سے یاد فرمایا کرتے ہیں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کو غدر کا لقب دیا جاتا ہے چنانچہ نواب شمس الدین احمد خاں کو ۱۸۳۵ء میں (یعنی ظل سبحانی بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی سے دو سال قبل) پھانسی دیدی گئی۔ انگریزوں کا اقبال اس قدر عروج پر تھا کہ نواب کا نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ نواب بیچارا کس شمار میں تھا مغلوں پر جنہوں نے صدیوں ہندوستان پر شہنشاہی کی اور دنیا پر اپنے جاہ و جلال کا سکہ بٹھایا ایک زمانہ وہ آیا کہ آخری مغل بادشاہ پر بغاوت کا الزام لگا کر اسی کے لال قلعہ میں خود اسی پر مقدمہ چلایا جاتا ہے (کس پر؟ بادشاہ پر؟ بغاوت کا الزام! یا للعجب!) اور کون مقدمہ چلاتا ہے؟ سات سمندر پار کی ایک سوداگر قوم! اور کوئی شخص کہیں شارع عام پر بادشاہ کا نام تک لینے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ تمام ملک اور بالخصوص مسلمان بالکل مغلوب ہو چکے تھے۔ اس وقت کے لیڈروں اور زعمائے قوم نے مجبوراً یا تو گوشہ نشینی کی پالیسی اختیار کی یا تعاون کا مسلک پسند کیا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا ریاست نواب امین الدین احمد خاں کے خاندان میں منتقل ہو گئی تھی سائل صاحب کا خاندان ریاست سے منصب کا تعلق رکھتا تھا۔ اس وجہ سے بھی اور عام پالیسی کے ماتحت نواب ضیاء الدین احمد خان کی بھی تعاون کی پالیسی رہی۔ سائل صاحب بھی چونکہ اسی زمانے کے پرانے بزرگوں میں سے تھے ان کے رجحانات بھی وہی تھے۔ اگرچہ انھوں نے علانیہ تعاون کی پالیسی اختیار نہیں کی۔

غرضکہ سائل صاحب عملی طور پر سیاست میں کوئی حصہ نہ لیتے تھے۔ بلکہ صاف بات تو یہ ہے کہ ان کو سیاست سے قطعاً کوئی دلچسپی ہی نہ تھی ۱۹۲۰ء کی تحریک کے زمانے میں انھوں نے ایک طویل ترجیع بند میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جس میں سے کچھ اشعار درج ذیل کرتا ہوں:-

دعوے وفا کا جن کو ہے ہم سے سوا غلط ۔۔۔ سمجھے ہیں لوگ معنی حرف وفا غلط

بیڑا امید خلق کا کیوں کر نہ ہو تباہ ۔۔۔ جن کے سرے سے ہو گئے ہوں نا خدا غلط

جاں بر مریض ہو نہیں سکتا کسی طرح — جب اس کے چارہ گر لئے دینگے دوا غلط

لیڈر وہ قوم کے ہیں جو ہیں تاج کیخلاف — مطلب یہ لیڈری کا ہے بے انتہا غلط

عمالِ تاج کیا کریں جز نظم حادثات — پاداشِ جرم جو ہو وہ کب ہے سزا غلط

جو مانگنا ہے مانگو جو کہنا ہے وہ کہو — اسلوب و طرز غیر ہے صوت و صدا غلط

خواہش جو ہے تمہاری ہماری بھی ہے وہی — ہم سے عمل کوئی نہیں سرزد ہوا غلط

منت سے مدعا کی کرو خواستگاریاں — ہاکی پہ چڑھ کے مانگنا ہے ناروا غلط

مقصود ہے فلاح اگر قوم کی تمہیں
لازم ہے رکھنی ٹھیک خبر قوم کی تمہیں

افلاس کی نگاہِ عنایت ہے قوم پر — تم سے چھپی نہیں جو مصیبت ہے قوم پر

قحطِ معاش و قحطِ نکوئی و قحطِ رزق — قحطوں میں ہے گھری ہوئی حسرت ہے قوم پر

بے دولتی نے دیکھ لیا ہے غریب کو — ٹوٹی حیات میں یہ قیامت ہے قوم پر

حالانکہ قحط رزق ہے ہوتی ہیں دعوتیں — یہ مستحب ہے فرض ہے سنت ہے قوم پر

ہوتے ہیں انصرام جلوس فضول کے — رکھنا نہ باز جس سے شقاوت ہے قوم پر

دس لاکھ کی طلب ہے پے صرف فنڈ ہند — چندے کے واسطے یہ ہدایت ہے قوم پر

سرگرمیاں ہوں جتنی مدارات کیلئے — ان لیڈروں کے واسطے منت ہے قوم پر

سیکھو سبق خلوص کے حسرت (موہانی) کی ذات سے
پرہیز کرنا چاہئے اس واہیات سے

یا سادگی سے کیجیے وفا قوم کے لئے — یا نیم شب کو دیجیے دعا قوم کے لئے

لازم نہیں کہ نذر وہ رمال کی کریں — چوری سے چور کی جو بچا قوم کے لئے

فرمان ہائے سابق شاہی پڑھو ذرا — ان کی بنا پہ کیا نہ ہوا قوم کے لئے

اعلان تاجِ حال پہ بھی چاہئے نظر — منشا تمہارا اور ہے کیا قوم کے لئے

مقصد سے متفق ہیں عمل کے ہیں ہم خلاف — تدبیر یہ نہیں ہے بجا قوم کے لئے
گاندھی کا قول یہ کہ رہیں ملکی رہیں خلاف — ظاہر میں گو مفید ہوا قوم کے لئے
یہ دیکھنا ہے رہتا ہے کب تک قرار اسے
سہو آگئے ہندو کرتے ہیں یاد پندار اسے

دینی ہے اب تو دعوت امن و اماں ہمیں — کرنا نہیں ہے وقت عبث رائیگاں ہمیں
کچھ عرض حال کرنا ہے تکلیف خلق کا — مذکور جن کے ہوتے ہیں از بس گراں ہمیں
یہ تو ہماری ذات پہ گذری ہے واردات — دہرانی جس کی پڑتی ہے اب داستاں ہمیں
ہڑتال کے عروج کا قصہ بیاں ہو گیا — جس نے عطا کیا ہے غم جاوداں ہمیں
نور نگاہ لخت جگر شیر خوار پور — کرنا پڑا زمین کے نیچے نہاں ہمیں
اک بوند بھی دوا کی نہ جس کو ہوئی نصیب — ہڑتال کے یہ ذاتی ہوئے امتحاں ہمیں
مخلوق کی صعوبتیں جو گوش زد ہوئیں
بے حد و بے شمار ہوئیں لاتعد ہوئیں

جانیں بہت سی نذر ہوئیں اس خیال کی — تا اینکہ نوبت آ چکی قتل و قتال کی
باغی خطاب پا چکے بے دست و پائے ہند — ڈگری ہے اور باقی کوئی ابتذال کی
لندن میں ہے خلافت دینی کا وفد بھی — حسرت تمام ہو لی جواب و سوال کی
ماضی پہ خاک ڈال کے ایسی ڈگر چلیں — پیدا ہوں جس سے راہیں باہم اعتدال کی
مشکل نہیں ہے تاج سے کچھ رفع سوء ظن — ٹونیں بدل لی جائیں اگر بول چال کی
ہو جائے گا سلوک رعایا و شاہ میں
تخفیف و فرق میں نہ کمی آئے جاہ میں

جلسہ مصالحت کا کوئی تم قرار دو — آرائے عام لے کے شہنشہ کو تار دو
سطوت کو تاج کی رکھو ملحوظ وقت عرض — دینا ہو جو پیام نہ وہ ناگوار دو

اپنے حقوق مثلِ رعایا طلب کرو | باشوق یہ کہو کہ ہمیں اختیار دو
معتوب ہیں جو تلج کے ان کے ہو شفیع | ان کی رہائی کے لئے دامن پسار دو

اس کی جزا نہ پاؤ تو پھر تم مجاز ہو
اب تو خدا کے واسطے عرضِ نیاز ہو[1]

ایک روز مجھ سے فرمایا کہ "بیٹا! درد میرے دل میں بھی اٹھتا ہے مگر میں آہ بھی نہیں کرسکتا ایک دفعہ ایک نظم جامع مسجد میں پڑھ دی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوپر سے بڑی لتاڑ پڑی اور لینے کے دینے پڑ گئے اس وقت سے کان پکڑا کہ اب کوئی سیاسی نظم نہ کہوں گا"

استاد مرحوم نے جس نظم کی طرف اشارہ کیا ہے وہ وہ معرکۃ الآرا تضمین ہے جو انھوں نے مولانا شبلی نعمانی کی نظم پر جنگ بلقان کے زمانے میں کہی تھی۔ یہ تضمین سائل صاحب نے جامع مسجد دہلی کے ایک عظیم الشان جلسے میں سنائی تھی۔ لوگ دہاڑیں مار کر رو رہے تھے۔

دعائے عافیت مانگے گا دینِ خستہ جاں کبتک | مخالف گردشیں کرتا رہے گا آسمان کبتک
ستائے گا بتا اے کوکبِ نامہرباں کبتک | حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کبتک

چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھیگا دھواں کبتک

بڑھے گر چار سو سے سوئے دامن آسنی پنجے | پکڑ کر گوشۂ دامن ستمگاروں نے گر کھینچے
رہے گی تاج و تختِ روم کی پھر آبرو کیسے | قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردئے پرزے

فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کبتک

سُنے کوئی تو ہم اس سے کہیں بھی مدعا یہ ہے | مصیبت اپنے اوپر یہ پڑی ہے ماجرا یہ ہے
یہ دل میں درد پیدا ہوگیا ہے عارضہ یہ ہے | مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے

کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ نیم جاں کبتک

یہ خیل ماٹی میدان سے جو بڑھتا آتا ہے | فسُون سرد یہ اس شان سے جو بڑھتا آتا ہے

[1] واقعات دار الحکومت دہلی جلد اول صفحہ ۱۰۳

سحابِ حبش اب یونان سے جو بڑھتا آتا ہے
یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

خبر ہے اپنے بیگانے ہیں کیا کیا دیکھنے والے
مرادِ غیر یا اپنی تمنا دیکھنے والے
گئے بیٹھے ہیں بند آنکھوں کو مانا دیکھنے والے
یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائیگا شہیدِ خستہ جاں کب تک

یہ صوتِ درد ہے مرغوب کن کو کن کو بھاتی ہے
صدا ماتم کی دل خوش کن ہے انکے ان کو بھاتی ہے
یہی یہ رات کو سنتے ہیں یہ ہی دن کو بھاتی ہے
یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائیگا یتیمِ ناتواں کب تک

کسی ترکیب سے آخر ہمیں معلوم کچھ ہو تو
کوئی ہمدرد اپنا ہو کوئی دلسوز اپنا ہو
تو اک پیغام پہنچانے کی ہم تکلیف دیں اسکو
کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

سنائی کے نہ ہونے کی کہو تو انتہا تا کے
کیے جائے گا اک رنجور فریاد و بکا تا کے
ہوئے جائے گی اک مظلوم پر جور و جفا تا کے
یہ جوش انگیزیٔ طوفانِ بیداد و بلا تا کے
یہ لطف اندوزیٔ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

ہماری بھی تمہاری بھی قضا اک روز آنی ہے
نہیں رہنے کی شے یہ جان تو اک وقت جانی ہے
سنا بھی تم نے یہ اتمامِ حجت کی کہانی ہے
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

کبھی حالت کسی کی غیر گر تم نے نہیں دیکھی
مسلماں لاش بے سر بے سپر گر تم نے نہیں دیکھی
دکھا تو دی تمہیں اب خیر گر تم نے نہیں دیکھی
نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خوں فشاں کب تک

بلاد و مصر کے فرماں و دیراں چاہئیں تم کو
پٹے لاشوں سے کے میل میداں چاہئیں تم کو

کہو تو کتنے پُر گنتی میں زنداں چاہئیں تم کو یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامہ آہ وفغاں کبتک

زباں سے حرف بھی گر قصۂ غم کا نکلتا ہے کلیجے میں کوئی چٹکی سی لیتا ہے مسلتا ہے
ہمارے حال پر عالم کفِ افسوس ملتا ہے یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
مگر تم کو سنائیں دردِ دل کی داستاں کبتک

ہوا جاتا ہے قامت خم ہری سرسبز ڈالی کا غمِ جانکاہ ہے ہم کو ہماری نونہالی کا
ٹھکانا کیا تمہارے جورِ بیداد خیالی کا یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کبتک

جو دشواری ہماری ہے اسے سمجھے ہو تم آساں کروالنسائیت کی بات بھی تم ہو اگر انساں
تم اپنی زیب وزینت کے نکالو اور کچھ ساماں عروسِ بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہونگے زرفشاں کبتک

قضا کے ہاتھ میں تھا انتظامِ فتحِ ایوبی وگرنہ ہم کہاں اور انصرامِ فتحِ ایوبی
نہ لو تیرہ صدی کے بعد نامِ فتحِ ایوبی کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی
دکھاؤگے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کبتک

سمجھ کر یہ کہ یورپ بھر کے اندر ناتواں ہیں ہم سمجھ کر یہ کہ بیمار و نزار و نیم جاں ہیں ہم
سمجھ کر یہ کہ گھڑی ساعت کے گویا میہماں ہیں ہم سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤگے ہمارا اس طرح نام ونشاں کبتک

نہ بازو میں توانائی نہ تن میں تاب وطاقت ہے بزرگوں کی نشانی تم میں باقی اک شجاعت ہے
اسی سے کام لینا چاہئے یہ وقت ہمت ہے زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع وملت ہے
عزیزو! فکرِ فرزند وعیال وخانماں کبتک

بزرگوں کی نشانی تم میں باقی اک شجاعت ہے شجاعت دوسرے مفہوم میں بھی ہے دہمت ہے

یہاں موقع اسی کا ہے کہ دولت کی ضرورت ہے زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع وملت ہے
عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خانماں کبتک

سمجھ سے کام گر تم لو تو پھر دشواریاں کیا ہیں نہ سمجھو جان کو جب جان پھر ناچاریاں کیا ہیں
یہ چالیں کون سی چالیں ہیں یہ مکاریاں کیا ہیں خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کبتک

اگر شمشیرِ غازی کا دلِ مشرک سے ڈر اٹھے تو سر کوبی کو اس کی گوشۂ عالم سے سر اٹھے
نہ آئے وقت وہ یارب کہ بیٹھے خیر شر اٹھے پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کبتک

کرو جو ہوتا آیا ہے تمہارے جد و آبا سے لہو ان کا بہو جو ہیں تمہارے خون کے پیاسے
خدارا دولتِ عثماں کو مٹنے دو نہ دنیا سے جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگِ اذاں کب تک

تباہ اسلام کی دو دولتیں کیسی ہوئیں نامی سبب کیا تھا یہی نقصان ہمت عقل کی خامی
الہ العالمیں اس معرکے میں ہو نہ ناکامی بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کبتک

سوئے بیت المقدس رہزنوں کی فتح راہیں ہیں کلیسا ہیں زیادہ، کم مقدس خانقاہیں ہیں
مسلمانوں کی ناصر ہیں تو خالق کی پناہیں ہیں حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جنگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کبتک

کدھر ہم دل کے بہلانے کو زیرِ آسماں جائیں ملے آرام و راحت کی جگہ تو ہم وہاں جائیں
کہاں سائل تباہ چھوڑ کر ہندوستاں جائیں جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی ہم کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کبتک

(باقی آئندہ)

طاہرہ بانو

(جناب ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید صاحب ایم بی بی۔ ایس کا ایک خط)

رات گلزار صاحب تشریف لاتے تھے تو پھر آپ کا ذکر خیر رہا اور برہان کے نئے پرچے بھی انھیں دکھائے۔ ستمبر کے پرچے میں ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل پر چوتھی قسط تھی۔ دونوں نے اسے اکٹھے دیکھا، برہان کے لئے کچھ مواد پیدا ہو گیا جو ارسال خدمت ہے۔ دیکھیے ماحول پیدا ہوتے ہی کچھ لکھنے میں دیر نہیں لگی! ہم دونوں کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے جن سے آپ آشنا ہیں یہ ہمارے کرمفرما سینیٹر عبدالرحیم شمشاد پشاوری ہیں جو حال ہی میں برما سے تشریف لائے ہیں اور سائل کے شاگردوں میں سے ہیں۔ چنانچہ ان کی دلچسپی بھی قطعی تھی۔

اس خط سے مقصد اول تو ایک ایسی ادبی شخصیت سے تعارف کرانا ہے جس کا ذکر خیر نہایت ہی سرسری طور پر مندرجہ بالا مضمون میں کیا گیا ہے، اور دوسرے چند ایک غلط فہمیوں کا استدراک!

یہ ہستی طاہرہ بانو ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان سے آشنا نہیں ہوں البتہ تعارف غائبانہ ضرور ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب نظام میاں ایران میں تھے تو میں بھی اُدھر ہی کہیں صحرانوردی کر رہا تھا گلزار صاحب سے تو آپ میرے تعلقات کو جانتے ہی ہیں۔ نظام میاں مرحوم اور طاہرہ بانو سے انھیں بہت اُنس تھا چنانچہ خطوں میں قصے ہوا کرتے تھے۔ مگر میں طاہرہ بانو کی شخصیت سے بہت متاثر تھا چند ایک مرتبہ انھیں ریڈیو طہران پر تقریر نشر کرتے سُنا۔ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان بھر میں عورت کی زبانی ایسی تقریر اُردو زبان میں سننے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ حیرت ہوئی کہ طہران سے یہ آواز کیسی! چنانچہ گلزار صاحب کے توسط سے مکمل تعارف ہوا۔ کچھ تو باتیں حافظے میں تھیں اور کچھ رات اُن سے تصدیق کیں، جو ذیل میں درج ہیں اور برائے اشاعت روانہ کر رہا ہوں۔

طاہرہ بانو، ملک الشعرا بہار کی بیٹی نہیں بلکہ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی امیر علی معصومی ہے آپ لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے، نہ کہ ملک الشعرا بہار، جیسا کہ مقالہ نویس نے لکھ دیا ہے معصومی صاحب آج کل حیدر آباد دکن میں تشریف فرما ہیں اور طاہرہ بانو بھی وہیں ہیں طاہرہ بانو ملک الشعرا بہار کی شاگرد رشید ہیں اور خود نہایت اچھی شاعرہ ہیں کلام اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہے، مگر اکثر غیر مطبوعہ۔ چند اشعار جو یاد رہ گئے ہیں وہ ذیل میں درج کر دونگا۔

ملک الشعراء بہار نے غالباً کوئی قطعہ لکھا تھا جب ان کی نسبت پہلی بار نظام میاں سے ٹھہری گلزار صاحب کا کہنا ہے کہ طاہرہ بانو اور ان کے والد بزرگوار کے تعلقات ملک الشعراء بہار سے نہایت خوشگوار تھے، اور غالباً خود گلزار صاحب کا تعارف ان سے ملک الشعرا بہار ہی کے مکاتیب ہوا تھا۔ انہیں

آپ جانتے ہیں مجھے اردو ادب سے چنداں لگاؤ تو ہے نہیں جو میں طاہرہ بانو کی شاعری پر پورے طور سے تنقید یا تبصرہ کر سکوں۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ شاعری کے بلند معیار کا تخیل جو میرے ذہن میں موجود ہے اس پر ان کے اشعار ضرور پورے اترتے ہیں اگر میں اسلوب، تشخص الفاظ، سادگی، بیساختہ پن اور اشعار کے دیگر لوازمات پر بحث شروع کر دوں تو میں جانتا ہوں یہ محض تصنع ہوگا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کی شاعری کے کتنے دور ہیں۔ البتہ جو کچھ سنا وہ پیش کئے دیتا ہوں آپ خود بلندیٔ اشعار کا اندازہ کریں۔ دھوھذا

ایک غزل کے کچھ اشعار ہیں:-

پھر اُن کے در پہ جانے کا ارماں ہے آجکل	پھر عقل و عشق دست گریباں ہے آجکل
پھر الجھنیں پڑی ہیں سکونِ خیال میں	کیا زلفِ یار رُخ پہ پریشاں ہے آجکل
کیا پوچھتے ہو کیسے گذرتی ہے زندگی	وحشت ہے اور رسم میں بیاباں ہے آجکل
اب طاہرہ خیال میں رنگینیاں کہاں	اُجڑا ہوا چمن دلِ ویراں ہے آجکل

میں نہیں کہہ سکتا کہ کن تاثرات کے ماتحت یہ غزل کہی گئی مگر پڑھنے والا کہہ سکتا ہے کہ کوئی حادثہ گراں ہوگا! جس نے ایسے پاکیزہ جذبات کو اُبھار دیا۔

مندرجہ ذیل چند اشعار آپ کی ایک فارسی غزل سے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔ اشعار خود بول رہے ہیں کہ کہنے والا اس میدان کا شاہسوار ہے۔ آپ کے مقالہ نویس نے تو یوں ہی طاہرہ بانو کا ضمنی طور پر ذکر کر کے چھوڑ دیا۔ ورنہ ع

توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

کہتی ہیں۔

اے دوست بسوئے کلبۂ ویراں خوش آمدید　　در قلب چاک و دیدۂ گریاں خوش آمدید

در آشیانِ بلبلِ محزون و دل فگار　　اے گل شگفتہ خاطر و خنداں خوش آمدید

از دردِ عشق و دوریٔ تو خوں گریستم　　اے چارہ سازِ قلبِ پریشاں خوش آمدید

ایک اور اردو غزل کے چند ایک اشعار یاد رہ گئے ہیں وہ بھی سن لیجئے۔ اس غزل کی تقریب بھی یاد نہیں مگر دیکھ لیجئے اظہار کس قدر بیساختہ اور نیچرل ہے۔ کسی نوجوان سے خطاب ہے... جسے شاید قضا اٹھا کر لے گئی۔

اے جوان، اے نوجواں، ہاں سوچ لے پھر سوچ لے　　زندگی بازی نہیں، شوخی نہیں، زنجیر ہے

تیری ہلکی مسکراہٹ اور میری بے بسی　　مشرقی عورت ہوں بس میری یہی تقدیر ہے

اے ہمنوا، کیا ایک دن تو ہمسفر ہو جائیگا؟　　ہم وطن ہونگی کیا بس اک یہی تدبیر ہے

(خط کشیدہ الفاظ آخری مصرعہ کے یقینی نہیں غالباً ان کی جگہ پر کچھ اور ہوگا۔ گلزار صاحب سے تصدیق کی مگر ان کے حافظہ سے بھی اصل غزل اوجھل ہو چکی تھی)

نظام میاں کی وفات کے بعد طاہرہ بانو کی شادی میجر سعید صاحب سے ہوئی جو آج کل حیدرآباد دکن میں لیفٹننٹ کرنل ہیں۔

لیجئے تعارف تو میں نے کروا دیا اب آپ کا یہ فرض ہے کہ طاہرہ بانو سے کچھ لکھوا کر برہان میں شائع کر دیجئے۔ وہ صرف شاعرہ ہی نہیں بلکہ بہت سے موضوع انھیں ازبر ہیں۔ ان کی نثر بھی ایک آدھ بار نظر سے گذری ہے، وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی خوش گفتنی و دُرسفتنی ہے

ادبیات

معراجِ انسانیت

(از جناب بسمل شاہجہانپوری)

سرِ محفل مآلِ عیشِ محفل یاد رکھتا ہے
وہ انساں ہے جو آسانی میں مشکل یاد رکھتا ہے

ہو پیمانِ وفا یا وعدۂ ترکِ جفا کچھ ہو
مگر وہ شاہدِ رنگیں بمشکل یاد رکھتا ہے

بیاباں کیا بیاباں کے بھیانک راستے کیسے
مری گمگشتگی کو خضرِ منزل یاد رکھتا ہے

یہ آن سے شکوۂ ناپرسشِ دل کس لئے ناداں
کہیں ڈوبی ہوئی کشتی کو ساحل یاد رکھتا ہے

بھٹک جاتا کبھی کا ظلمتِ افلاک میں لیکن
مہِ کامل تمہیں منزل بمنزل یاد رکھتا ہے

رخِ روشن پہ ہیں خود گیسوئے مشکیں بکھیرونگا
مرا حق آشنا دل حق باطل یاد رکھتا ہے

یہ منزل ہے کہ خود کھنچ کر چلی آئی یہاں ورنہ
کہیں گم گشتۂ الفت بھی منزل یاد رکھتا ہے

یہ وجہ کس مپرسی ہے کہ شانِ بیکسی بسمل
مجھے برسوں مراندِ مقابل یاد رکھتا ہے

REGISTERED No. D/48

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسنِ خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احبا۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبا میں ہوگا ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لیے ہے۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے ۲ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا